قیمت سالانہ چھ روپے (ﷲ) رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ (۱۰ر)

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹرز:- حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)
عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی
ایڈیٹرز:- محمد ہادی حسین بی اے آنرز) محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۷ اشاعت ماہ اگست ۱۹۲۵ء نمبر ۲

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	فلسفی کی بیوی	سید عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی	۲	۱۲	شکنتلا	جناب محمد عمر نورالہی	۳۸
۲	کلام حفیظ	جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری	۱۲	۱۳	غزل	جناب راز چاندپوری	۴۴
۳	وجدانیات	عابد	۱۳	۱۴	نقش غیر فانی	حضرت آزاد انصاری	۴۵
۴	دل	جناب ابو نعیم نشتر جالندھری	۱۴	۱۵	ناخواندہ مہمان	جناب محمد عظیم الدین	۴۶
۵	غزل	جناب ہادی مچھلی شہری	۱۱	۱۶	میری داستان حیات	جناب خادم محی الدین ایم اے	۴۹
۶	جام زندگی	جناب محمد معراج الدین شامی	۱۵	۱۷	نوائے راز	جناب راز چاندپوری	۶۱
۷	مرگ احمر	محمد ہادی حسین	۱۷	۱۸	یاد ایام	جناب اثر صہبائی بی اے ایل ایل بی	۶۳
۸	غزل	جناب ہادی مچھلی شہری بی اے ایل ایل بی	۲۴	۱۹	کشمکش حیات	جناب راز	۶۵
۹	غم نصیب	محمد ہادی حسین	۲۵	۲۰	کنج باغ میں	جناب جمیل قدوائی	۶۶
۱۰	غزلیات	جناب احسن لودھیانوی	۳۳	۲۱	ابر بہار	۱۱	۷۰
۱۱	کاتب	جناب غلام ربانی (اورنگ آباد)	۳۴	۲۲	خاموش الہام گاہ	جناب محمد ذاکر بی اے	۷۲

فلسفی کی بیوی

(۱)

پروفیسر ضیائی کچھ سراسیمگی کے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک غیر فلسفیانہ سی عجلت کے ساتھ اپنی ٹوپی اُتار کر ایک صوفے کے آرام دہ گدیلوں پر دراز ہو گئے اب وہ تنہا تھے۔ میری آپ کی نظروں میں تنہا تھے۔ کیونکہ ان کی نگاہوں میں تو کانٹ شوپنہار۔ نٹشے اور ہیگل کی وہ تصانیف جو خاکستری رنگ کی جلدوں میں بندھی ہوئی خوبصورت الماریوں کے شفاف شیشوں میں سے جھلک رہی تھیں۔ موجِ حیات سے لبریز تھیں لیکن وہ ان ہمراہیوں کی موجودگی میں اپنے خیالات کو ایک سرکش گھوڑے کی طرح عناں گسستہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ انہیں کسی نام نہاد تہذیب کا برقعہ اوڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوا کرتی تھی۔ اس سے پہلے تو وہ اکثر شوپنہار کے نظریۂ تخلیق کائنات یا ہیگل کے فلسفہ مابعد الطبیعات اور خدا جانے کیا کیا خرافات کے متعلق بیٹھے غور کیا کرتے تھے لیکن آج عملی زندگی کے متعلق ان کے تفکر نے پہلی دفعہ سوچ۔ بچار کی مملکت میں قدم رکھا تھا۔ اور جس طرح کوئی ناواقف مسافر اندھیرے میں جا بجا ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اسی طرح ان کا تدبر آج کے معاملات کے متعلق رک رک کر کام کر رہا تھا۔

ان کے والدین شاید آج سے چار سو برس پہلے پیدا ہوتے ہوتے تو غالباً تمام شہر ان کی تعریفوں سے گونج اُٹھا ہوتا۔ لیکن مادی تہذیب کے اس عصرِ جدید میں ان کی پیدائش دمدار ستارے کے طلوع سے کسی طرح کم نہ تھی۔ آج انہوں نے ضیائی صاحب پر اپنی پوری قوت اخوت سے حملہ کر دیا تھا۔ اور انہیں شادی کرنے پر تقریباً "تقریباً" مجبور کر دیا تھا۔ ضیائی صاحب کے استدلال اور ان کے منطقی بکھیڑوں کو نہ وہ سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ سمجھنا چاہتے تھے۔ ان سب کے جواب میں والد صاحب قبلہ کا یہ کہنا کہ "بس حد ہو چکی۔ اب شادی کا انتظام ضروری ہے۔" اور والدہ ماجدہ کی آنکھوں میں بیٹے کی نافرمانبرداری کو دیکھ کر آنسوؤں کا بھر آنا ایسی محکم اور استوار دلیلیں تھیں کہ پروفیسر صاحب باوجود تفحص بسیار کے کسی فلسفیانہ

کتاب سے کوئی ایسی دلیل پیش نہ کر سکے جو ان کو شکست دے سکے۔ اس گفتگو کے دوران میں پروفیسر صاحب کو بادلِ ناخواستہ اس بات کا اقرار کرنا پڑا۔ کہ اب انکی عمر اس حد تک تجاوز کر چکی ہے جب عام حالتوں میں مرد ایک دو بچوں کا باپ کہلاتا ہے۔ اور تعلقاتِ زن و شوہر کے متعلق راتے زنی کا استحقاق حاصل کرتا ہے۔ ہر چند کہ ضیائی صاحب کو اس استناد کے حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے نام کے ساتھ علمی اسناد کی ایک طویل فہرست موجود تھی۔ مگر والدین کی نظروں میں جبتک ان اسناد کے ساتھ شادی کا دم چھلا پیوست نہ ہو جاتے۔ ان وقعت کچھ یونہی سی معلوم ہوتی ہے۔

ضیائی صاحب ہندوستانی بیوی کو دورِ جہالت کی ایک زندہ یادگار سمجھا کرتے تھے۔ اور اس لئے لازمی طور پر اس طبقہ نسواں سے نفور تھے۔ شروع ہی سے جب پہلے پہلے فلسفہ نے ان کے دماغ کو مطیع و منقاد کیا تو وہ عورتوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھا کرتے ان کا یہ جنون اس حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کہ وہ اس شخص سے ملنا تک ناپسند کرتے تھے۔ جو کم از کم بظاہر ان کا ہمخیال نہ ہو۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ "عورت ہمیشہ مرد پر بار ڈالتی ہے۔ بچپن میں والدین سے بیٹی بن کر کام لیتی ہے۔ جوانی میں خاوند کے سر پر قضائے مبرم کی طرح نازل ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے میں بیٹوں کو جنت کے خواب دکھا کر ان کی خدمتگذاری کی حقدار بن جاتی ہے۔" ہر چند کہ قطعی اور حتمی طور پر صداقت پر مبنی ہو۔ لیکن کم از کم ان کے والدین کے لئے کفر اور وہ بھی انتہائی کفر سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس قسم کی باتیں سُن سُن کر مجبور ہو گئے تھے کہ جلد از جلد تجربے کے طور پر اپنے عزیز ان جان عالم و فاضل فرزند پر ثابت کر دیں۔ کہ بالتحقیق جس بیوی کو وُہ عذابِ جان تصوّر کرتا ہے۔ وہ تو باغہائے خلد کا سب سے شیریں ثمر ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کیا جاتا کہ ضیائی صاحب اس شیریں ثمر کو گلستانِ عدن کا وہ سیب تصوّر کرتے تھے۔ جس کو چکھ کر ان کے مورث اعلےٰ جناب آدم علیہ السلام بارگاہ الٰہی میں معتوب قرار پائے تھے۔ معاملات کچھ اس قسم کی گومگو حالت میں تھے۔ کہ ایک دن پروفیسر صاحب کو والدین نے اُونچ نیچ سمجھانا شروع کیا۔ اور ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ ایک دو ماہ کے بعد شادی کی مسرتوں سے محظوظ ہونے کے لئے تیار ہو جائینگے۔

اب وہ دن قریب آ چکا تھا۔ اور پروفیسر صاحب

کو اس بات کا دردناک احساس یوں ہوا۔ کہ ان کے والد نے فہمائش کی کہ وہ کالج سے ایک دو ماہ کی رخصت لے لیں۔ تاکہ شادی کا باقاعدہ انتظام کیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ضیائی صاحب بہت مضطرب تھے۔ انہوں نے ایک تازہ رسالہ اٹھایا۔ دو ایک ورق الٹے بھی پھر پریشان ہو کر رکھ دیا۔ پھر ایک تصویر کی طرف عنانِ توجہ کو منعطف کیا۔ تو ان کے دماغ نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اور وہ فن کے اس نادرہ کار نمونے کو دیکھنے سے معذور ہو گئے۔ ان کا دماغ صرف شادی کے متعلق غور کرنا چاہتا تھا۔ آخرکار تنگ آ کر وہ بیٹھ گئے اور اس بات کے متعلق تمام مواد کو مجتمع کر کے کوئی رہائی کی صورت نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

یہ کہنا تو لاحاصل تھا کہ شادی ناگزیر تھی۔ باقی رہا بیوی کا انتخاب تو وہ والدین کی نظروں میں ایسا ثانوی رتبہ رکھتا ہے کہ اس کے متعلق پروفیسر صاحب کا دخل دینا بالکل رائگاں جاتا۔ تحقیق کہ یہ مسئلہ تو صرف آنے جانے والی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے جن کے زاویہ ہائے نگاہ خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کر کے خود کوئی اچھی سی لڑکی پسند کریں نہ کہ پروفیسر صاحب سے۔

باقی رہا گھر سے نکل بھاگنا۔ لیکن اس خیال کے آتے ہی۔ خاندان کی آبرو کا خیال پروفیسر صاحب کی تمام فلسفیانہ موشگافیوں اور نکتہ سنجیوں کو ایک سیلاب عظیم میں بہا کر لے گیا۔ اور ان کی یہ کوشش کہ وہ کسی طرح عقلی و نقلی طریق سے اپنے ضمیر کی آواز کو اس معاملے میں خاموش کرا سکیں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔

اب ضیائی صاحب کو معلوم ہوا کہ یورپ کے فلسفیوں کے تمام دلائل ایک ذرا سی بات پر کانچ کے برتنوں کی طرح ریزہ ریزہ ہوتے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے دماغ میں اس بات کے متعلق بغاوت کا ایک طوفان برپا تھا کہ وہ اپنی تمام زندگی کو والدین کی ایک ناجائز خواہش پر قربان کر دیں جب ان کی عقل نے اس قید خانے سے رہائی پانے کا کوئی راستہ نہ دیکھا۔ تو ان پر جذبات کی وہ کیفیت غالب آنے لگی۔ جسے اصطلاح میں "ذہنیت معکوس" کہتے ہیں۔ اور وہ اسی حالت میں صحیح استدلال اور تدبر و تفکر کے راستے سے بھٹک کر جذباتی انتقام کی دشوار گزار اور مہیب گلیوں میں داخل ہو گئے۔ ان کا ارادہ ہو گیا۔ کہ میں شادی تو کر لونگا۔ لیکن اپنی بیوی کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کرونگا۔ تاکہ ذرا ان لوگوں کو بھی معلوم ہو کہ ایک شخص کو خلاف ارادہ کسی کام پر مجبور کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ اس حالت میں تھے کہ اس بے معنی تجویز کے

تمام پہلوؤں پر نظر دوڑانا ان سے اتنا ہی بعید تھا، جتنا کسی احمق شخص سے اپنے معاملات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا مادہ۔ کسی بچے کو ایک پیچیدہ معمہ کو حل کرنے کے بعد اتنی خوشی نہ ہوتی ہوگی جتنی پروفیسر صاحب کو اس گتھی کے بقول ان کے سلجھا لینے میں ہوئی۔ اور یوں وہ ایک معصوم عورت کی قسمت کا ایسا احمقانہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو کر ایک فلسفیانہ کتاب کا بہ اطمینان قلب مطالعہ کرنے لگے۔

(۲)

پروفیسر صاحب کی شادی ہو گئی۔ نہ صرف شادی ہو گئی بلکہ شادی کو چھ ماہ بھی گذر گئے۔ اور پروفیسر صاحب اپنے مستقل ارادے پر قائم رہے۔ انہوں نے اس چھ ماہ کی طویل مدت میں کبھی بیوی کا چہرہ بھی نہ دیکھا اور اس کے متعلق مختلف قسم کے غلط اندازے قائم کر کے اپنے مطالعہ میں مصروف رہے۔ والدین کا سمجھانا بالکل اکارت گیا۔ اور وہ اپنی ہٹ پر "یک در گیر و محکم گیر" کے مقولے پر عمل کر کے "قطب جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ثبوت بدرجہ اتم بہم پہنچاتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے والد نے یہ سمجھ کر کہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے فہمائش بھی ترک کر دی۔ ہاں کبھی کبھی جب وہ گھر جایا کرتے تو ان کی والدہ آنکھوں میں آنسو بھر لا کر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر اب آنسوؤں کی قدر و قیمت ضیائی صاحب کی نگاہ میں بہت کچھ کم ہو چکی تھی۔ اور وہ اس مشہور لطیفے کے سائنسدان کی طرح جس نے اپنی بیوی کو روتے دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ کہ سب پانی ہی پانی ہے" سمجھ چکے تھے کہ اس طرح کے آنسو عورتوں کے اختیار میں ہیں۔ صداقت اور اخلاص سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ متوقع ہونگے کہ باعتبار فن اور بلحاظ رسمیات تحریر افسانے کو یہاں قریب الاختتام ہونا چاہیئے۔ پروفیسر صاحب کی بیوی اپنی فرمانبرداری اور محبت کیشی سے ضیائی صاحب کا دل موہ لے۔ اور پھر ان کی باقیماندہ زندگی ہنسی خوشی بسر ہو لیکن آپکا خیال غلط ہے۔ آپ کی توقعات مجروح ہونگی۔ خیر سنئے۔

ایک دن پروفیسر صاحب اپنے دار المطالعہ میں بیٹھے کسی جرمنی فلسفی کی کتاب دیکھ رہے تھے۔ کہ ان کی نظر میز پر ایک تھفینٹریکل کمپنی کے اشتہار پر جا پڑی۔ انہیں یاد نہ آتا تھا۔ کہ وہ خود یہ اشتہار کمرے میں لاتے ہوں۔ غالباً نوکر کے ہاتھ میں ہوگا۔ کمرے میں کوئی چیز رکھنے آیا ہوگا۔ اور اشتہار وہیں رہ گیا ہوگا۔ انکا دماغ اس وقت پریشان ہو چکا تھا۔ اور فلسفے کے دقیق راستوں پر چلنے سے انکار کر رہا تھا۔ انہوں نے شغل بیکاری کے طور پر اشتہار کو اٹھا کر پڑھنا

شروع کیا۔

الگزینڈرا تھیٹریکل کمپنی

لاہور

مشہور تماشہ

"سنجیدگی کی اہمیت"

مشہور عالم ماہر طنزیات آسکر وائلڈ کی ایک
بزمیہ تمثیل۔ نہایت دلفریب مناظر
مس نسیم ہیروین کا پارٹ کریں گی۔

اب اگر پروفیسر صاحب کے فلسفیانہ زرہ بکتر
میں کوئی حصہ ایسا تھا جس کے ذریعے ان کے
جذبات لطیف کو برانگیختہ کیا جا سکتا تھا۔ تو وہ
آسکر وائلڈ کے احترام کا جذبہ تھا۔ خدا جانے اس
فلسفی مزاج شخص کو آسکر وائلڈ سے کیوں محبت تھی!
بہرصورت تعجب کی بات بھی کوئی نہیں۔ کیا عام مشاہدہ
نہیں کہ جو لوگ کسی انسان سے محبت نہیں کرتے وہ
اکثر گھوڑوں مرغیوں یا بلبیوں سے اُنس رکھتے ہیں۔
تو اگر ہمارے ضیائی صاحب کو آسکر وائلڈ کی تحریر سے
علی الزعم فلسفہ دانی کچھ اُنس سا تھا تو تعجب کیا ہے۔
ان کا ارادہ ہوگیا کہ آسکر وائلڈ کی یہ بزمیہ تمثیل
ضرور دیکھینگے۔ اُنہوں نے فوراً اپنے دوست عشرت حسین
کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ جس کے لئے یہ خبر اپنی
ندرت کے لحاظ سے گدھے کے سر پر سینگ پیدا
ہو جانے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شام کو عشرت حسین
صاحب ایک بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس
ضیائی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے اور دونوں
دوست تھیٹر کی طرف چل دیئے۔

پروفیسر صاحب تھیٹر بہت کم جاتے تھے
یہی باعث تھا کہ ان کے لئے وہاں کے ہر ایک شے میں
ابھی وہ جاذبیت باقی تھی جس کی فسوں کاریاں تسلسل و تواتر
سے کم ہو جاتی ہیں۔ جس طرح کوئی بچہ ریل کے کسی بہت
بڑے جنکشن میں داخل ہو کر وہاں کی ہر ایک شے کو
پریوں کی مملکت کا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔ اور ذرا ذرا سی
بات پر مسرت کے ایک طوفان سے لبریز ہو جاتا ہے۔
اسی طرح خیائی صاحب کو تھیٹر کے پردوں میں معمولی
زرّیں لباسوں میں اور بازاری گانوں میں وہ لطف آرہا
تھا جو انہیں آج تک فلسفے کی کسی اچھی سے اچھی کتاب
میں نہ محسوس ہوا تھا۔ عشرت ان کی وارفتگی کو دیکھ کر
متعجب سا ہو رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ نسیم کو دیکھ کر
ان کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اسی پس و پیش میں تھا، کہ
پردہ اُٹھا اور مس نسیم پہلی دفعہ سٹیج پر نمودار ہوئیں۔ تمام
ہال تالیوں کی مسلسل آواز سے گونج اُٹھا۔ اور خیائی صاحب

نے دھڑکتے ہوئے دل سے کافر ماجرائی اور رنگیں ادائی کے اس طلسمی پیکر کی طرف دیکھنا شروع کیا جو اپنے عالم آرا حسن سے ہر طرف تابش کی تجلیاں برسا رہا تھا۔ ہر چند کہ ابھی اس متحرک فتنے نے گفتگو کا آغاز نہیں کیا تھا۔ مگر اس کی بیباک نگاہیں ان تمام جذبات کو کُرید کُرید باہر نکال رہی تھی۔ تو ابتک پروفیسر صاحب کے نہاں خانہ دل تہ در تہ پردوں میں چھپے ہوتے تھے نہیں آج محسوس ہو رہا تھا کہ نسوانیت میں بھی اس قسم کی کشش موجود ہے۔ جو انسان کو بیخود و مضطرب بنا دے۔ اب مس نسیم نے اپنا پارٹ ادا کرنا شروع کیا۔ اور پروفیسر صاحب ہمہ تن گوش ہو کر اس کی سُریلی آواز کی لہروں میں غرق ہو گئے۔ بظاہر پروفیسر صاحب نسیم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کے دماغ میں ایک خوبصورت اندھے بچے کی تصویر نقش ہوتی جاتی تھی۔ جو اپنے ترکش میں سے تیر نکال نکال کر چاروں طرف برسا رہا تھا...

. . . .

تماشہ ختم ہو چکا تھا ضیائی اور عشرت صاحبان مس نسیم کے ذاتی کمرے میں پہنچے۔ ضیائی صاحب کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور ان کو یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اُن کے تمام اعصاب میں سوئیاں سی چُبھ رہی ہیں۔ عشرت بے تکلفی کے ایک انداز میں جس میں خوف کا کچھ عنصر ملا ہوا تھا۔ مس نسیم کے کمرہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی تھی۔ سیاہ مشکیں بال اس کے کاندھوں سے نیچے کمر تک لہرا رہے تھے۔ اس نے آسمانی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔ جس کو صرف یک سادہ موتیوں کا ہار زینت دے رہا تھا۔ ضیائی صاحب کو یوں معلوم ہوا گویا وہ موتی اس کی گردن کی شفاف جھلک کے سامنے حقیر معلوم ہوتے ہیں۔

نسیم نے شیشے میں سے عشرت کو پہچانا۔ مسکرائی اور واپس مڑ کر کہا۔

تشریف لائیے۔" آپ تو اب نظر ہی نہیں آتے۔"

عشرت نے عذر خواہ لہجے میں کہا۔" میں دہلی میں تھا۔ ورنہ ضرور کشاں کشاں حاضر ہوتا۔

پھر اس نے مسکرا کر پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔" یہ میرے عزیز دوست پروفیسر ضیائی ہیں۔ بہت بڑے فلسفی اور بہت خشک مزاج"۔

نسیم نے پروفیسر صاحب کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ کوئی ان کو جانچنا چاہتی ہے۔ پھر متبسم نگاہوں سے بولی۔

"کیا خشک مزاج لوگ بھی تھیٹر آیا کرتے ہیں"۔

پروفیسر صاحب کہنا چاہتے تھے کہ "آپ کی شہرت لے آئی ہے۔" مگر زبان نے یاوری نہ کی۔ خاموش رہے۔

نسیم نے پھر تیر مارا۔ "خشک مزاج تو خیر لیکن آپ خاموش طبع ضرور ہیں۔"

ضیائی صاحب گھبرا گئے۔ پھر سنبھل کر کہنے لگے۔ "یہ کہنا کہ حسن کا رعب غالب ہے۔ بہت پرانی بات ہے۔ اور نئی بات سوجھتی نہیں۔ اس لئے خاموشی افضل ہے۔"

نسیم نے مصنوعی حیرانی سے عشرت کی طرف دیکھا۔ اور پھر بولی۔ "آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ پروفیسر صاحب شاعر بھی ہیں۔ حسن کی تعریف اس نزاکت سے شاعر ہی کر سکتا ہے۔"

عشرت نے جواب دیا۔ "شاید پروفیسر صاحب معناً شاعر ہوں یا آپ کو دیکھ کر شاعر ہو گئے ہوں۔ اس سے پیشتر تو یہ جذبہ ان سے کوسوں دور تھا۔"

نسیم نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ اور پھر براہ راست ضیائی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آپ کو میرا پارٹ پسند آیا۔"

ضیائی صاحب نے صداقت سے جواب دیا۔ "آپ کے کمال کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گھنٹوں پیشتر ہر ایک فقرے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر لیتی ہیں۔"

نسیم کا چہرہ احساس کامرانی کے غرور سے تمتما اُٹھا۔

آپ نے درست کہا ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ جس شخص کے پارٹ کو ادا کر رہی ہوں۔ اس کے اساسی جذبات سے واقف ہو کر خود بھی بعینہٖ اس حالت میں داخل ہو جاؤں!"

ضیائی صاحب کچھ عرصہ خاموش رہے۔ پھر بولے "میں حیران ہوں۔ کہ تھیٹر آنے والے لوگوں کو جن کا بیشتر حصہ بالکل ان پڑھ لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ فن کے متعلق کیا معلومات ہیں۔ کہ وہ آپ کے آنے پر اس قدر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔"

نسیم نے سر جھکا کر کہا۔ اور اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔

پروفیسر صاحب بہت جلد اپنی غلطی سے مطلع ہو گئے اور ایک صلح کن انداز میں بولے۔ بیشک بیشک معاف کیجئے۔ آپ کا گلو سوز حسن کافی ہے۔

نسیم نے ایک دفعہ ان کی طرف اپنی سیاہ رسیلی آنکھیں اٹھائیں اور جھکا لیں۔ پھر نہایت آہستہ سے کہنے لگی۔ "مجھے بار بار حسین کہکر شرمندہ نہ کیجئے۔"

اور اس کی آنکھوں سے حقیقی ندامت کا سا اظہار ہونے لگا۔

ضیائی صاحب بیتاب ہو گئے۔ وہ تارِ حیات جو آج پہلی دفعہ ان کے اعماقِ قلب میں لرزاں تھا نسیم کی چھیڑ سے گونجنے لگا۔ انہوں نے تمام اصولِ تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ "آپ کو حسین نہ کہوں۔ شاید آپ مجھ سے مذاق کر رہی ہیں۔ مس نسیم کیا آپ کو خود اسی انمول قدرت کا احساس نہیں جس سے آپ دلوں کو پامال کر سکتی ہیں۔ روحوں کو تباہ کر سکتی ہیں۔ نظروں کو شاداب کر سکتی ہیں!"

پھر وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔

"مجھے معاف کیجئے گا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔"

نسیم جو اس ناروا اظہار کے دوران میں اپنے ہار کے موتیوں سے کھیل رہی تھی۔ دردمندانہ سے انداز میں بولی۔ "کیا آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔"

اور جب وہ رخصت ہونے لگے۔ تو اس نے ضیائی صاحب کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں شفاف آنسو بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور جو ان سے کہہ رہی تھیں۔ کہ

"مجھے بھول نہ جایئے گا۔"

(۴)

ضیائی صاحب کے لئے محبت اپنے تمام لطیف مظاہر کو ہمراہ لئے ہوئے مس نسیم کی مصنوعی تلطف آمیز گفتگو میں اس کی مشتاق نگاہوں میں جنکو وہ کمالِ فن سے متبسم بنا لینا جانتی تھی۔ اس کے معطر سانس میں اس کے سحر انگیز انداز میں نمودار ہوتی۔ اور ان تمام جذبات کو دوش پر لیکر نمودار ہوتی۔ جو محبت کے متلازم ہیں ضیائی صاحب عشق کے دیوتے کی طرح گرد و پیش کے حالات کے متعلق سوچنے کی طرف سے اندھے ہو گئے۔ بناوٹ کے وہ تکلفات جو بیک نظر بھانپ لئے جا سکتے تھے۔ تاثرات شوق کے ہجوم میں گم ہو گئے نسیم ان سے بہت عرصہ متکلفانہ طور پر ملتی رہی۔ ضیائی صاحب اس نکتے سے بے خبر تھے۔ کہ جن عورتوں کی نسائیت پر عشق فوراً غالب آجاتا ہے وہ انہیں کی روح شفاف اور بیداغ ہوتی ہے۔ اور جو عورتیں اظہار نفس سے گریز کرتی رہتی ہیں۔ انکا مقصد صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ جس وقت وہ مفتوح ہوں، تو ان کی شکست شاندار اور لذیذ ہو۔ ضیائی صاحب ان سرگوشیوں اور پنہاں اشاروں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ جو ان کی آمد پر لوگوں میں ہونے لگتے تھے۔ حتےٰ کہ معاملہ بالکل طشت از بام ہو گیا۔ اور اب وہ رسوائی

کے خوف سے بے نیاز ہو کر کھلم کھلا نسیم سے تعشق کا
اظہار کرنے لگے۔ نسیم اس قسم کی عورت نہ تھی کہ اس
کے متعلق کوئی شخص کھلم اظہار تعشق کرتا اور لوگوں کو معلوم
نہ ہو جاتا۔ بچہ بچہ ضیائی صاحب کی حماقت سے واقف
ہو گیا۔ اور وہ حماقت کی اسی جنت میں محو رہے۔
سیاہ باطنی اور بدنفسی کی پرانی داستان دہرائی گئی۔
آخر ان طویل عشرت خیز راتوں کے بعد جو خیائی صاحب
نے محبت کے دامن میں کاٹی تھیں۔ ایک دن ایسا طلوع
ہوا جب انہیں معلوم ہوا کہ نسیم کی محبت دولت سے
بے نیاز نہیں ہے۔ ان کے پاس اب کچھ نہ تھا۔ نوکری
وہ بہت عرصہ پہلے چھوڑ بیٹھے تھے۔ ان کی ذاتی جائداد
اس سے بہت پیشتر نسیم کی ریشمیں ساڑھیوں اور نولکھے
ہاروں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اب انہیں اپنی
حالت کا ایسا ہی دردناک احساس ہوا جس طرح کوئی
غم زدہ غریب رات بھر اپنے چیتھڑوں میں ٹھٹھر رہا ہو
اور صبح کو سورج کی صاف۔ ظالم۔ روشنی میں خود اپنے
کپڑوں کی طرف دیکھ کر شرما رہا ہو۔ وہ پریشان ہو کر
گھر چلے گئے۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن
والدہ زندہ تھیں۔ اور وہ بیٹے کی حرکتوں سے اسقدر
بیزار ہو چکی تھیں کہ اس کی خبر کو بھی نہ آئیں۔
ضیائی صاحب بیمار ہو گئے۔ اور حالت دن بدن
خراب ہوتی گئی۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی۔ کہ
پروفیسر صاحب کا مرض لاعلاج ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ
نسیم نے اب اپنے سکۂ قلب کی طرح بیکار اور
بیجوف سی شے سمجھ کر اپنے آپ سے پرے پھینک دیا ہے
ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔ اور ان کی حالت ردی ہوتی چلی
گئی۔ ایک شام جب آسمان پر سیاہ گھرے بادل چھاتے
ہوتے تھے۔ اور ان کے دل میں بادلوں سے گہری
تاریکی، شعاع امید کے لئے لرز رہی تھی۔ انہیں ایک
خط موصول ہوا۔ وہ اپنے مراسلات سے بے پروا تھے۔
لیکن یہ خط رجسٹری تھا اور اسی لئے انہوں نے اس
کو کھولنا مناسب سمجھا۔ پڑھنے کو تو وہ خط پڑھ گئے۔
لیکن ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اور کاغذ کا وہ مختصر سا
ٹکڑا وسعت میں کمرے کی تمام فضا کو ڈھانپتا ہوا
معلوم ہونے لگا۔ خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔

ڈیئر پروفیسر

سلام مسنون! آپ کی تازہ تصنیف "اخلاقیات
اور فلاسفۂ یورپ کی غلط فہمیاں" خوش قسمتی سے
ایک دوست کے ذریعے مجھے مل گئی۔ میں نے اخلاقیات
بہ دقت نظر مطالعہ کیا ہے۔ اور آپ کے خیالات
ہمہ وجوہ متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس علمی سلسلے
کا جاری رکھنا اشد ضروری ہے۔ اس کام کے لئے

دو ہزار روپے کی ناچیز رقم ارسال خدمت ہے اور مجھے توقع ہے کہ آپ بہت جلد اس کی دوسری جلد بہ اہتمام تمام شائع کرینگے۔ اس حقیر بدلے کو خراج علم تصوّر کیجئے اور میرے نام سے آگاہ ہونے کی کوشش کر کے مجھے نادم اور دل شکستہ نہ کیجئے گا۔

ایک غائبانہ خیر خواہ

ضیائی صاحب کے دل میں مختلف خیال پیدا ہونا شروع ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ اس رقم کو واپس کر دوں۔ اور بھیجنے والے کا سراغ لگانے کی جان توڑ کوشش کروں۔ لیکن بہت جلد یہ خیال رنگین امیدوں کے طلسمی جال میں گرفتار ہو کر فنا ہو گیا۔ نسیم سے ملاقات کا خیال آتے ہی ان کی تمام حسیات برانگیختہ ہو گئے۔ اور بغیر کسی پس و پیش کے اُنہوں نے اس رقم کو رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی کپڑے پہن کر تھیٹر کی طرف اس بیتابی سے جانے کے لئے تیار ہُوئے۔ جس طرح بچہ مٹھائی کی طرف لپکتا ہے۔ نسیم ان سے سرد مہری سے پیش آئی۔ لیکن بہت جلد دولت کے اثر نے اس سرد مہری کو گرمیِ شوق بنا دیا۔ ضیائی صاحب کا ایک ہفتہ پھر عشرت اور کامرانی کے سراب میں غرق ہو گیا۔ اور انجام پہلے سے زیادہ تلخ ثابت ہُوا۔ نسیم نے یہ سمجھ کر کہ ضیائی اسے دھوکا دے رہا ہے اور باوجود دولتمند ہونے کے اس سے روپے کے متعلق بخل سے کام لیتا ہے۔ ایک دن انہیں بہت کچھ سخت سُست کہا۔ اور تقریباً تقریباً دھکے دے کر نکلوا دیا۔

ذلت کی اس آخری کڑی۔ بربادی کی اِس آخری حالت پر پُہنچکر ضیائی صاحب کی آنکھیں کُھل گئیں وہ شریف تھے اور شریف خاندان سے تھے اُنہوں نے تہیّہ کر لیا کہ وہ جان پر کھیل جائینگے۔ وہ نسیم کے ہاں سے نکل کر سیدھے گھر کی طرف روانہ ہُوئے تاکہ بیوی کو سب سے آخری دفعہ مل لیں۔ اور خیرباد کہہ لیں۔ وُہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہُوئے۔ شام کا وقت تھا لیکن ابھی چراغ نہیں جلے تھے۔ ان کی بیوی دروازے کی طرف بیٹھ گئی۔ ہارمونیم بجا رہی تھی۔ ضیائی صاحب ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ باجے میں سے سُریلی تانیں نکلیں۔ اور پھر ان کی بیوی کی سحر آفریں آواز فضا میں گونجنے لگی۔ نہایت آہستہ سُروں میں

اے نوبہار باغ جہاں گرد راہ تو
وے گرد راہِ تو بجہاں نوبہار من
یادم نے کنی و زیادم نمے روی

عمرت دراز باد فراموشگار من

آواز کی شیریں موسیقی ان کے دل میں پیوست ہو گئی - وہ مسحور ہو کر آگے بڑھے - اور باجے کے قریب پہنچ گئے - یکایک ان کی نگاہ باجے کے قریب ایک کاغذ پر پڑی - ان کی بیوی دوسری طرف منہ کئے ہوئے مندرجہ بالا مصرعے دُھرا رہی تھی - انہوں نے کاغذ کو پڑھنا شروع کیا - اور پھر ان کا سر چکرانے لگا اور وہ غش کھا کر بیوی کے قدموں پر گر پڑے -

کاغذ کا مضمون یہ تھا -

ڈیئر پروفیسر - سلام مسنون! دو ہزار روپے کی دوسری قسط آپ کی تصنیف کی اشاعت کیلئے ارسال ہے -

اسی ہندوستانی بیوی نے جسے وہ دورِ جہالت کی ایک زندہ یادگار سمجھا کرتے تھے - خود ان کی محبت کے دوران میں زیوروں کو بیچ بیچ کر انکی مدد کی تھی -

عابد

کلامِ حفیظ

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے

انہیں احساسِ تمکیں ہو کہیں ایسا نہ ہو جائے
جو ہونا ہو ابھی اے جراتِ رندانہ ہو جائے

بظاہر سادگی سے مُسکرا کر دیکھنے والو
کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

بہت ہی خوب شے ہے اختیاری شانِ خودداری
اگر معشوق بھی کچھ اور بے پروانہ ہو جائے

ارادے باندھتا ہوں باندھ کر پھر توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

فضاؤں کو بسا دے او دوپٹہ اوڑھنے والی
کہ مستی سے مرا ہر سانس اک میخانہ ہو جائے

میری اُلفت تعجب ہو گئی توبہ معاذ اللہ
کہ مُنہ سے بھی نہ نکلے بات اور افسانہ ہو جائے

الٰہی دلنوازی پھر کریں وہ میفروش آنکھیں
الٰہی اتحادِ شیشہ و پیمانہ ہو جائے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

وجدانیات

اب تو میری بھی تمنا ہے کہ آجائے بہار
کہیں ایسا نہ ہو اور آگ لگا جائے بہار

آپ آجائیں تو آنکھوں میں سما جائے بہار
آپ آجائیں تو ہر چیز پہ چھا جائے بہار

ہائے وہ دور کہ پہلو میں تھا وہ غیرت گل
ہائے یہ دن کہ خفا آئے خفا جائے بہار

کھل کے برسے بھی جو اٹھی ہے یہ گھنگھور گھٹا
جام دو چار تو رندوں کو پلا جائے بہار

ان کی عادت کہ وہ آئیں نہ کبھی ازرہ لطف
میری تقدیر کہ جب آئے رلا جائے بہار

پھول کیا ہیں اثر خون شہیدان جمال
یہ تماشا مری آنکھوں کو دکھا جائے بہار

گل و نسرین و سمن یاد دلائیں ان کی
ساری دنیا کو جنوں زار بنا جائے بہار

بن سنور کر مرے پہلو میں کبھی آبیٹھو
اپنے سینے پہ کوئی داغ تو کھا جائے بہار

ان کی فرقت ہو تو کیا موسم گل کا احساس
یا مرے دل کو بھی تسکین ہو یا جائے بہار

ان کو ملنا جو نہ منظور ہو تجھ سے عابد
بار غم خاک مرے دل سے اٹھا جائے بہار

عابد

دِل

خونِ دلبند علی سرخیٔ افسانۂ دِل
شورِ منصور ہے اک نغمۂ مستانۂ دل

نقشِ ہستی ہے غبارِ رہِ کاشانۂ دِل
عرصۂ حشر ہے اِک گوشۂ ویرانۂ دِل

عشق کا بارِ گراں ہنس کے اُٹھایا سر پر
اللہ اللہ یہ ہے ہمتِ مردانۂ دِل

عقل گم کردہ رہِ وادیٔ حیرت ہے ابھی
اور محبوب در آغوش ہے دیوانۂ دِل

اس کا ہر ذرّہ ہے آئینۂ اسرارِ حیات
لوحِ محفوظ ہے گویا مرا پیمانۂ دِل

گرمیٔ عشق سے ہے تابشِ رخسارۂ حسن
شعلۂ طور ہے منت کشِ پروانۂ دِل

آرزوؤں کا چمن زار ابھی کھل جائے
تپشِ برق اُگائے جو کہیں دانۂ دِل

نہ حرم ہے نہ کلیسا ہے نہ بُت خانہ ہے
یار کی انجمن ناز ہے کاشانۂ دِل

لاکھ ایمان ہیں اِک کفرِ محبت پہ نثار
دیکھ صد کعبہ در آغوش ہے بتخانۂ دِل

کیا کرامت مرے ساقی نے دکھائی نشترؔ
خطِ خورشید بنا ہے خطِ پیمانۂ دِل

ابو نعیم نشترؔ

غزل

ہر کہ شوقِ خویش را رہبر گرفت
ہم سراغِ مدعا را در گرفت

او چو مشقِ ناز را از سر گرفت
کارِ من در عشق بالا تر گرفت

سوزِ پنہاں برق را تشکیل داد
آسمان از دودِ آہم در گرفت

ماہِ نو را آسماں گردش نثار
او بدستِ ناز چوں خنجر گرفت

در جہاں از زحمت آرامی نشست
ہر کہ سودائے غمت در سر گرفت

از جمالت بہرہ ہا بر داشت مہر — از نگاہِ من جہاں منظر گرفت
دست از او ضاعِ عالم در کشید — ہر کہ در دستِ خودش ساغر گرفت
بر رخش از رنگِ آثارِ غضب — کارِ شوقم گونۂ دیگر گرفت
از قفس با اتفاقِ بوئے گل — مرغِ جانم سوئے گلشن پر گرفت
پائے شاقش سرِ منزل رسید — ہر کہ دنبالِ وفا را در گرفت
آں تصوّر را کہ در دِل داشتم — آخراً پیدا شد و پیکر گرفت
دل پسِ ہر زخم کز تیرش بخورد — اعتبارِ شوق را از سر گرفت
کارِ سوزِ دل بآں درجہ کشید — در گلو آخر نفس ہم در گرفت
از صدائے نالہ ہائے زارِ من — آسماں را گوش سنگیں تر گرفت

ہادیا برخیز و گامے زن بشوق
دِل سراغ مدعا را در گرفت

ہادی مچھلی شہری

جامِ زندگی

اے جانِ زندگی و دل آرامِ زندگی! — تیری ہر اک نظر میں ہے پیغامِ زندگی
آغازِ زندگی ہے نہ انجامِ زندگی — وابستہ تیرے نام سے ہے نامِ زندگی
دُھندلا سا داغِ حسرتِ ناکامِ زندگی — ہے یادگارِ عشرتِ ایامِ زندگی
افسردگی سے تنگ ہوں ساقی میں بے طرح — للہ کر عطا مجھے اِک جامِ زندگی
اللہ ری اُن کی شوخ نگاہوں کی مستیاں — لبریز ہیں شراب سے دو جامِ زندگی
جب سے وہ جلوۂ رخِ انور ہے دِلنشیں — کٹتے عجب طرح سے ہیں ایّامِ زندگی

اے بیوفائیں تیری محبت کو کیا کہوں — رگ رگ میں ہے اک آتشِ بے نام زندگی
کٹ جاتیں اُن کے ساتھ جو دردِ فراق ہیں — سمجھو اُنہیں کو حاصلِ ایامِ زندگی
غافل! ہے تو ہی بین حقیقت سے بے خبر — خود ورنہ دردِ زیست ہے انعامِ زندگی
چھیڑا تھا دل کو حسنِ ازل نے کچھ اس طرح — اب تک تڑپ رہا ہوں تہ دامِ زندگی
رازِ حیات کی ہے حقیقت کچھ اور ہی — یہ زندگی نہیں ہے یہ ہے نامِ زندگی
کیا خوفِ مرگ؟ اور یہ کیا خواہشِ حیات؟ — بالا تعیّنات سے ہے بامِ زندگی

حاصل ہوئی نہ غم سے فراغت کبھی جلیل
کس درجہ میں تھا دہر میں ناکامِ زندگی

جلیل قدوائی

نذرِ غالب

خلش کیوں کم ہوئی ہے ماجرا کیا — کوئی ٹوٹا ہے دل کا آبلا کیا
مری مونس ہی تصویر تیری — کسی نے بھر دیا رنگِ وفا کیا
نہ دیکھی زندگی بھر شکلِ اُمید — میری مایوسیوں کا پوچھنا کیا
وہ گرنا اُن کی نظروں میں سما کر — اُٹھائی عشق میں اُفتاد کیا کیا
مجھے تو دل کی بیتابی نے مارا — خطا تے قاتلِ صبر آزما کیا
نہ ہو جب دل ہی قابو میں کسی کا — نوائے مطربِ رنگیں ادا کیا
جنوں افزا تھا جوشِ سبزہ و گل — کیا دامن کو میں نے چاک کیا کیا

مسخر کر لیا اُس بُت کو شامی
تری گفتار ہے معجز نما کیا

شامی

مرگِ احمر

"مرگِ احمر" نے ایک مدت سے مُلک میں تباہی پھیلا رکھی تھی۔ خدا کی پناہ، ایسی مہیب اور مہلک وبا اس سے پہلے کبھی دیکھنے سُننے میں نہ آئی تھی۔ مُلک ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایک مسلسل کا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا جس میں بغیر تیغ و تفنگ کے کشتوں کے پُشتے لگ رہے تھے۔ اور لہو کی ندیاں جاری تھیں۔ جس کو دیکھو بیٹھے بٹھائے شدت کا درد ہونے لگا۔ یکایک سر چکرا گیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ جوڑ جوڑ سے خُون پھُوٹنے لگا۔ جیسے کوئی چشمہ پھُوٹتا ہے۔ اور گھڑی بھر میں فیصلہ ہو گیا۔ مرض کا لاحق ہونا، بڑھنا اور تمام مدارج طے کر کے اپنے ناگزیر انجام تک پہنچنا۔ یہ تمام عمل دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا تھا۔ جہاں کسی بدنصیب کے چہرے پر سُرخ چھائیاں نمودار ہوئیں، تو یہ گویا خطرے کا نشان تھا۔ جسے دیکھتے ہی دوست احباب جنہیں اپنی جان پیاری تھی حقِ دوستی اور انسانی ہمدردی کا فرض بھول کر کوسوں دور بھاگ جاتے تھے۔ اور پھر اُس کا موت کے سوا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا تھا۔ اس طرح ہزاروں کی تعداد میں مخلوقِ خدا موت کی دیوی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ گئی۔

لیکن نوجوان، خوشباش اور صاحب تدبیر شہزادہ پراسپرو بیخوف و خطر تھا۔ جب اُس کی رعایا آدھی سے زیادہ موت کی نذر ہوگئی تو اُس نے اپنے درباریوں میں سے ایک ہزار یار باش لوگوں کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ اور اُن کو ساتھ لیکر ایک خانقاہ کے خلوتخانے میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ خانقاہ ایک وسیع اور عظیم الشان عمارت تھی۔ جس کا نقشہ تعمیر خود شہزادے کی طبعِ نادرہ کار کا نتیجہ تھا۔ ایک اُونچی اور پختہ دیوار اُس کے چاروں طرف احاطہ کئے ہُوئے تھی۔ اور اس دیوار میں لوہے کے متعدد دروازے تھے۔ درباریوں نے داخل ہوتے ہی ہتھوڑے اور بھٹیاں لے کر دروازوں کے قبضوں کو گلا کر کوٹ دیا اور دروازوں کو بند کر دیا۔ اُنہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آمد و رفت کے تمام ذرائع مسدود کر دئے جائیں گے۔ تاکہ نہ باہر سے کوئی وحشت زدہ ہو کر اندر آسکے۔ اور نہ کوئی اندر والا گھبرا کر باہر جا سکے۔ خارجی دُنیا سے اس ترکِ علائق کو تادیر قائم رکھنے کے لئے کھانے پینے کی چیزوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا گیا تھا۔ یہ ساز و سامان کر چکنے کے بعد درباریوں کو اپنی حفاظت کی کامل امید ہو گئی۔ باہر والے

جانیں اور اُن کی قسمت جانے۔ یہ تو اس گوشۂ عافیت میں اطمینان اور دلجمعی سے بیٹھے تھے۔ آخر غم و افسوس سے حاصل بھی کیا تھا؟ لاکھ روتیے، اپنی آنکھیں ہی کھوئیے گا جو ہونا ہے وہ تو بہرحال ہو کر رہے گا۔ پھر کیوں انسان اپنی رُوح کو خواہ مخواہ اذیّت میں مبتلا کرلے! اسی خیال سے شہزادے نے عیش و عشرت کے تمام لوازم مہیّا کر لیتے تھے۔ بھانڈ نقال، ظریف مسخرے، رقص و سرود، مے و محبوب غرض خوشوقتی کا تمام سامان اس عشرتکدے میں موجود تھا۔ لیکن باہر "مرگِ احمر" تھی اور اُس کی تباہ کاریاں۔

ان لوگوں کو اس حالت میں رہتے ہوئے پانچ چھ مہینے کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور وبا پورے زوروں پر تھی کہ ایک دن شہزادے نے اپنے ہزار دوستوں کو بُلا کر ایک محفلِ رقص برپا کرنے کا حکم دیا۔

وہ رقص ایک ہوس انگیز نظارہ تھا جس میں نگاہ کی شادابی اور رُوح کی عشرت اندوزی کا سامان وافر مہیّا تھا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میرا قلم اس کی سرمستیوں اور سرخوشیوں کے بیان سے لغزشِ مستانہ میں محو ہو جاتے ہیں اُن کمروں کا نقشہ آپ کے ذہن نشین کر دینا چاہتا ہوں۔ جن میں یہ محفل منعقد ہوئی تھی۔ یہ کمرے ایکدوسرے کے برابر برابر سات کمرے تھے۔ جن کی ترتیب اس طریقے پر ہوئی تھی۔ کہ نگاہ ایک وقت میں صرف ایک کمرے پر پڑتی تھی۔ عموماً شاہی محلوں میں ایسے کمرے اس قرینے سے بناتے جاتے ہیں۔ کہ ایک طویل قطار بناتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور اگر ان کے دروازے کھول دیتے جائیں تو ایک طرف کھڑے ہونے سے دوسری طرف تک نگاہ گزر جاتی ہے۔ اور اس طرح ایک ایسی سرنگ کا منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جس کے دو سرے سرے پر روشنی ہو۔ لیکن شہزادے کے جدّت طراز مذاق سے اس امر کی توقع نہ ہوسکتی تھی۔ کہ وہ اس عامیانہ قاعدے کا تتبع کریگا۔ چنانچہ بیقاعدگی ان کمروں کی ترتیب کی خصوصیّت امتیازی تھی۔ کمروں کے درمیان جو راستہ تھا۔ اُس کی پیچیدگیاں ایک بھول بھلیاں تھیں۔ ہر بیس تیس گز کے فاصلے پر خلافِ توقع ایک موڑ آجاتا تھا۔ اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا کی گئی تھی۔ اس راستے کے دونوں جانب کی دیواروں میں گوتھک طرز کی کھڑکیاں تھیں۔ جو کمروں کے اندر کی طرف کھلتی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوتے تھے۔ رنگوں کے انتخاب میں التزام اس بات کا رکھا گیا تھا۔ کہ کسی کمرے کے آرائشی سازوسامان میں جس رنگ کا عنصر غالب ہو۔ اُسی رنگ کے شیشے اُس کی کھڑکی میں لگاتے جائیں۔ مثلاً مشرقی سرے پر کا کمرہ نیلے رنگ کے فرش فروش سے سجایا گیا تھا۔ اُس کے

مطابق کھڑکی کے شیشے بھی نیلے رنگ کے تھے۔ دوسرے کمرے کا سامان آرائش ارغوانی تھا چنانچہ شیشے بھی ارغوانی تھے تیسرا کمرہ تمام سبز تھا۔ اور شیشوں کا بھی یہی رنگ تھا۔ چوتھے کی سجاوٹ نارنجی رنگ کے جھاڑ فانوس سے ہوتی تھی۔ پانچواں سفید اور چھٹا بنفشی رنگ کے ساز و سامان سے مزین تھا۔ اور اُن کے شیشے بھی علی الترتیب سفید اور بنفشی تھے۔

لیکن ساتویں کمرے میں اس ہم آہنگی کے سلسلے کو منقطع کر دیا گیا تھا۔ اُس کے در و دیوار تمام سیاہ مخملی پردوں میں ملفوف تھے۔ جو چھت سے معلق تھے۔ اور بڑی بڑی تہوں میں فرش پر پڑتے تھے۔ لیکن یہاں شیشوں کی اور سامان آرائش کی ہمرنگی۔ ملحوظ خاطر نہ رکھی گئی تھی شیشے سُرخ تھے۔ ایسے سُرخ جیسے خون کا رنگ ہوتا ہے۔ ان ساتوں کمروں میں یوں تو طلائی اور زر کار سامان کی فراوانی تھی لیکن کوئی لمپ یا شمعدان نظر نہ آتا تھا۔ روشنی کا انتظام اس طور پر کیا گیا تھا کہ ہر کھڑکی کے قریب کمرے کے باہر ایک تپائی تھی۔ جس کے اُوپر ایک آتشدان رکھا ہوا تھا۔ اس آتشدان میں آگ دہکتی تھی۔ جس سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر اور شیشوں میں سے چھن چھن کر رنگا رنگ کی جگمگاہٹ اور چکا چوند پیدا کرتی ہوئی کمرے کو روشن کرتی تھیں۔ جب ان کرنوں کا رنگین پرتو ساز و سامان پر ایک لرزش کی کیفیت کے ساتھ پڑتا تو عجیب و غریب اور زرق برق شکلوں کا ایک ہجوم آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ لیکن ساتویں کمرے میں جو از سرتاپا سیاہ پوش تھا جب اس روشنی کی کرنیں سُرخ رنگ کے شیشوں سے گزر کر سیاہ پردوں پر منعکس ہوتیں۔ تو ایک نہایت درجہ دہشتناک کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور جو شخص اس کمرے میں داخل ہوتا اُس کا چہرہ روشنی اور تاریکی کے مخلوط اثر سے ایک ایسی خوف انگیز شکل اختیار کر لیتا کہ درباریوں میں سے کم لوگ ایسے تھے جن کو اس میں قدم رکھنے کی جرأت ہوتی۔

اسی کمرے میں آبنوس کی ایک جسیم گھڑی ایک دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ جس کا رقاص ایک اُداس اور بیزار کن آواز کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ اور جب منٹ کی سوئی چکر لگا کر بارہ پر پہنچتی اور گھنٹہ بجنے کے قریب ہوتا تو گھڑی کے اندر سے ایک ایسی آواز نکلتی جو یوں تو بلند اور سریلی تھی۔ لیکن اُس میں ایک ایسی خاص قسم کی گونج تھی۔ کہ ہر بار جب گھنٹہ بجتا تو مطرب ایک لمحے کے لئے اپنے سازوں سے دستکش ہو جاتے اور ہمہ تن گوش ہو کر اس آواز کو سُنتے اور اسی طرح ناچنے والے بھی گھنٹے گھنٹے کے وقفے کے بعد اس غیر معمولی آواز کے سُننے کے لئے تھم جاتے۔ اور محفل کے ہنگامۂ حیات پر ایک متامّل سا سکون طاری ہو جاتا جب تک گھنٹے کی صدائے بازگشت کمرے کی فضا میں باقی

رہتی، اُس وقت تک اُن لوگوں کے چہرے پر بھی مُردنی سی چھائی رہتی تھی۔ جو مَئے نشاط کے نشے میں چور دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ اور جو ذرا زیادہ ہوشیار اور اپنے حواس کو قائم رکھنے پر قادر تھے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے گویا کسی گہرے سوچ میں ہیں۔ اور جب یہ آواز اُبھر اُبھر کر خاموشی کے بے پایاں سمندر میں ڈوب جاتی، تو ایک خفیف سی ہنسی کی موجیں کمرے میں بلند ہوتی تھیں۔ گویئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خفت آمیز انداز سے مُسکرا دیتے گویا اپنی حماقت اور بودے پن پر نادم ہو رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے کان میں چپکے چپکے کہتے کہ آئندہ جب گھنٹہ بجے گا۔ تو ہم اپنے پر مطلق اُس کا اثر نہ ہونے دیں گے لیکن جب گھڑی کی سُوئی اپنی ساٹھ منٹ کی گردش پُوری کر کے پھر اپنے مقام پر آتی۔ تو پھر ایک آواز اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکل کر گونجتی، اور پھر اسی طرح محفل کا رنگ متغیر ہو جاتا

بہر حال یہ جشن ایک شاندار جشن تھا۔ اس کے حسنِ انتظام میں شہزادے نے اپنی ندرتِ طبع کا بیّن ثبوت دیا تھا خصوصاً رنگوں کے انتخاب میں اُس کا اندازِ نگاہ نرالا تھا۔ وہ مذاقِ عام کے مطابق رنگوں کی ظاہری آرائش و زیبائش کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ بلکہ اُس کے ذہن میں اُن کی سجاوٹ اور حسنِ ترکیب کے عجیب عجیب نقشے آتے تھے۔ جن میں ایک غیر معمولی چمک دمک تھی اور بھڑکتے ہُوئے شعلوں کا سا التہاب تھا۔ ممکن ہے بعض لوگ اُسے دیوانہ تصوّر کرتے۔ لیکن اس کے دوست خوب جانتے تھے۔ کہ وہ کیسا صحیح الدّماغ آدمی تھا۔

اس عظیم الشان جشن کے موقعہ پر شہزادے نے اپنے اہتمامِ خاص سے ساتواں کمرہ سجوایا تھا۔ اور اربابِ محفل نے اُسی کی پسندِ طبع کے موافق بھیس بدلے تھے۔ یقین جانئے گا۔ اُن کے لباس عجیب و غریب لباس تھے۔ انوکھی وضع و قطع کے لباس جنہیں دیکھ کر طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے تھے۔ چمکیلے اور فوق البھڑک لباس جن پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ اَنمل، بے جوڑ اور بے ڈھنگے لباس جن میں تناسبِ اعضا کا کچھ خیال نہ کیا گیا تھا کسی کی ٹانگیں دھڑ سے لمبی، کسی کا سر جسم سے بڑا، کسی کی کچھ صورت کسی کی کچھ۔ غرض اس طرح کی شکلیں بنائی گئی تھیں جیسی کسی دیوانے کو خواب میں نظر آتی ہونگی۔ حُسن، ہوس انگیزی، عُجب ہیبت، ان سب کا ایک طرفہ مجموعہ تھا۔ اور ان میں ایسی چیزوں کا عنصر بھی مفقود نہ تھا۔ جن کو دیکھ کر طبیعت متنفر ہوتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ ساتوں کمرے عالمِ رویا کا منظر پیش کر رہے تھے۔ جس میں مختلف شکلیں رقص کر رہی تھیں اور اِدھر اُدھر بل پیچ کھاتی ہُوئی پھر رہی تھیں شیشوں کے رنگ کا انعکاس اُن کے جسم پر ایک عجیب فروغ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے مخصوص اندازِ خوشخرامی سے

قدموں کو جنبش دیتیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ موسیقی جس سے کمرہ معمور ہے۔ ان کی رفتار سے پیدا ہو رہی ہے۔ اور کبھی کبھی جب وہ آبنوس کی گھڑی جو ساتویں کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ اپنی بے ہنگم آواز بلند کرتی۔ تو اس طوفانِ رنگ ونغمہ کی شورشوں پر ایک لحظے کے لئے سکون کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اور گھڑی کی آواز کے سوا ہر آواز خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ رنگارنگ کی شکلیں جو کمروں کی خوابناک فضا میں رقصِ دیوانہ وار میں مصروف تھیں۔ ساکت وصامت ہو جاتیں گویا گھڑی کی آواز نے اُن پر خاموشی کا افسوں پڑھ دیا تھا لیکن اس آواز کی گونج آہستہ آہستہ دھیمی پڑ جاتی، اور ایک لمحے کے بعد ہنسی کی ایک خفیف سی لہر اٹھتی، اور اُسے بہا کر کمرے سے باہر لیجاتی۔ نغمے کے سیلاب میں از سرِ نو جوش آتا۔ اور وہ ساکت شکلیں جو گویا یخ بستہ ہو گئی تھیں، پھر ایک بار گرمیٔ حیات سے آشنا ہو جاتیں۔ وہ پھر پہلے کی طرح بل کھاتی ہوئی، اور اپنے جسموں کو ہزار ہزار انداز سے لچکاتی ہوئی، اِدھر اُدھر تھرکتی پھرتی تھیں۔ کھڑکیوں کے مختلف اللون شیشوں کا عکس اُن پر اپنی رنگیں بہار دکھاتا، اور روشنی کی کرنیں اُن کی ہر جنبش کیساتھ رقص کرتیں لیکن مغربی کنارے کے کمرے میں جانے کی کسی کو جراٰت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ رات بہت جا چکی تھی، اور آتشدانوں کی روشنی جب سرخ رنگ کے شیشوں میں سے چھن چھن کر کمرے کے سیاہ مخملی فرش فروش پر پڑتی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ رنگ کے خون آلود کفن ہیں اور جس شخص کا پاؤں فرش پر پڑتا اُس کے کانوں میں آبنوس کی گھڑی کے اندر سے ایک ایسی آواز آتی جس میں خوف ودہشت کے عناصر اُن آوازوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ نمایاں طور پر ملے ہوئے تھے۔ جو دوسرے کمروں میں سُنائی دیتی تھیں۔

لیکن ان دوسرے کمروں میں اربابِ جشن کے انبوہ سے تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اور زندگی کی بیقرار حرکت پورے جوش سے ہنگامہ آرا تھی۔ جشن وطرب کی کیف انگیزیاں بدستور جاری رہیں۔ تا آنکہ گھڑی نے آدھی بجائی۔ پھر یکایک موسیقی خاموش ہو گئی۔ ناچنے والوں کے جسم کی حرکت ایک سکون منجمد میں تبدیل ہو گئی اور اس مختصر سی دنیائے عیش کے نظام میں پہلے کی طرح خلل واقع ہو گیا۔ لیکن اب کے گھڑی کو بارہ بجانے تھے۔ اور چونکہ اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ اس لئے اُن لوگوں کے ذہن میں جو غور وفکر کے عادی تھے۔ قدرتی طور پر مختلف خیالات کا ہجوم ہونے لگا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس سے قبل کہ گھڑی کی آواز کا طول بے محابا ختم ہونے پاتے۔ اربابِ جشن کے گروہ میں بہت سے لوگوں کو ایک اجنبی نقاب پوش

کے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ جس کی طرف پہلے کسی کی توجہ مبذول نہ ہونے پائی تھی۔ اُس کی موجودگی کی خبر سرگوشیوں نے ایک لمحے میں ایک کان سے دوسرے کان تک پہنچا دی۔ یہانتک کہ تمام مجلس میں اظہارِ تعجب کی ایک مخلوط سی آواز پیدا ہوئی۔ پھر سب کی متنفر اور خائف نگاہیں یکبارگی اُس پر مرکوز ہوگئیں۔ اور چاروں طرف پکار پڑگئی۔

ایک ایسی محفل میں جہاں عجیب و غریب سوانگ بھرے جاتے تھے اور طرح طرح کی شکلیں بنائی جاتی تھیں۔ کسی اجنبی شکل کا نمودار ہونا کوئی غیر متوقع امر نہ تھا۔ شہزادہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر ہر کسی کی قدرتاً یہی خواہش ہوسکتی ہے کہ دوسروں پر سبقت لے جانے کے لئے انوکھی سے انوکھی وضع اختیار کرے اس لئے اُس نے نفاست پسندی اور خوش مذاقی کی کوئی پابندیاں عاید نہ کی تھیں۔ اور اس امر کا اذنِ عام تھا۔ کہ کسی کا جس طرح جی چاہے اپنی صورت بگاڑلے لیکن اس اجنبی نقاب پوش کی ہیئت کذائی یقیناً ایسی تھی کہ شہزادے کی ندرت پسندی کی غیر معین حدود سے بھی تجاوز ہوگئی تھی۔ اُس کے عجیب الخلقت دماغ کے لئے کوئی غیر معمولی سے غیر معمولی چیز بھی تعجب خیز نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن اجنبی کی شکل و شباہت نے اُسے حیرت زدہ کردیا۔ اور وہ جو زندگی و موت کے مسئلے کو کھیل سمجھتا تھا۔ ہیبت کے اس زندہ مظاہرے سے متاثر ہوگیا۔ کوئی چاہے کتنا ہی لاابالی مزاج، اور لاپرواکیوں نہ ہو، لیکن اُس کی زندگی میں ایسے مواقع ضرور آتے ہیں۔ جب اُسے متانت و سنجیدگی سے کام لینا پڑتا ہے۔ شہزادہ اور اُس کے خوشباش احباب جو اس وقت ہر چیز کو تفنّن طبع کا سامان بنانے پر آمادہ تھے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ اجنبی کا لباس اور انداز و اطوار ایسے نہ تھے کہ انہیں ہنسی میں اُڑا دیا جاتے۔ اُس کا کشیدہ قامت اور نحیف جسم سر سے لیکر پاؤں تک ایک کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے کے خدّوخال نقاب میں سے ایک مردے کے خدّوخال سے اس قدر مشابہ نظر آتے تھے کہ یہی معلوم ہوتا تھا۔ گویا کوئی مُردہ قبر سے نکل آیا ہے۔ یہ سب کچھ اگر پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تو کم از کم نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اجنبی نے تو "مرگ احمر" کا بھیس بدل کر ستم ظریفی کی انتہا کردی تھی۔ اُس کا کفن سُرخ سُرخ چھینٹوں سے تر بتر تھا اور نقاب میں سے اُس کا چہرہ خون آلود نظر آرہا تھا۔

جب شہزادے کی نظر اس پر اسرار اجنبی پر

پڑی، جو ناچنے والوں کے حلقے کے درمیان ایک انداز تمکنت سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا چلا آرہا تھا، تو سب نے دیکھا کہ خوف یا کراہت کی ایک سنسنی اس کے تمام جسم پر دوڑ گئی۔ لیکن معاً اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اور اس نے اپنے درباریوں سے جو اس کے ارد گرد کھڑے تھے، رعد خیز لہجے میں پوچھا۔ "یہ کون نابکار ہے۔ جسے ہمارا مضحکہ اڑانے کی جرات ہوتی ہے۔ پکڑ لو اس گستاخ کو، اور اس کے چہرے پر سے نقاب اٹھا دو، تاکہ سب کو معلوم ہو جائے۔ کہ کل صبح کس شخص کو قلعہ کی دیوار سے الٹا لٹکایا جائیگا۔"

یہ الفاظ شہزادے نے مشرقی کنارے کے کمرے میں جو نیلے رنگ کے سامان سے آراستہ تھا کہے۔ لیکن وہ اس قدر بلند آہنگی سے ادا ہوئے تھے۔ کہ ساتوں کمرے اُن کی گونج سے معمور ہو گئے۔ کیونکہ شہزادہ ایک جری اور قوی انسان تھا۔ اور اس وقت موسیقی بھی اس کے ہاتھ کے اشارہ سے خاموش ہو چکی تھی۔

ان الفاظ کا شہزادے کے منہ سے نکلنا تھا کہ بہیدہ رنگ اور حواس باختہ درباریوں کی صفوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ لیکن اس مبہم خوف نے جو اجنبی کی پر اسرار شخصیت نے سب کے دلوں پر طاری کر رکھا تھا۔ کسی کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی چنانچہ وہ اسی شانِ تمکنت سے خراماں خراماں شہزادے کی طرف بڑھا اور سب کے سامنے اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ خوفزدہ درباریوں کی صفیں بدحواسی کے عالم میں کمرے کے وسط سے ہٹ کر دیواروں سے جا لگیں۔ اور اجنبی میدان خالی پاکر اپنے مخصوص اندازِ تبختر سے پہلے کمرے سے دوسرے کمرے میں، دوسرے کمرے سے تیسرے میں، تیسرے سے چوتھے میں، اور چوتھے سے پانچویں میں بید دھڑک چلا گیا۔ کسی نے اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کی لیکن عین اس وقت جب وہ چھٹے کمرے میں داخل ہونے کو تھا۔ شہزادہ پراسپرو جوشِ غضب اور اپنی بزدلی کے احساس سے دیوانہ ہو کر اس کے عقب میں لپکا۔ اس کے ساتھی تمام بُت بنے کھڑے رہے۔ شہزادہ ایک عریاں خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے جنون کے جوش میں اندھا دھند دوڑتا ہوا اجنبی کے قریب پہنچا تھا، جو اس وقت ساتویں کمرے میں داخل ہونے والا تھا کہ یک بیک اجنبی مڑ کر اپنے تعاقب کرنے والے کے رُوبرو کھڑا ہو گیا۔ ایک بلند اور زہرہ گداز چیخ سُنائی دی۔ خنجر بجلی کی سی چمک دکھا کر فرش پر آ رہا۔ اور

اُس کے ساتھ ہی شہزادہ گرا۔ اور گرتے ہی جسم بیجان ہوگیا۔ اُس جرأت مجنونانہ سے کام لیکر جو انتہائے مایوسی کے عالم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ شہزادے کے درباریوں میں سے چند لوگ ساتویں کمرے کی طرف دوڑے۔ اُنہوں نے دراز قامت اور نحیف الجثہ اجنبی کو جو ایک بلند و بےحس و حرکت ستون کی طرح آبنوس کی گھڑی کے سایے میں کھڑا تھا، چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا۔ لیکن جب اُن کے ہاتھوں کو کوئی چیز محسوس نہ ہوئی، اور انہیں معلوم ہوا کہ اجنبی اُسی طرح اُن کی گرفت سے مامون و مصون ہے جس طرح ہوا، تو اُنکے خوف کی کچھ انتہا نہ رہی

پھر سب پر ظاہر ہوگیا کہ "مرگ احمر" کا قدم اُنکے گوشۂ عافیت میں بھی آگیا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح چھپ کر آئی تھی۔ اور اسکا آنا فنا کا پیغام تھا یکے بعد دیگرے شہزادے کے عیش پرست احباب کمروں کے خون آلود فرش پر گرنے لگے۔ اور جس جس حالت میں کوئی گرا اُسی حالت میں موت کی بے دست و پائی اُس پر غالب آگئی۔ آبنوس کی گھڑی کی آواز مطلق خاموشی میں غرق ہوگئی۔ اور آتشدانوں کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر موت کی افسردگی طاری ہوگئی چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی تھی، ہُو کا عالم تھا اور مرگِ احمر اس کاشانۂ ویراں کی تنہا مالک تھی (ماخوذ)

محمد ہادی حسین

غزل

دہ کہ در عشق چہ سامان و سرے داشتہ ام — یعنی در سینہ ز دردش اثرے داشتہ ام

نشود راہِ دگر غیر محبت پویم — دلِ دیوانہ و آشفتہ سرے داشتہ ام

بخت من بستہ شد از تیرگیِ شام و ہنوز — بر تمنائے صباحے نظرے داشتہ ام

با جفا و ستمِ یار چرا جاں ندھم — بہرِ ہر تیرِ نگاہش جگرے داشتہ ام

راہبر حرف ز گم گشتگیِ من چہ زند — کس چہ داند کہ ز منزل خبرے داشتہ ام

کارِ بیتابیِ شوقم نپذیرد انجام — عمرہا شد کہ بلطفش نظرے داشتہ ام

ہرچہ از خامۂ ایجاد بر آفات گذشت — ہمہ اش را بدلِ بے خبرے داشتہ ام

ذوقِ قتلم بود از شوقِ جفا کاریِ او — مژدہا باد بتیغش کہ سرے داشتہ ام

برہِ دیر و حرم راہ نما را چہ کنم — کہ بنزدیکِ خودم سنگِ درے داشتہ ام

پیشم از صبر و سکون حرف چہ رانی ہادی — در محبت کہ نصیبے دگرے داشتہ ام

غمِ نصیب

ذیل کے صفحات ایک سلسلۂ کہنہ کی تجدید ہیں۔ جو ہزار داستان میں بہت مدت تک جاری رہنے کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر منقطع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اور اور دلچسپیوں نے مجھے مشغول رکھا۔ اور میں اس کی تکمیل کے فرض سے جو قارئینِ ہزار داستان کی طرف سے مجھ پر عاید ہوتا تھا۔ عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ میں اُن حضرات کا ممنون ہوں۔ جنکے متواتر اصرار نے مجھے یہ بھولا ہوا فرض یاد دلایا۔ اور اگر اتنی مدت کے بعد تلافی مافات کی کوشش لاحاصل نہیں تو میں انشاء اللہ شکایت کا موقعہ نہ رہنے دونگا۔

"غمِ نصیب" کی رسمِ تعارف اس سے پیشتر ادا ہو چکی ہے۔ تاہم اُن حضرات کے پاسِ خاطر سے جن کو اس کے دیکھنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا اس کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کا مصنف جرمنی کا مشہور و معروف ادیب گوئٹے ہے۔ جس کا نام ہندوستان میں سر اقبال کے "پیامِ مشرق" کی اشاعت کے بعد تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ کیونکہ اسی کے "سلامِ مغرب" کے جواب میں یہ غیر فانی کتاب لکھی گئی ہے۔ یورپ کی نگاہ میں اس کے علومرتبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دورِ متاخرین کا بہترین مصنف تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اُس کا شمار ہومر، ڈانٹے اور شیکسپیئر کے پہلو بہ پہلو ادبیاتِ یورپ کے ارکانِ اربعہ میں ہوتا ہے۔

"غمِ نصیب" گوئٹے کی ادبی زندگی کے اوائل کا کارنامہ ہے۔ بلکہ یہی کتاب تھی۔ جس سے شروع شروع میں اُس کی شہرت وابستہ رہی۔ یورپ کی تاریخ ادبی میں اس کا نام اُن منتخب کتابوں کی ذیل میں لیا جاتا ہے۔ جن سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس تاریخی حیثیت سے قطعِ نظر کر لیں۔ تو ایک اور اعتبار سے بھی اس کی قدر و قیمت نقادانِ ادب کے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ یعنی یہ گوئٹے کے عہدِ جوانی کی ایک مستند یادگار ہے۔ یہ ایک معروف و مسلّم حقیقت ہے۔ اور اس کا ثبوت گوئٹے کی خود نوشتہ سوانحعمری سے بھی بہم پہنچتا ہے۔ کہ اس کتاب کے جزئی واقعات کا بیشتر حصّہ ایسے واقعات پر مشتمل ہے جو خود اُسے

اپنی زندگی کے ایک دور میں پیش آئے۔ اور جن جذبات و حسیات کا اس کے ضمن میں اظہار کیا گیا ہے۔ وہ خود اس کی کیفیت قلبی کا آئینہ ہیں۔ بلکہ تحقیق سے یہانتک دریافت ہوا ہے۔ کہ جن خطوط سے کتاب کا پہلا حصہ ترتیب دیا گیا ہے۔ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جو کسی فرضی شخصیت کی طرف سے نہیں لکھے گئے۔ بلکہ فی الواقعہ اُس نے خود اپنی طرف سے لکھے۔ گوئٹے جیسا شخص جس کا دماغ انسان کے ذہنی ارتقاء کی سدرۃ المنتہےٰ مانا گیا ہے جسے بعض اعاظم پرستوں نے مافوق البشر کہنے میں تامل نہیں کیا۔ اور جسکی تصانیف تمدن حاضرہ کے ترکیبی عناصر میں ممتاز ترین حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر کسی کتاب میں اپنے عہد جوانی کے جذبات اور خیالات کا صحیح صحیح اظہار کرے تو اُس کتاب کی جتنی بھی قدر کی جائے، مقام تعجب نہیں۔ کم از کم مَیں نے اسی خیال سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ شروع کیا ہے اگرچہ گوئٹے کے نام کی نسبت سے صرف نظر کر کے اس کی ذاتی خوبیاں بھی اس کے حق میں کچھ کم سفارش نہیں۔

غم نصیب کو اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ وہ مختلف خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے تو اُس کا ہر حصہ بذات خود مکمل ہے۔ تاہم چونکہ یہ خطوط ایک سلسلے میں مربوط ہیں۔ اور ان کے ضمن میں ایک افسانہ محبت تحریر کیا گیا ہے۔ اس لئے تسلسل واقعات کا سررشتہ قائم رکھنے کے لئے گزشتہ افسانہ کا خلاصہ ضروری معلوم ہوتا ہے :-

وہرٹر نام ایک شخص ہے جسے قدرت نے بلند خیالی اور عالی دماغی کے ساتھ ایک نازک و حساس دل اور ضعیف ... ودیعت کیا ہے۔ اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر اور اپنے آپ میں اُن کے بدلنے کی صلاحیت نہ دیکھ کر وہ ہر وقت دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ اور نامساعدت بخت کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ غم روزگار کی جفائیں، اپنے ہمجنسوں کی نامہربانیاں اور بیوفائیاں، اور اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا مبالغہ آمیز احساس، یہ سب چیزیں مل ملا کر اُسے دنیا سے دُنیا والوں سے اور اپنے آپ سے بیزار کر دیتی ہیں۔ اور اُس کی رُوح کو ایک دائمی بیقراری میں مبتلا رکھتی ہیں۔ چنانچہ سکون کی ناکام جستجو میں مصروف وہ شہر بہ شہر آوارہ و سرگرداں رہتا ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران میں اُسے جو قابل ذکر واقعات پیش آتے ہیں۔ اور جو تاثرات اُس کے قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ اُن کو وہ گاہے گاہے اپنے ایک دوست ولیم

کو خطوں میں لکھ بھیجتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ وہ ایک مقام والہیم سے خط لکھتا ہے۔ اور اس میں ایک عورت کا ذکر کرتا ہے۔ جس کے ساتھ مل کر اسے رقص کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس عورت کا نام شارلوت ہے اور وہ اپنی ماں کی وصیت کے مطابق ایک شخص البرٹ نامی سے منسوب ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ویرٹر شارلوت کے جمالِ صوری و معنوی سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اور اُس سے راہ و رسم بڑھاتے بڑھاتے آخر کار محبت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ محبت صرف اُس کے دل کا ایک خاموش جذبہ نہیں بلکہ البرٹ اور شارلوت بھی اُس سے آگاہ ہیں۔ البرٹ اپنے حسنِ اخلاق کے باعث کبھی یہ بات نہیں جتاتا اور ویرٹر سے بہت خاطر و مدارات کا سلوک کرتا ہے۔ شارلوت بھی اُس کی محبت کی قدردان ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اُس فرض کا احساس جو اُس کی ماں نے مرتے دم اُس پر عاید کیا تھا۔ اُسے ایجابِ محبت سے معذور رکھتا ہے۔ ویرٹر کو کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے۔ کہ اُس کی محبت شارلوت کے دل پر اثر کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور وہ محض ضمیر کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ راز اُس پر فاش نہیں کرتی۔ لیکن ویرٹر کی حسِ اخلاقی بھی اتنی تاثر پذیر ہے کہ وہ شارلوت کے ضمیر پر غلبہ پانے کی کوشش کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں کامیاب محبت کا وہ مفہوم نہیں جو عوام الناس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ نکاح کے رشتے کو جو دُنیا داروں کی نگاہ میں عشق کی معراج ہے۔ اتصالِ روحانی کا ضامن نہیں سمجھتا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ شارلوت کے قرب کا بھی خواہاں نہیں رہتا۔ اور ایک سفیر کے ماتحت ملازمت اختیار کر کے کسی اور مقام کو چلا جاتا ہے۔ اس میں اُس نے ایک مصلحت بھی سوچی ہے اُسے خوف ہے کہ مبادا کسی دن وہ بیخودی کے عالم میں اُن محرمانہ آرزوؤں کا جو اُس کے دل میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ اظہار کر بیٹھے۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ شارلوت کو آزمائش و ابتلا میں ڈالے۔

ذیل کے خطوط انہی دنوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ جب وہ شارلوت سے جدا ہو کر عملہ سفارت کے ہمراہ شہر بشہر پھر رہا تھا۔ پہلے خط میں ایک ناگوار واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ جو اُسے چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ جس شہر میں وہ مقیم تھا وہاں ایک کاونٹ سے اس کے مراسم دوستانہ ہو گئے۔ اور اُس کے علاوہ ایک عورت سے جسے وہ مس ب.... کہتا ہے محض مطابقت مزاج کی بنا پر جان پہچان ہو گئی۔ ایک دن کاونٹ نے اُسے

ایک تقریب پر مدعو کیا۔ جس میں شہر کے روسا و اُمراء کے کبار شریک تھے۔ ان لوگوں نے اس سے نخوت فروشی کا سلوک کیا۔ اور مس ب ..... بھی خلافِ توقع اُس مجلس میں اس سے ہمکلام نہ ہوئی۔ اس سے اُس کی عزتِ نفس کو بہت صدمہ پہنچا! چنانچہ یہ خط اُس کے برافروختہ جذبات کا اظہار ہے۔ اس کے بعد کے خط میں سفیر کی ملازمت سے مستعفی ہونے کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ بھی اس کا نباہ نہ ہوتا تھا۔

۱۶۔ مارچ

معلوم ہوتا ہے ساری دنیا نے میرے خلاف سازش کر لی ہے۔ آج راہ میں مس ب ..... سے ملاقات ہوگئی۔ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ سیر کو جا رہی تھی۔ میں بھی ان میں شامل ہولیا۔ اثنائے سیر میں جب اُس کے ساتھی گفتگو میں مصروف ہم دونوں سے کچھ آگے نکل گئے۔ تو میں نے ازراہِ شکایت کہا۔

"کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے کچھ ناخوش معلوم ہوتی ہو؟"

اُس نے وفورِ احساس سے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا

"ویرٹر، تم تو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں میری نسبت یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی؟ تم نے میری خاموشی کو غرور پر محمول کیا ہے۔ حالانکہ وہ انتہائی رنج کی وجہ سے تھی۔ خدا جانتا ہے کہ جب سے تم اُس کمرے میں داخل ہوتے ہو میری کیا حالت ہے۔ میرا جی پہلے ہی ڈر رہا تھا۔ کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے اور کئی مرتبہ میں نے ارادہ بھی کیا کہ تم سے کہہ دوں۔ میں جانتی تھی کہ ان لوگوں کے دماغ عرش پر ہیں۔ اور یہ کبھی نہ گوارا کریں گے کہ ان سے کم درجے کا کوئی ان کے برابر بیٹھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ بیچارا کاونٹ مجبور ہے۔ ان لوگوں سے بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر مجھے تم سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ کہہ دیتی تو اچھا ہوتا۔ یہ رُسوائی تو نہ ہوتی۔" اُس جملے نے میرے زخم تازہ کر دئے۔ اور مجھے وہ تمام طعن آمیز باتیں جو لوگ مجھے سُنا سُنا کر آپس میں کرتے تھے۔ یاد دلا دیں۔ میں نے بیصبری سے پُوچھا۔ "یعنی؟" اُس نے جواب دیا۔ "میں تمہیں کیا بتاؤں؟ جتنے مُنہ اتنی باتیں" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری بیصبری اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے چلّا کر کہا۔ "کیسی باتیں؟ میں نہیں سمجھا۔" آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے اس کے رخساروں پر بہ نکلے۔ میں شدت اضطراب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور ان کو چھپانے کی کوشش کئے بغیر جواب دیا۔ "تم میری پھوپھی کو جانتے ہو، وہ بھی وہاں تھیں۔ وہ اس واقعہ کو عجیب معنی پہناتی ہیں! کل رات سے انہوں نے تقریروں اور نصیحتوں سے میری جان کھالی ہے۔ تذلیل اور تحقیر کا کوئی کلمہ نہیں۔ جو اُنہوں نے تمہارے خلاف نہ کہا ہو۔ کوئی عیب نہیں جو اُنہوں نے تم پر نہ لگایا ہو۔ اور میں چپکی بیٹھی سب کچھ سُنتی رہی۔ میں تمہاری طرفداری کرتی کس طرح

سکتی تھی؟"

اُس کا ایک ایک لفظ تیر سا میرے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ اور وہ لاعلمی کے باعث میری اذیتوں میں اضافہ کئے جا رہی تھی اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کی ہمدردی کی باتوں سے میرے جذبات اس طرح مجروح ہو جائیں گے، چنانچہ اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ مجھے یہ بھی بتایا کہ ابھی اور طرح طرح کی باتیں سُننے میں آئیں گی۔ حاسد خوش ہونگے میری جگ ہنسائی پر پھبتیاں کہیں گے۔ اور مجھے اپنے غرور کی اس سزا پر طعنے دینگے۔ اُس کے اس اظہار ہمدردی نے میرے جذبات کو ازحد برانگیختہ کر دیا۔ یہاں تک کہ میرا غصّہ اب تک فرو نہیں ہُوا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھ پر ہنسے، مجھ سے تمسخر کرے۔ میں اُس شخص کو اپنے غُصّے کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دُونگا۔ اُس کے تاوان کو دیکھ کر شاید میرے جلے ہُوئے دل کو تسکین حاصل ہو کبھی مرتبہ میں نے ارادہ کیا ہے۔ کہ سینے میں خنجر بھونک کر اپنے ہی خون سے یہ آگ بُجھاؤں جو میرے تن بدن کو پھُونکے دیتی ہے! حیاتیات کے ماہر ایک خاص نسل کے گھوڑوں کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی لمبی دوڑ لگانے کے بعد دانتوں سے اپنی فصد کھول دیتے ہیں کہ اپنے کھولتے ہُوئے خُون کا جوش کم کریں۔ اُن کی مثال دیکھ کر میرے دل میں اکثر اوقات یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کہ کسی ایسی رگ پر نشتر لگا دوں، جس کے کٹتے ہی مجھے دُنیا کی مصیبتوں سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جاتے۔

۲۴۔ مارچ

میں نے آخرکار دربار میں استعفا دیدیا ہے امید ہے منظور ہو جائیگا۔ میں تم سے اس قصور کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے اس بارے میں مشورہ نہیں لیا۔ مگر میں مجبور تھا جانتا تھا کہ تم اپنی بات پر اڑے رہو گے۔ اور مجھے یہیں رہنے کی ترغیب دو گے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تم کو اُسی وقت آگاہ کروں جب پانی سر سے گزر جائے دیکھو بھائی والدہ کو تسلّی دینا۔ یہ خبر سُنکر انہیں ضرور صدمہ پُہنچیگا۔ مگر تم اُن کو سمجھانا کہ جس شخص سے اپنے لئے بھی کچھ کرتے نہیں بنتا اُس سے دوسروں کو کیا امید ہو سکتی ہے؛ وہ بیحد افسوس کریں گی۔ کہ میں ایک ایسی راہ سے بیراہ ہو گیا ہوں جو مجھے کسی دن وزارت کے جلیل القدر عہدے تک پُہنچا دیتی۔ وہ چاہے کچھ بھی خیال کریں، اور تم اس بات کے ثبوت میں کہ میں اپنے عہدے پر قائم رہتا تو بہتر ہوتا۔ چاہے جو دلائل پیش کرو، میرا جواب صرف اتنا ہے کہ میں کیوں آئندہ کی موہوم امیدوں پر اپنی موجودہ زندگی تلخ کر لوں؟ یہ امر واقعہ ہے کہ میں یہاں سے جانے کے لئے کمر باندھے ہُوئے بیٹھا ہوں۔ صبح گیا یا شام گیا۔ بہرحال میں نہیں اپنی منزل مقصود سے بیخبر نہیں رکھنا چاہتا اسلئے

نہیں بتا ہی دُوں۔ کہ شہزادہ ..... یہاں چند روز سے آیا ہُوا ہے۔ نہایت خوش خلق اور دوست نواز آدمی ہے۔ اور مجھ سے بہت شفقت کا برتاؤ کرتا ہے۔ اُس نے جب میرے استعفا دینے کی خبر سُنی تو مجھے برسات کے موسم کے لئے اپنے مکان پر چلنے کی دعوت دی۔ میرے اس کے مزاج میں سوائے ایک بات کے ہر طرح کی مطابقت ہے۔ اس لئے امید ہے نباہ ہو جائیگا۔

۱۹ اپریل تمہارے دونوں خط پہنچے شکریہ قبول ہو میں نے ابتک عمداً انکا جواب نہیں دیا کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ دربار سے استعفےٰ کا جواب آلے۔ تو پھر تمہیں خبر دوں بھی مجھے خوف تھا کہ کہیں والدہ وزیر سے درخواست کر کے چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹکا دیں لیکن خُدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی مراد بر آئی۔ میرا استعفا منظور کر لیا گیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وزیر نے کس نارضامندی سے میری درخواست پوری کی ہے۔ اور کیسے کیسے لطائف الحیل سے مجھے ٹال دینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ اگر میں ان تمام باتوں کا ذکر کروں تو تمہیں پھر ناصحانہ سمع خراشی کے لئے ایک موضوع ہاتھ آجائیگا۔ ولیعہد نے مجھے ایک گرانبہا عطیہ عنایت کیا ہے۔ اس عطا و احسان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس کے سوا میرے پاس اظہارِ شکر کا وسیلہ بھی کیا ہے؟

۵ مئی

خُدا خُدا کر کے رخصت کا دن آخر آ پہنچا ہے۔ اور میں سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ آج میں اس جگہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہونگا۔ دُعا کرو خدا پھر کبھی مجھے یہاں نہ لائے۔ جس راہ سے مجھے گزرنا ہے اُس سے صرف چھ میل کے فاصلے پر میرا پیارا وطن واقع ہے۔ اس لئے میرا ارادہ ہے کہ لگے ہاتھوں وہاں بھی ہوتا جاؤں۔ اور اپنے بچپن کی وہ یادگاریں دیکھتا جاؤں جن کا مٹا مٹا نقش ابتک میرے دل پر قائم ہے میں اُسی دروازے سے داخل ہونگا۔ جس سے میری والدہ والد کی وفات کے بعد اپنے پیارے وطن کے در و دیوار کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی نکلی تھیں اور تمہاری اُس اُجاڑ نگری میں جا بسی تھیں۔ خدا حافظ، میرے دوست، میں تمہیں اپنی خیر و عافیت سے آگاہ کرتا رہونگا۔

۹ مئی۔ جس طرح کوئی زائر خلوص اور عقیدت کا تحفہ لیکر کسی اُونچی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ اسی طرح میں نے بھی محبت کے جذبات سے بھرا ہُوا دل لیکر اپنے حریمِ وطن کا طواف کیا ہے ایک تناور درخت کے پاس جس سے گاؤں پون میل کے قریب رہ جاتا ہے۔ میں نے گاڑی ٹھہرالی۔ اور اُتر گیا تاکہ تنہا اور پیادہ پا اپنے خیالات کی عشرت کا لطف اُٹھاؤں۔ وہ درخت جو کسی زمانے میں میری تنہا گردیوں کی حدِ آخر ہوتا تھا میں اسکی چھاؤں میں دم لینے کھڑا ہو گیا۔ اُسوقت کے بعد زمانے پر کیا کیا دَور آئے اور گزر گئے۔ اور زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ میں بھی کیا سے کیا ہو گیا ہوں! ایک وہ دن تھے کہ میں ایک

مسرور جہالت کے عالم میں اس ان دیکھی دُنیا کو دیکھنے کی آرزوئیں کرتا تھا۔ جسے میں اپنا قبلہ امید اور اپنی تمناؤں کا ملجا و ماویٰ سمجھتا تھا۔ اور ایک یہ دن ہے کہ میں اُس دُنیا سے واپس آرہا ہوں۔ اور ہزاروں مایوس تمنائیں اور ناکام تدبیریں دل کی دل میں لیئے آتا ہوں۔

میں نے پہاڑوں کے وہ طول طویل سلسلے دیکھے جو میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ تو میرے دل میں خیال آیا کہ کسی زمانے میں یہ پہاڑ میرے تصوّر کی جولانیوں کی انتہا ہوتے تھے۔ اسی جگہ بیٹھ کر جہاں میں اس وقت بیٹھا تھا میں گھنٹوں اُنہیں دیکھا کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اُس جنگل کے تاریک سایوں میں بھٹکتا پھروں، اور اُن نظر فریب وادیوں میں جاؤں جو دُور سے مجھے ایک خاموش بُلاوا دیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اور اپنے کو اُن کی دلفریبیوں میں جذب کردوں۔ پھر جب میرا تفریح کا وقت گزر جاتا اور میرے فرصت کے لمحے ختم ہوجاتے تو میں کسطرح اپنے دل پہ جبر کرکے اس دلکش مقام سے رخصت ہوتا!

چلتے چلتے میں گاؤں کے قریب آپہنچا۔ اور اگرچہ نئی نئی عمارتوں سے اُس کی صورت کچھ ایسی بدلگئی تھی کہ پہچانی نہ پڑتی تھی۔ تاہم بچپن کی یادگاریں ذہن سے کب اُترتی ہیں! سب سے پرانی بارہ دریاں اور پُرانے باغ میں نے ایک نظر میں پہچان لیئے۔ اور نئی تبدیلیاں خدا جانے کیوں میری نگاہ کو اچھی نہ معلوم ہوئیں! جب میں گاؤں میں داخل ہوا تو میرے تمام مُردہ احساسات میں

از سرِ نو جان پڑگئی۔ میں اُن تمام احساسات کا جُدا جُدا ذکر نہیں کرسکتا۔ کیونکہ خواہ وہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں بیان کرنے سے اُن کی تمام دلچسپی جاتی رہیگی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے پُرانے گھر کے قریب منڈی میں قیام کرونگا۔ داخل ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پُرانے مدرسے کا وہ کمرہ جس میں بیٹھ کر میں بچپن کے زمانے میں اپنی بُوڑھی اُستانی سے سبق پڑھا کرتا تھا۔ اب ایک دکان میں تبدیل ہوگیا ہے۔ طالبعلمی کی قیدِ بے زنجیر میں میں نے جو غم دیکھے تھے، جو آنسو بہائے تھے۔ اور جو تلخ تجربے حاصل کئے تھے۔ وہ سب ایک ایک کرکے مجھے یاد آنے لگے۔ ہر ہر قدم پر کوئی نیا اثر مجھ پر مترتب ہوتا تھا۔ ارضِ مقدس کا کوئی زائر اپنی زیارت کے دوران میں شاذونادر ہی مجھسے زیادہ ایسے مقامات دیکھتا ہوگا۔ جن سے اُس کی گزشتہ زندگی کی یادگاریں وابستہ ہوں۔ اور میں نہیں مان سکتا کہ اُس کی رُوح مجھ سے بڑھکر عبودیت کے جذبات سے معمور ہوتی ہوگی۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے تم کسی قدر اندازہ کرسکو گے۔ میں ایک ندی کے کنارے کنارے ایک کھیت میں جا نکلا۔ جو شروع شروع میں میری ایک دلپسند سیرگاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اور میں اُس جگہ پہنچکر رُک گیا۔ جہاں میں گاؤں کے بچوں میں شامل ہوکر پانی میں کھیلا کرتا تھا۔ میں وہاں کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ میں کسی زمانے میں کس طرح اس ندی کی روانیاں دیکھا کرتا تھا۔ سر میں شوق کا سودا لیئے ہوئے اسکی ابتدا و انتہا کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔

اور خیال ہی خیال میں اُن سرزمینوں کے نظارے دیکھا کرتا تھا جن میں سے یہ گزرتی ہوگی۔ مگر میرا تصوّر بہت جلد تھک کر رہ جاتا۔ پانی اپنی ان تھک رفتار سے بہتا چلا جاتا، اور میری نگاہیں اُس کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی اس قدر دُور جا پڑتیں کہ آخرکار دُوری کی حدِّ فاصل حائل ہوجاتی۔ کچھ اسی طرح میرے دوست، ہمارے اسلافِ اوّلین کے خیالات تھے۔ وہ بھی اپنے تصوّر میں نئی نئی دُنیائیں بناڈالتے تھے۔ مگر ہماری طرح اُن کے بھی خیالات کی پرواز ایک حدِّ معیّن تک پُہنچکر ختم ہوجاتی تھی۔ اُن کے احساسات اور اُن کی شاعری میں بچپن کی شگفتگی اور تازگی تھی تمہیں وہ عبارت یاد ہوگی۔ جہاں یولیسیز سمندر کی بے پایاں گہرائیوں اور زمین کی غیر محدود وسعتوں کا ذکر کرتا ہے اُس کے اقوال کیا سچّے، حقیقت سے معمور اور دلنشین ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ خُشک معلومات کو کوٹ کوٹ کر دماغ میں بھرلینا چاہتے ہیں۔ ذرا سوچو تو کہ مجھے اگر یہ معلوم ہوگیا کہ زمین گول ہے تو میں نے کونسا میدان مارلیا۔ یہ تو ہر طفلِ مکتب جانتا ہے۔ اور پھر اس کے جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ انسان کو گزرِ اوقات کے لئے گز بھر زمین کافی ہے۔ اور اُسے اپنی ابدی خوابگاہ کے لئے اس سے بھی کم درکار ہے۔

آجکل میں شہزادے کے ساتھ سیر و شکار میں مصروف ہوں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے کہ اُس کے ساتھ رہ کر انسان اچھی طرح بسر کرسکتا ہے۔ صاف گو اور صاف باطن آدمی ہے، جو دل میں ہے وُہی زبان پر ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ اُس میں چند ایک ایسی خصلتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ خصلتیں صریح طور پر معیوب تو نہیں کہی جاسکتیں، تاہم ایسی بھی نہیں کہ اُنہیں اوصافِ حسنہ میں شمار کیا جاتے۔ کبھی کبھی مجھے اُن پر ایسا گمان ہونے لگتا ہے۔ مگر میں یہ شک اپنے دل سے دُور نہیں کرسکتا کہ کہیں یہ میرے حُسنِ ظن کا نتیجہ تو نہیں۔

شہزادے کی ایک یہ عادت مجھے بہت شاق گزرتی ہے کہ وہ گھنٹوں ایسے امور کے متعلق تقریریں کرتا رہتا ہے جو محض سُنے سُنائے ہوتے ہیں اور اُسے خود اُنسے براہِ راست واقفیت نہیں ہوتی۔ پھر وہ اُن کو پیش بھی عین اُسی رنگ میں کرتا ہو۔ جس میں دوسروں نے اُنہیں اس کے سامنے پیش کیا ہو۔

وہ میرے دِل کی بہ نسبت میری دماغی استعداد کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ اور مجھ سے کوئی پُوچھے تو مجھے صرف اپنے دِل پر ناز ہے۔ یہ دل ہی تو ہے جو ہماری تمام قوتوں، ہماری تمام خوشیوں اور ہمارے تمام غموں کا واحد سرچشمہ ہے۔ یہ علم جو مجھے حاصل ہے، ہر کس وناکس ذرا سی محنت اُٹھا کر حاصل کرسکتا ہے۔ مگر میرا دل صرف میرا ہے۔ کوئی دوسرا لاکھ چاہے اس جیسا دِل نہیں پیدا کرسکتا۔ (باقی پھر) محمد ہادی حسین

غزلیات

(۱)

دل میں ہمارے اے خدا سوز بجائے ساز دے
نالۂ جانگداز دے خاطرِ غم نواز دے

اس پہ کھلا نہیں ابھی عشق و ہوس کا اختلاف
حسن کو اے مرے خدا دیدۂ امتیاز دے

اس کی نظر سے دور ہے حسن کمال کی جھلک
زاہدِ خود پرست کو دیدۂ امتیاز دے

ضبط کی بے رخی سے گر پھر سکوت ٹوٹ جائے
اتنی جنونِ عرض سے مجھ کو نوائے راز دے

عیش و طرب سے کیا غرض رنج و الم سے کام ہے
احسنؔ غم نصیب کو الفتِ جانگداز دے

(۲)

دیکھا وہ کچھ ہے پردۂ بختِ سیاہ میں
جچتی نہیں امید بھی اپنی نگاہ میں

میں دیکھتا ہوں نزع میں بھی منزلِ حیات
مانا کہ اب سکت نہیں پائے نگاہ میں

امید آکے دامنِ دل سے لپٹ گئی
جادو بھرا ہوا تھا کسی کی نگاہ میں

دل کی طرح فدائی انجامِ عشق ہو
الجھا ہوا ہے دامِ فریبِ نگاہ میں

اللہ رے حسنِ یار کی سحر آفرینیاں
جلوے پروئے جاتے ہیں تارِ نگاہ میں

منزل سے دور یاس کے دامن کو تھام کر
مانندِ نقشِ پا کوئی بیٹھا ہے راہ میں

اے دل خیالِ بادہ کشی دیکھ بھال کر
پنہاں ہے برق دامنِ ابرِ سیاہ میں

احسنؔ یہ دل ہے آئینہ دارِ جمالِ حسن
جلوے شکار ہوتے ہیں اس جلوہ گاہ میں

احسنؔ

کاتب

دُنیا کی کوئی طاقت کاتب تقدیر کا قلم نہیں روک سکتی۔ انسان ہزار سر مارے، لاکھ کوشش کرے مگر نوشتۂ قسمت میں ایک حرف کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ شاید یہی جباری اور مطلق العنانی آجکل کے کاتبوں میں حلول کر گئی ہے۔ یہ حضرات لکھنے کو تو کاغذ پر لکھتے ہیں مگر یہ کاغذی تحریر پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ مُصنّف برسوں کی شبانہ روز محنت اور جانکاہی سے مسودہ تیار کرتا ہے، بار بار اس پر نظرِ ثانی کرتا، اور دوستوں کو دکھاتا ہے، اعتراضات کے خوف سے تنقید نگاروں کے پاس بھیجتا ہے، غرض بڑی احتیاط اور دیکھ بھال کے بعد، ڈرتے ڈرتے اس کو مطبع کے سپرد کرتا ہے۔ اس کا یہ خوف حق بجانب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں کاتب کے حوالہ ہوتے ہی اس کی اصلاح شروع ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی کتاب خواہ وُہ سالہا سال کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئی ہو، اسقام سے خالی نہیں ہوتی۔ مگر یہ امر ضرور مشتبہ ہے کہ کاتب کو تنقید نگار کا ہاتھ بٹانے یا اُس کے لئے مواد فراہم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حضرات بعض اوقات وہ پچ کی لیتے ہیں کہ ناظرین کی تمام لغاتیں بیکار ہو جاتی ہیں، ان کو خُدا کے سامنے جوابدہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ کلام مجید بھی جس میں ایک زیر زبر کی تبدیلی کی گنجائش نہیں، ان کے تصرف سے نہیں بچتا۔

اُردو اخبارات و رسائل کے مالکوں کو خریداروں کے ساتھ ساتھ کاتبوں کی بھی فکر رہتی ہے۔ اور جب سے اُنھوں نے اپنی جماعت کی تنظیم کر کے باقاعدہ مطالبے شروع کر دیئے ہیں۔ مالکان مطابع کے لئے ان کا قلم مجسم قلم تقدیر بن گیا ہے۔ شعرا اور انشا پردازوں کو نقادانِ سخن کا اسقدر خوف نہیں ہوتا جسقدر کاتب کے قلم کا ہوتا ہے کاتب کی اہمیت صرف مُصنّف ہی کی نظر میں نہیں ہوتی بلکہ ناقدانِ سخن بھی ان کو بڑی وقعت دیتے ہیں۔ تقریباً تمام تبصرے "لکھائی چھپائی عمدہ یا معمولی" پر ختم ہوتے ہیں۔ اور بعض ریویو تو محض کتابت ہی پر ہوتے ہیں!

کاتب میں شان جباری تو ہے، مگر وہ کبھی کبھی ستار عیوب بھی ہوتا ہے۔ بعض مُصنّفین کی املا و انشا درحقیقت کاتب کی اصلاح کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب مُصنّف کا زور نقاد پر نہیں چلتا تو وہ اپنی

بلا کاتب کے سر ڈالنا ہے۔ کاتب عموماً نقاط، اعراب یا شوشوں میں غلطی کرتے ہیں، ایزٹ کو اونٹ لکھ دیتے ہیں، مگر ہاتھی نہیں لکھ سکتے! ہم نے بعض مصنّفین کو اس قسم کی غلطیوں کا الزام کاتب کے سر تھوپتے دیکھا ہے۔ وہ حضرات جو فنِ تنقید سے واقف نہیں، لیکن تنقید نگاری کا شوق رکھتے ہیں، کاتب کو بہت دعائیں دیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بیشتر اخبارات و رسائل میں تبصرے کتاب کی بجائے عموماً کتابت پر ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک رسالہ میں دیکھا کہ اُس میں "اُردو" پر بیس اعتراضات کئے گئے تھے۔ جن میں سے پندرہ کتابت کی غلطیاں تھیں۔

زمانہ حال کی ایجادوں نے جہاں علوم و فنون کو ترقی دی ہے، بعض فنون کو صدمہ بھی پہنچایا ہے۔ پریس کی ایجاد نے کتابوں کو پانی کے مول کر دیا۔ اور اس طرح فنِ تقریر کی قدر کم کر دی ہے۔ آجکل اکثر اہل علم مکانوں کے کونوں میں دبکے دبکائے اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ متقدمین کی طرح اب انہیں تقریر کی حاجت نہیں۔ پھر کتابیں بھی غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ بعض اہل قلم کو اس امر پر فخر ہے۔ کہ وہ ایک ہفتہ میں ایک کتاب تصنیف کر سکتے ہیں۔ اس دلیری کا ذمہ دار بھی پریس ہے۔ ہمیں اس وقت پریس کے

مضر اثرات بیان کرنے مقصود نہیں، بلکہ صرف کتابت سے بحث ہے۔ پریس کی ایجاد سے پیشتر یہ فن بہت معزز خیال کیا جاتا تھا۔ سلاطینِ مغلیہ کی طرح اب خوشنویسوں کو حکومت کی طرف سے زرّیں رقم یاقوت رقم خاں، زمرد خاں، اور جواہر رقم کے اعلےٰ خطابات نہیں دیتے جاتے۔ امانت خاں خوشنویس کو جنہوں نے روضۂ تاج محل پر کتبہ نویسی کی تھی، شاہجہان نے منصب ہزاری پر سرفراز کیا تھا۔ آقا عبدالرشید ایرانی اور میر محمد صالح مناصب ہفت ہزاری اور پانصدی پر ممتاز تھے۔ میر عماد، میر پنجہ کش اور حافظ امیر الدین دہلوی کے قطعات بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اب سے چوتھائی صدی پیشتر ارباب قلم اور اہل ذوق اپنے مکانوں کو قطعات سے آراستہ کرتے تھے۔ شہنشاہ جارج پنجم کے دربار تاجپوشی کے موقع پر لال قلعہ (دلی) میں ایک نمائش منعقد ہوئی تھی جس میں تمام عجائبات رؤسا و امرائے عظام اور ملک کے علم دوست حضرات سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس نمائش میں ایک کمرہ قدیم قلمی نسخوں اور قطعوں کا بھی تھا۔ یہ کتابیں اور وصلیاں فروخت کے لئے نہ تھیں۔ مگر دریافت سے معلوم ہوا، کہ ان میں بعض قطعوں کی قیمت سو سو اور دو دو سو روپے

تنگ تھی۔ یہ مانا کہ قدامت نے اس مے کہن کو نادر اور گرانقدر کر دیا تھا۔ مگر آجکل میر عماد اور میر پنجہ کش کی وصلیوں کے چربے بھی بڑی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں یہ بزرگ محض خوشنویس ہی نہ تھے۔ بلکہ بڑے اہل علم اور صاحبِ ذوق تھے۔ ان کی طبع سلیم اور مذاق صحیح کا پتہ رباعیات کے انتخاب اور فنِ خوشنویسی کی اصطلاحوں سے چلتا ہے۔ لوح، جدول، نشست کرسی، قامت حرف، قلم حرف، پیوند حرف، جلی، خفی، کبوتر دم، میدان قلم، وسیع میدان، تنگ میدان، زبان قلم، انسی، وحشی، پیوند، رکاب، بیضاوی دائرہ، ترنجی، آفتابی، شلجمی، معشوق، مصنوعی وغیرہ وہ پاکیزہ اصطلاحیں ہیں، جو دوسرے فنون میں کم نظر آتی ہیں۔ پھر خط کی طرز اور ان کے ناموں میں وہ وہ جدتیں پیدا کی ہیں کہ موجودہ زمانہ کے کاتب ان کو دیکھ کر قلم بدنداں رہ جاتے ہیں

یہ سراسر ناانصافی ہوگی کہ ہم کتابت کے تمام نقائص کا ذمہ دار اکیلے کاتب کو ٹھیرائیں۔ آجکل جبکہ فنون مفیدہ خصوصاً میکانی فنون کی ترقی اور فنونِ لطیفہ کی کساد بازاری کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا ہے کہ ہم تمام علوم و فنون میں کیفیت سے زیادہ کمیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ہر ملازم کو عام اس سے کہ وہ ہل جوتتا ہو یا شاعری کرتا ہو، مشین کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ اخباروں کے کاتبوں کو روزمرہ ۲۰ × ۲۶ کی تقطیع کے چار صفحے لکھنے پڑتے ہیں پھر اُجرت بھی عموماً مشین مین یا مستری سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جب قدردانی کا یہ عالم ہو تو ہمیں اس سے زیادہ توقع نہیں رکھنا چاہیے، کہ کتاب یا اخبار کی عبارت ایسی ہو، کہ پڑھی جا سکے۔

کاتب کی گوناگوں مشکلات میں مسودہ بھی داخل ہے۔ اس لوہے کے زمانہ میں جب سے واسطی قلم کی جگہ قلم آہنی نے لے لی ہے، نقاط نے دوئی کو چھوڑ کر وحدانیت اختیار کر لی ہے۔ اور شکستہ خط کی طرز میں کتابت ہونے لگی ہے۔ نقاط اور شوشوں کے فقدان سے عبارت صنعت غیر منقوطہ اور ابہام سے پر ہو جاتی ہے۔ جن حضرات کو مسودات زیادہ تعداد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، انہیں خوب معلوم ہے کہ زمانہ حال کے اہل قلم اپنے خطوط یا مسودہ کے خط میں دانستہ اور نادانستہ کس قدر نفسی کیفیتیں ظاہر کرنے یا کسی طرز جدید کے مالک بننے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اور اس طرزِ نو کے پردہ میں اپنی بدخطی کو چھپانے یا خوشخطی سے مرعوب کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ بعض حضرات نوائشِ قدر باریک لکھتے ہیں۔ کہ ان کی سطریں بالکل چیونٹیوں کی قطاریں معلوم ہوتی ہیں۔ بعض انشا پرداز شاید مغرب

کی تقلید میں قلم کو انگوٹھے اور انگشت شہادت کی گھائی کی بجائے وسطیٰ اور سبّابہ کے درمیان پکڑتے ہیں۔ اور بعض برچھے کی طرح پُوری مٹھی سے پکڑتے ہیں۔ اس بھروپ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بعض تحریروں میں خاص بیکانی رسم الخط کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض الفاظ ہیر و غلیف تحریر سے ٹکّر کھانے لگتے ہیں۔ یہ بلا بھی کاتب کے سر پڑتی ہے۔

ان انشا پردازوں کو جو مبیضہ کرانے کی بجائے اپنا مسودہ کٹا چھنٹا ہی بھیج دیتے ہیں، کاتب پر زیادہ بگڑنا نہیں چاہئے۔ بعض مسودات مُصنّفین کی متعدد بار کی نظرِ ثانی سے اچھے خاصے محشیٰ ہو جاتے ہیں۔ اور دوسروں کی اصلاح یا قلمی چرکوں سے اسقدر نڈھال ہو جاتے ہیں کہ کاتب کے لئے ان کی مرہم پٹی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے، کہ ان مسودوں کے بعض مقامات پر اس قسم کے اٹکاؤ اور اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہ کاتب غریب تو ایک طرف، خود مُصنّف کے لئے ان کا سلجھانا دشوار ہو جاتا ہے۔

سب سے بڑی مشکل جس کا مقابلہ کاتب کو کرنا پڑتا ہے۔ علوم و فنون کی جدید اصطلاحیں ہیں، یہ اصطلاحیں عربی، فارسی یا دیگر السنۃ العالیہ کی مدد سے وضع کی جاتی ہیں، جو اکثر ناظرین کے لئے معمّا ہوتی ہیں۔ اور یہ دِقّت اُس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب اصل انگریزی لفظ لکھ دیا جاتا ہے۔ ان مواقع پر کاتب کو ہر فن مولا سمجھنے کی بجائے اگر اصطلاحات کو خوشخط اور واضح طور پر لکھ دیا جائے تو اغلاط کی فہرست بہت کچھ مختصر ہو سکتی ہے۔ اُردو مطبوعات میں سب سے زیادہ غلط کتابیں ہندسہ اور اعداد و شمار کی ہوتی ہیں۔ حتےٰ کہ مدارس کے نصاب کی کتب ریاضی بھی اس قضیہ سے پاک نہیں ہوتیں، غالباً بعض کاتب بڑی رقوم صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اس لئے وہ سوالات و جوابات میں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ جس کا خمیازہ بچارے چھوٹے لڑکوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر اس قسم کی کتابیں ہوشیار کاتبوں سے لکھوائی جائیں، تو ان معصوموں کی دلشکنی اور غم و غُصّہ میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔

غلام ربانیؔ

شکنتلا

اگلے زمانہ میں جب اپسرائیں آسمان سے زمین پر سیر کے لئے اُترا کرتی تھیں اور کبھی کبھی انسانوں سے رشتہ جوڑ کر یہیں کی ہو رہتی تھی۔ ہندوستان کے اُتر میں بشوامتر نامی ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس راجہ کو گھیان دھیان سے بہت لگاؤ تھا۔ آخر اس شوق نے یہ ترقی کی کہ وہ راج کو تج کر فقیر ہوگیا۔ اور پرمیشور سے لو لگا کر بن میں جا بیٹھا۔ تپسیا کرتے کرتے اُسے وہ درجہ حاصل ہوا۔ جہاں انسان پر قدرت کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اب اس کے دل میں یہ اُمنگ آئی کہ بھگتی میں وہ تیج بل پیدا کرے جس کی بدولت اندراسن قبضہ میں آجائے۔ اور تمام دیوتا مطیع ہو جائیں اِدھر دیوتے بھی غافل نہ بیٹھے تھے۔ اور بشوامتر کی روحانی ترقی کو بڑی بے چینی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے کمال پر پہنچنے میں تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تو سب گھبراتے اندر کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ کہ "مہاراج! کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟ بشوامتر اندراسن لیا چاہتا ہے۔ اس کی تپسیا میں بھنگ ڈالنے کا اُپاؤ کیجئے۔ نہیں تو آسمانی بادشاہت سے ہاتھ دھو ڈالئے۔" یہ سن کر اندر مہاراج بہت سٹپٹائے اور دیر تک بیکل رہے۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد نیکا نامی ایک اُپسرا کو بلایا۔ جو حُسن میں سارے اندراسن کی جان تھی۔ نیکا حاضر ہوئی تو اُسے حکم دیا کہ "گومتی کے کنارے جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک جوگی ملیگا۔ جو پیپل کے درخت کے نیچے دُھونی رمائے تپسیا کر رہا ہے۔ اُسے اپنے ساتھ شادی پر رضامند کر کے دُنیا کے جال میں پھنساؤ۔ اور پھر لوٹ آؤ۔"

نیکا سولہ سنگار کر کے اندراسن سے اُتری اور گومتی کے کنارے پہنچکر بسوامتر جی پر ڈورے ڈالنے لگی۔ نیکا کا وار بھرپور پڑا۔ اور سوامی اُسے دیکھکر موہت ہوگئے۔ بسوامتر جی نے نیکا کے ساتھ شادی کی گھر گھرستیوں کی طرح رہنے لگے۔ اور اندراسن کا خیال دل سے نکل گیا۔ کچھ مدت کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اور نیکا اُسے رشی کے سامنے گھاس پر ڈالکر اندراسن کو اُڑ گئی۔ اب رشی کی آنکھیں کھُلیں اور اُنہیں معلوم ہوا کہ اندر نے جل دیکر اُن کا سب کیا کرایا اکارت کر دیا ہے۔ رشی شرم سے پانی ہوگئے۔ اور

یہ پرن کرکے وہاں سے چلے جانے کا ارادہ کیا۔ کہ پھر ایسی جگہ نہ ٹھیرینگے۔ جہاں عورت کا سایہ بھی پڑسکے۔ اتنے میں راج ہنسوں (شکنتا) کے ایک ٹڈی دل نے بسوامتر کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔ اور اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ سوامی سمجھ گئے کہ یہ بچّہ کی سفارش کر رہے ہیں۔ مگر ان کے دِل پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اتنا بھی غنیمت ہے کہ چلتے چلتے منتر پڑھ کر بچّہ کی حفاظت کا انتظام کر گئے۔ بسوامتر جی کا سندیسہ ہوا میں اُڑکر رشی کنوّ جی کے دِل تک پہنچا۔ وہ فوراً آشرم سے اس بیکس لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑے ہُوئے۔ مگر حیران تھے کہ کدھر جائیں۔ اور کہاں ڈھونڈیں۔ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے کہ شکنتا اِن کے سامنے آکر اُڑنے لگے۔ اور راستہ دکھاتے دکھاتے وہاں لے آئے۔ جہاں لڑکی پڑی تھی۔ کنوّ جی نے بچّہ کو اُٹھاکر سینہ سے لگا لیا۔ اور شکنتا کی رعایت سے اس کا نام شکنتلا رکھا۔ پھر اُسے لیکر آشرم میں چلے آئے۔ اور بڑے پیار سے شکنتلا کی پرورش ہونے لگی۔

کنوجی کا آشرم ہستنا پور[1] کے راجہ وشونت کے علاقہ میں واقع تھا۔ یہ راجہ بڑا سورما سپاہی تھا اور ایسا نیائی تھا کہ اس کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ چھ دن راج کا کام کرتا، اور ایک دن شکار کے لئے جنگلوں کو نکل جاتا۔ ایک دفعہ راجہ نے شکار میں ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا ہرن وہاں سے بھاگ کر ایک آشرم کے پاس جا پہنچا اندر سے ایک جٹا دھاری جوگی نکلا۔ اور ہرن کو اپنے پیچھے چھپا کر بولا۔ "پرتھوی راج! دیالو راجن!! بیزبان بن باسی پر دیا کیجئے۔ جیو ہنتیا چھتری کا دھرم نہیں۔ مہاراجوں اور جودھاؤں کی تلوار دُکھیا کی ڈھال ہوتی ہے۔ بُوڑھے۔ بچّے۔ عورت اور غریب جانور پر نہیں اُٹھتی۔"

جوگی کے یہ انمول بچن کانوں کے راستے راجہ کے دل میں اُتر گئے۔ اُس نے جوگی کو پرنام کیا۔ اور تیر کمان پر سے پھینک کر آشرم میں داخل ہوا۔ یہ آشرم کنوّ جی کا تھا۔ مگر اس وقت وہ یاترا اور گنگا اشنان کے لئے باہر گئے تھے۔ راجہ آشرم کے باغ میں گیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ تین الّڑ لڑکیاں چنبیلی کے ایک جھنڈ کو سینچ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام انسوّیا دوسری کا پریم بندا اور تیسری کا شکنتلا تھا۔ جو ان دو ستاروں میں چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک

[1] موجودہ دہلی کے قریب میرٹھ کی طرف اس راجدھانی کے آثار اب تک موجود ہیں۔

رہی تھی۔ راجہ پہلی ہی نظر میں اس بن کی دیوی کا پجاری بن گیا۔ شکنتلا نے بھی راجہ کو چور نظر سے دیکھا۔ اس کا چہرہ لال انگارا ہو گیا۔ نظریں نیچی ہو گئیں اور پسینے نے ماتھے پر جھڑی باندھ دی۔ اس کا کبھی یہ حال نہ ہوا تھا۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کہ اس کا کیا سبب ہے۔ ایکا ایکی ایک بھونرا شکنتلا کے گرد پھر پھر کر بلائیں لینے لگا بھلا اس کا کیا قصور کہ شکنتلا کے چہرے اور کنول میں بال بھر بھی فرق نہ تھا۔ وہ سہم گئی اور سکھیوں کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کسی میں اتنی سکت نہ رہی کہ ذرا ہاتھ اُٹھا کر بھونرے کو ہٹا دیتی۔ شکنتلا ڈر کر بھاگی اور وہاں آکر دم لیا۔ جہاں راجہ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اب بھونرا کسی اور پھول پر نچھاور ہونے لگا۔ اور سکھیاں شکنتلا کے پاس آگئیں۔ لڑکیوں کو کیا معلوم کہ یہ شخص ان کا راجہ ہے۔ اُنہوں نے سیدھے سبھاؤ سے اُسے گھاس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر انسویا نے راجہ سے پوچھ ہی لیا۔ کہ وہ کون ہے۔ اور جنگل میں کس لئے آیا ہے۔ راجہ نے کہا۔ "ودیارتھی ہوں۔ یہاں آیا ہوں کہ دھرم کرم کی چند باتوں کا سمبندھ ہو جائے۔ جو شہر کی چہل پہل میں نہیں ہو سکتا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انسویا اور پریم بہندا کو آشرم کے کام دھندے کے لئے

جانا پڑا۔ اور وشونت اور شکنتلا اکیلے رہ گئے۔ اب شکنتلا نے ساری آپ بیتی سُنائی۔ تو راجہ کو معلوم ہوا کہ وہ حیثیت کے لحاظ سے اس کے برابر کی چوٹ ہے۔ راجہ نے بھی اپنا اصلی حال سُنایا۔ اور اپنی انگوٹھی اُتار کر اُس کی انگلی میں پہنا دی۔ جس پر راجہ کا نام کندہ تھا۔ پریم بہندا اور انسویا تو یہ سُنکر بہت خوش ہوئیں کہ راجہ اور شکنتلا بیاہ پر رضامند ہو گئے۔ ابھی یہ جماؤ پورے رنگ پر نہ آیا تھا کہ ایک ایلچی بگٹٹ گھوڑا اُڑاتے آ پہنچا۔ اور پتہ لگا کہ راج کے چند کاموں کے لئے وشونت کو فوراً راجدھانی میں پہنچنا چاہیئے۔ راجہ نے کہا۔ بھگوان جانے ہستناپور سے پھر کب نکلنا ملے۔ اس لئے بہتر ہے کہ بیاہ کی رسمیں ابھی ابھی ادا ہو جائیں۔ لڑکیاں ذرا ہچکچائیں مگر جب ان کی تسلی ہو گئی۔ کہ اس میں کوئی چھل فریب نہیں۔ تو مان گئیں۔ اور گندھرب ریتی کے مطابق بیاہ ہو گیا۔ راجہ نے وعدہ کیا۔ کہ وہ جلد برات لیکر آئے گا۔ اور شکنتلا اپنی شان کے مطابق دُلہن بنکر ہستناپور ہو جائے گی۔ دوسرے دن نور کے تڑکے وشونت روانہ ہو گیا۔

راجہ کے جانے کے بعد شکنتلا ہر وقت اُداس رہتی تھی۔ اور گھنٹوں چنبیلی کے جھنڈ میں اکیلے بیٹھ کر

دل ہی دل میں اپنے راجہ سے باتیں کرنا اُس کا دل بہلاوا تھا۔ اسی طرح ایک دن راجہ سے دھیان لگائے بیٹھی تھی۔ اور اُسے آس پاس کی کچھ خبر نہ تھی۔ کہ دُرباسا نامی ایک چڑچڑا جوگی اُدھر آنکلا۔ شکنتلا نے نہ اُسے دیکھا نہ اس کی آواز سُنی۔ اس لئے اس نے جوگی کی کوئی آؤ بھگت نہ کی۔ جوگی آگے ہی آگ بگولا تھا۔ اس بے پروائی نے تیل کا کام کیا۔ بھڑک اٹھا۔ اور یہ سراپ اُس کے مُنہ سے نکل گیا:۔

"تو سہی جو ایسا جوگ پڑے، کہ جس کے دھیان میں تو سادھو کی آدر کرنا بھُول گئی۔ وہ بھُولے سے بھی تجھے یاد نہ کرے۔"

شکنتلا اپنی اُلجھنوں میں پھنسی ہُوئی تھی۔ اُسنے تو کچھ نہ سُنا۔ مگر انسویا پاس کھڑی تھی۔ یہ جان لیوا سراپ سُنکر کانپ اُٹھی۔ دوڑکر جوگی کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور رو رو کر کہنے لگی:۔

"مہاراج! اس برہا کی ماری پہ دیا کیجیے۔ وہ آپ کی داسی ہے۔ مگر اس وقت اپنے آپے میں نہیں چھوٹوں کی بھُول چوک بڑے معاف کرتے ہیں آپ پنا سماں ہیں۔ پتری کو سراپ کی آگ نہ جلائیے۔"

جوگی کو کچھ رحم آگیا۔ ماتھے کے شکن ہٹے۔ چہرہ کی سُرخی کم ہُوئی۔ تو یہ جواب دیا۔ "پتری! بچن مُنہ سے بان کمان سے نکل کر واپس نہیں آسکتا۔ سراپ اٹل ہے۔ جو کہا ہو کر رہیگا۔ ہاں تیرے کہنے سے اتنا کرتا ہوں کہ جب شکنتلا راجہ کو اس کی انگوٹھی دکھائیگی، تو سراپ ٹل جائیگا۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں۔"

جوگی یہ بس بولکر چلتا ہُوا۔ تو انسویا شکنتلا کے پاس گئی۔ اور تو کچھ نہ کہا۔ صرف یہ تاکید کی کہ انگوٹھی کو سنبھال کر رکھنا۔ اگر راجہ تجھے بھُول گیا تو اسے دیکھ کر اس کی یاد تازہ ہو جائیگی۔

شکنتلا یہ سُنکر مُسکرائی۔ کہ کیسی انہونی باتیں کرتی ہے۔ بھلا آجتک کبھی ہُوا ہے۔ کہ کوئی راجہ اپنی پرجا کو بھُول جاتے۔ اسی عرصہ میں کنوّجی یاترا سے واپس آتے۔ اور انتریامی ہونے کے باعث اُنہیں وشونت اور شکنتلا کے بیاہ کا حال آپ سے آپ معلوم ہوگیا۔ اُنہوں نے شکنتلا کو اپنے پاس بلایا۔ اشیرباد دیا۔ دکھ سکھ پُوچھا اور کہا۔

"میں اس بیاہ کو پسند کرتا ہوں ایشور کرے کوکھ مانگ سے ٹھنڈی رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ دھرم چاہتا ہے کہ جو راجکمار اس وقت تمہارے پیٹ میں ہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر جنم لے۔ اس لئے کل مائی گوتمی اور بھائی سارنگو رہ

تمہیں ہستنا پور پہنچا آئینگے۔ بیٹی! سسرال میں سکھ سے رہنے کا یہی گُر ہے۔ کہ پتی کی عزت کرو۔ اور اُن کا ادب کرو۔ جنہیں وہ عزت کی نظر سے دیکھتا ہو۔ نوکروں پر مہربانی کروگی تو وہ تمہارے پسینہ پر اپنا خون بہائینگے۔ پرائے گھر جارہی ہو۔ اُسے اپنا بنانا چاہتی ہو تو کسی چیز پر تیرا میرا نہ کرنا رانی بننا ہے تو خاوند کی داسی بننا سیکھنا۔"

دن چڑھا تو شکنتلا اور اُس کے ساتھی ہستنا پور روانہ ہوئے۔ راستہ میں رات پڑگئی۔ اس لئے گنگا کے کنارے بسرام کیا۔ صبح کو اُٹھ کر شکنتلا اشنان کرنے جو گئی تو راجہ وشونت کی انگوٹھی اُنگلی سے نکل کر دریا میں گرگئی۔ مگر شکنتلا کو اس کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ جب ہستنا پور پہنچے تو سب سیدھے راجہ وشونت کے محل کو گئے۔ راجہ کو اطلاع پہنچائی۔ کہ رشی کنو جی نے بھیجا ہے۔ راجہ سے ملنا ہے۔ کنو جی کا نام سُنکر راجہ نے انہیں بڑی عزت سے دربار میں بلایا۔ اور پوچھا کس کام کے لئے آپ نے آنے کی تکلیف کی۔ گوماتی نے کہا۔" مہاراج اس لڑکی کو لے کر حاضر ہوئے ہیں جس سے آپ نے کنو جی کے آشرم میں بیاہ کیا تھا"

یہ سُن کر راجہ ہکا بکا رہ گیا۔ اور ذرا سوچ کر بولا:۔

" مائی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا دھوپ میں بال سفید کئے ہیں۔ جو بات بنانی بھی نہ آئی۔ میں نے تو خواب میں بھی اس دیوی کی شکل نہیں دیکھی۔ اور آپ کہتی ہیں میں نے اس سے بیاہ کیا ہے۔ اس سے کسی اور شخص نے بیاہ کیا ہوگا۔ اور آپ بھولے سے میرے سر منڈھ رہی ہیں"

یہ بات نہ تھی اک تیر تھا، جو شکنتلا کے دل پر پڑا۔ اور وہ بالکل نراس ہوگئی۔ گوماتی اور شارنگرو نے بڑے کرارے جواب دِئے۔ مگر راجہ ڈھب پر نہ آیا۔ اب شکنتلا کو انسویا کی نصیحت یاد آئی اور اُس نے عرض کی:۔

" میرے پتی نہیں میرے مہاراج! اگر یہ سب بُھول کا قصور ہے۔ تو دیکھئے یہ آپ کی انگوٹھی ہے۔ جو بیاہ کے دن آپ نے مجھے دی تھی۔"

یہ کہکر شکنتلا نے انگوٹھی اُتار کر پیش کرنا چاہی۔ دیکھا تو انگوٹھی غائب تھی۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ پچھاڑ کھا کر گری، اور زمین پر لوٹتے لوٹتے بے ہوش ہوگئی۔

شکنتلا کی ماں مینکا اندراسن سے یہ سارا کھیل دیکھ رہی تھی۔ اس کی مامتا نے جوش مارا۔ بہت ضبط

کیا۔ مگر جب نہ رہا گیا تو بجلی بن کر گری۔ اور شکنتلا کو لیکر الوپ ہو گئی۔

اس واقعہ کو تین سال گزر گئے۔ اور اس عرصہ میں وشونت کو شکنتلا کا دھیان تک نہ آیا۔ ایک دن ایک مچھیرے نے گنگا سے ایک مچھلی پکڑی۔ اس کا پیٹ چاک کیا، تو اس میں سے ایک قیمتی انگوٹھی نکلی۔ بوڑھا مچھیرا اس کے کوڑے کرنے کے لئے ہستنا پور گیا۔ اور اسے بازار میں دکھانے لگا۔ سُنار نے انگوٹھی دیکھی، تو اس پر راجہ وشونت کا نام کندہ تھا۔ اس نے جھٹ مچھیرے کی گردن میں ہاتھ دیا اور پکڑ کر دربار میں لے گیا۔ راجہ کا انگوٹھی دیکھنا تھا کہ بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ مچھیرے کو سزا کے بدلے اتنے روپیہ دیا کہ اس کا سارا دلدّر اُتر گیا۔

جب دربار برخاست ہوا۔ اور راجہ اکیلا رہ گیا تو شکنتلا کے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اُسے یاد کر کے ہاتھ ملنے لگا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں شکنتلا زمین پر نہ تھی، جو اُسے مل جاتی۔ ناچار صبر کر کے بیٹھ رہا۔ اس حالت میں تین سال گزر گئے۔ تو نیکا کا دل پسیجا اور اُس نے اندر سے کہا:۔

"مہاراج اب اس بجوگ کو سنجوگ سے بدل ڈالئے۔"

اندر نے اپنے رتھ بان مالتی کو اشارہ کیا۔ وہ ہوا کی گاڑی اُڑاتا ہوا وشونت کے پاس آیا۔ اور عرض کی راکھشوں کے ایک غول نے رشی استھان کے پاس ہڑبونگ مچا رکھی ہے۔ اور اندر مہاراج چاہتے ہیں کہ آپ انہیں مار پیٹ کر نکال باہر کریں تاکہ رشیوں کی تپسیا میں خلل نہ آئے۔ راجہ تیار ہو گیا اور مالتی اُسے ہوا کی گاڑی میں بٹھا کر راکھشوں کے ساتھ لڑنے کے لئے لے گیا۔ جب مہم سر کر کے اور اندر سے مل کر لوٹے تو مالتی نے وشونت کو رشی مرچھ کی کٹیا کے پاس اُتار دیا۔ جہاں نیکا نے شکنتلا اور اُس کے بیٹے کو رکھا تھا۔

پھرتے پھرتے راجہ ایک جگہ پہنچا۔ جہاں ایک چھ برس کا لڑکا ایک شیر کے بچّہ کا مُنہ کھول کر اُس کے دانت گننے کے پیچھے پڑا تھا۔ دایہ پاس کھڑی منع کر رہی تھی۔ مگر وہ باز نہ آتا تھا۔ راجہ کے دل میں محبت کی لہر دوڑ گئی۔ بچّہ کو سمجھایا تو اُس نے شیر کو چھوڑ دیا۔ دایہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ راجہ وشونت کا بیٹا ہے۔ یہ سُنکر راجہ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور بچّہ کو گود میں لیکر شکنتلا کی تلاش میں کُٹیا

کی طرف چلا۔ ادھر سے شکنتلا آ رہی تھی۔ بچہ راجہ کی گود سے اتر ماں کے پاس گیا۔ اور اُسے کہنے لگا۔ "ماتا یہ اجنبی کہتا ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔" شکنتلا نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سچ مچ راجہ دشونت سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ دیکھیں راجہ اب بھی اُسے پہچانتا ہے کہ نہیں، کہ راجہ بڑھ کر اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ شکنتلا نے ایک آنکھ سے روتے اور دوسری سے ہنستے ہوئے کہا "مہاراج اُٹھئے۔ داسی کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ہاں یہ تو کہئے۔ یہ انگوٹھی آپ کو کیسے ملی۔"

راجہ نے انگوٹھی کی ساری رام کہانی سُنائی۔ اور کہا کہ اُس کی محبت کی یہ نشانی پھر اپنی اُنگلی میں پہن لے شکنتلا بولی۔ "اسے اپنے ہی پاس رہنے دیں۔ ایک بار یہ مجھے جل دے چکی ہے۔ میں اب اس پر بھروسہ نہیں کرنے کی۔ کون جانتا ہے کہ یہ پھر کہیں کھو جائے اور آپ مجھے بھول جائیں۔"

راجہ دشونت شکنتلا اور راجکمار کو ساتھ لے کر ہستناپور پہنچا۔ راجکمار کا نام بھارت رکھا جو اپنے باپ کے بعد سنگھاسن پر بیٹھا۔ اور سارے ہندوستان کو فتح کر کے اس کا نام بھارت ورش قرار دیا۔

محمد عمر نور الٰہی

غزل

چڑھے گا کوئی نظر پہ اُس کی گرے گا کوئی نظر سے اُس کی
شباب جب تک ہے اُس کا قائم یہی عروج و زوال ہو گا

ابھی تو جوڑا کھلا ہے شب کا، ابھی سے فکرِ مآل کیا ہے
کہ جی بچیں گے تو دیکھ لینگے سحر کو جو کچھ بھی حال ہو گا

جو کام کرنا ہے تجھ کو کر لے کہ فرض تیرا ہے کام کرنا
مآل کی فکر کرنے والے! خرابِ فکرِ مآل ہو گا

مٹا بھی دے تُو دل سے راز اپنے ملال ہستی خیال رفعت
تجھے ہے جب تک جہاں میں رہنا عروج ہو گا زوال ہو گا

راز چاندپوری

نقشِ غیر فانی

وہ ہر سو مرگِ الفت کی تلاشوں میں نڈر جانا
وہ ہر سو ایک نقشِ غیر فانی ثبت کر جانا

یہ مانا۔ ہم نے تم کو ایک حد تک خاصکر جانا
مگر کیا جس قدر ارمانِ دل تھا اُس قدر جانا

نہ اس کو مقتدر مانا۔ نہ اُس کو مفتخر جانا
تمہیں کو عمر بھر مانا۔ تمہیں کو عمر بھر جانا

نہ پُوچھو، ہم نے کیا جانا، وہی جانا جو لازم تھا
کہ تم کو بندا جانا تو عالم کو خبر جانا

تمہارا ماننا طاقت سے باہر تھا۔ مگر مانا
تمہارا جاننا امکاں سے خارج تھا۔ مگر جانا

وہ تیری آرزو میں زیست کا ہر عیش تج دینا
وہ تیری جستجو میں لامکاں سے بھی اُدھر جانا

مِری قسمت کہ میں نے تم سے راہ و رسم پیدا کی
مری شامت کہ میں نے تم کو منظورِ نظر جانا

اگر جانا ہی تھا جاتے، مگر اتنا بتا جاتے
یہ آنا ہے تو کیا آنا۔ اِدھر آنا۔ اُدھر جانا

وہ ناکامی کی افراطیں۔ وہ مایوسی کی بہتاتیں
وہ امیدوں کا مٹ جانا۔ وہ ارمانوں کا مر جانا

وہ اِک حیرت فزا ساعت۔ وہ اِک بالکل نئی حالت
وہ اِک جلوہ نظر آنا۔ وہ اِک عالم گزر جانا

جو ممکن ہو بذاتِ خود ہمارا فیصلہ کرنا
نہ اس کی بات پر جانا نہ اُس کی بات پر جانا

نہ اس کا ادعا مانا۔ نہ اس کا ادعا مانا
اسے بھی بیخبر جانا۔ اُسے بھی بیخبر جانا

حیات و موت کیا ہے۔ صرف نامِ آمد و رخصت
اگر آنا نڈر آنا۔ اگر جانا نڈر جانا

جو شوق زیست ہے۔ یوں جی کہ خوفِ مرگ مٹ جائے
یہ جینا کون جینا ہے کہ جینا اور مر جانا

انوکھی بات ہے جب ترک مے کا قصد کرتا ہوں
یہی آواز آتی ہے ٹھہر جاتا۔ ٹھہر جانا

نہ دُنیا سے غرض رکھی۔ نہ عقبےٰ سے غرض رکھی
اسے بھی دردِ سر جانا۔ اُسے بھی دردِ سر جانا

ہمیشہ غم نصیب آزاد نے تیری خوشی چاہی
ہمیشہ راحتِ دُنیا کو ممنوعہ شجر جانا

آزاد

ناخواندہ مہمان

ایک نیا بیاہا جوڑا ایک دیہاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ میاں کا بازو بیوی کی کمر سے لپٹا ہوا تھا، اور بیوی میاں کے کاندھے پر سر جھکائے، اُس کے پہلو میں خوش خوش ٹہل رہی تھی۔

چاند کے زرد پیلے چہرے پر بدلیوں کی نقاب یوں معلوم ہوتی تھی۔ کہ گویا اُس نے ان لوگوں کو خوش خوش ٹہلتے دیکھ کر رشک و حسد سے ماتھے پر بل ڈال لئے ہیں۔ اور اپنی بے یار و غمگسار زندگی کے غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ ساکن ہوا خود رو پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ اور ریل کی لائن کے اس پار رات کی تاریک فضا میں کسی شب بیدار پرندے کی سُریلی آواز گونج رہی تھی۔

نوجوان بیوی نے اپنے خاوند کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔ "پیارے ساشا، یہ کیسا سُہانا سماں ہے! مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اچھا سا خواب دیکھ رہی ہوں۔ ذرا دیکھنا وہ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کا جنگل کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ تار کے یہ چپ چاپ اور بےحس و حرکت کھمبے کیسے اچھے لگتے ہیں! وہ اس منظر کی صوری خوبی میں ایک خاص معنی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس وسیع فضا میں تہذیب و تمدّن کے نشان بردار بن کر کھڑے ہیں .... اور پھر جب ہوا کسی گزرنے والی ریل گاڑی کی آواز ہم تک پہنچاتی ہے، تو وہ آواز ہمارے کانوں کو کیسی اچھی لگتی ہے۔"

"بیشک ویریا! ...... مگر تمہارے ہاتھ کتنے گرم ہیں .... شاید اس وجہ سے کہ اس منظر کی خوبی نے تمہاری طبیعت میں تعریف و توصیف کا ایک جوش پیدا کر دیا ہے .... رات کے کھانے کے لئے کیا پکایا ہے تم نے؟"

"کچھ مرغیاں ہیں، کچھ ساگ بھاجی وغیرہ .... ایک مُرغی تو اتنی بڑی ہے کہ تین چار آدمی پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔ .... ہاں، وہ جو مچھلیاں شہر سے آئی تھیں، وہ بھی پکائی ہیں۔"

چاند نے بادلوں کی آڑ میں مُنہ چھپا لیا۔ گویا انسانی مسرت کا یہ نظارہ اس سے دیکھا نہ گیا۔ ان لوگوں کی خوشی نے اُسے خود اپنی ملول تنہائی اور اپنے

کوہ و صحرا سے دُور افتادہ ویران خلنے کی یاد دلادی۔
ویریا نے دُور سے گاڑی کی آواز سُنکر کہا۔
"لو گاڑی آگئی۔"
فاصلے کی تاریکی میں تین انگارے سی آنکھیں نظر آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے سے نکلکر پلیٹ فارم پر آگیا۔ لائن پر جا بجا اطّلاعی روشنیاں جگمگانے لگیں۔
ساشا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "آؤ گاڑی دیکھ لیں۔ اور پھر گھر چلیں۔ ویریا، یہ وقت کیسی اچھی طرح گزر رہا ہے! مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ کوئی خواب ہے یا کیا ہے۔"
ریل گاڑی ایک سیاہ فام کوہ پیکر اژدھے کی طرح پھنکارتی اور پلیٹ فارم کے کنارے رینگتی ہوئی آئی اور کھڑی ہوگئی۔ کھڑکیوں میں سے ایک مدھم سی روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اور اُن میں مسافروں کے نیندا سے چہرے، خواب آلودہ آنکھیں جلدی جلدی سامان کو سنبھالتے ہوئے ہاتھ، اور بعض بیفکری سے بیٹھے ہوئے مسافروں کے بیحرکت شانے نظر آرہے تھے۔
ایک کمرے سے یکایک آواز آئی۔ "دیکھو، دیکھو، ویریا اور ساشا ہمیں لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ وہ دیکھو وہ ...... ویریا! ...... ویریا!"
دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اُچھلتی کودتی ریل گاڑی سے اُتریں۔ اور آتے ہی ویریا سے لپٹ گئیں۔ اُن کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ایک صاحب دُبلے پتلے اور لمبے قد کے آئے۔ پھر دو لڑکے اپنی آیا کے ساتھ نمودار ہوئے۔ اور سب کے بعد ان کی دادی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پہنچیں۔
اُن دُبلے پتلے صاحب نے بڑھکر ساشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بڑی گرمجوشی سے کہا۔ "آخر ہم آہی پہنچے۔ تم ہماری راہ تکتے تکتے تھک گئے ہوگے تم نے بھی بار بار کی شکایتوں سے میرا ناک میں دم کر دیا تھا! ...... کولیا، کوستلیا، ننینا، فیفا ...... ادھر آؤ، اپنے بھائی جان کو سلام کرو ...... ہم اپنے سارے لاؤ لشکر سمیت یہاں آدھمکے ہیں۔ دو تین دن تک یہاں رہینگے ...... تمہیں تکلیف تو نہ ہوگی؟"
ساشا اور ویریا اپنے چچا اور اُس کے سارے خاندان کے اس ناگہانی دھاوے کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ یوں تو اُنہوں نے خیر مقدم میں کسی قسم کی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن کوئی اُن کے دل سے پوچھتا۔ اُنہوں نے

بڑی گرمجوشی اور محبت سے اپنے چچا چچی کو خوش آمدید کہا۔ لیکن بیچاروں کی جھونپڑی کا جو حال ہونے والا تھا، وہ اُن کی آنکھوں میں پھر رہا تھا ......

اُن کے تینوں کمرے اُن کے اوڑھنے بچھونے سمیت ان ناخواندہ مہمانوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ رات کے لئے جو کچھ ان کے پاس لے دے کر حاضر تھا، وہ ایک آن کی آن میں ہڑپ ہو جاتا ہے۔ شریر بچے، اُن کے گاڑھے پسینے سے سینچے ہوئے باغیچے میں تباہی پھیلا رہے ہیں۔ پھولوں کو نوچ نوچ کر پھینک رہے ہیں۔ ہری ہری دوب کو روندے ڈالتے ہیں۔ مطالعہ کے کمرے میں جا کر اودھم مچا رہے ہیں۔ کبھی کاغذ پھاڑتے ہیں، کبھی سیاہی گراتے ہیں۔ بچے کیا ہیں آفت کے ٹکڑے ہیں۔ گھر بھر میں ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر رکھا ہے۔ اُن کی چچی بار بار اُنہیں اپنی بیماری کی رام کہانی سُناتی ہے۔ اور اپنی عالی نسبی کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور انہیں طوعاً و کرہاً متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

اور ساشا نے ایک طعن آمیز نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر چپکے سے کہا:۔

"یہ سب تمہارے دم قدم کی برکت ہے۔ یہ تمہیں سے ملنے آئے ہیں۔"

ویریا غُصّے سے لال پیلی ہو کر بولی:۔

"مجھ سے خواہ مخواہ ملنے آئے ہیں۔ یہ تمہارے ہی سگے ہیں۔"

اور پھر اپنے مہمانوں کی طرف رجوع ہو کر اُس نے ایک بناوٹی مُسکراہٹ سے کہا۔

"آئیے آئیے۔ آپ کا آنا مبارک۔"

چاند پھر آسمان پر نمودار ہُوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کے وہ مُسکرا رہا ہے۔ اور خوش ہے کہ اُس کے کوئی رشتہ دار نہیں۔ ساشا نے اپنے مایوس اور رنجیدہ چہرے کو چھپانے کے لئے اپنے مہمانوں کی طرف سے مُنہ پھیر کر اور اپنی آواز میں دلی استقبال کی سی گرمجوشی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "آئیے۔ آئیے آپ کا آنا مبارک۔"

(اینطون تیہاف)

محمد عظیم الدین

۷۸۶

میری داستان حیات

پہلا باب

پیدائش اور خاندان کا حال، مہلک بیماری، بصیرت، گویائی اور سماعت کا ضائع ہونا

ہیلن کیلر جس کی خود نوشتہ سوانحعمری کے پہلے دو باب ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، دورِ حاضرہ کے خارقِ عادت کرشموں میں سے ہے۔ بصیرت، گویائی اور سماعت جیسے ضروری حواس سے قطعاً بے بہرہ ہونے کے باوجود اس نے ذہنی نشو و نما کے جو مدارج طے کر لیے ہیں، اُن کی شاہد یہ کتاب ہے جس کی نسبت یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُس نے نفسیات کی ایک ایسی کمی پوری کی ہے۔ جو شاید تمام دنیا کے نفسیات دانوں کی مجموعی کوششیں صدیوں تک نہ پوری کر سکتیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے اسے اسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہو۔

ہادی

مَیں اپنی سوانح عمری لکھتے وقت خائف سی ہو رہی ہوں۔ اور مجھے اس نقاب کو، جو ایک سُنہری غبار کی طرح میرے بچپن کے زمانے پر چھایا ہُوا ہے، اُٹھا دینے میں ایک جھجک سی دامنگیر ہوتی ہے۔ دراصل وقائع نگاری میں بہت سی دِقتوں کا سامنا ہے۔ اور جب مَیں اپنے نہایت ابتدائی تصوّرات کو مرتب کرنا چاہتی ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اور تخیّل، دونوں کی آنکھیں ان تمام سالوں کے آر پار دیکھ رہی ہیں۔ جو میرے ماضی کو زمانۂ حال کے ساتھ وابستہ کیے ہُوئے ہیں مَیں ایک عورت کے نقطۂ خیال سے اپنے بچپن کے تجربوں اور مشاہدوں کو قلمبند کرتی ہوں۔ میری زندگی کے چند ابتدائی تصورات تو مجھے بخوبی یاد ہیں۔ لیکن اپنی جسمانی معذوریوں کے باعث، باقی تمام خیالات پر فراموشی کا گھٹاٹوپ چھایا ہُوا ہے۔ اس کے علاوہ بچپن کی بہت سی رنج و راحت کی کیفیتیں اپنی حدّت اور نُدرت کھو چکی ہیں۔ میری ابتدائی تعلیم کے متعلق کئی نہایت ضروری واقعات بعض اہم معلومات کے جوشِ مسرّت کے باعث میری یاد سے محو ہو چکے ہیں پس اس خیال سے، کہ کہیں یہ سرگزشت بہت طویل اور روکھی پھیکی نہ ہو جاتے۔ مَیں یہ کوشش کرونگی، کہ فقط انہیں واقعات کو جو مجھے نہایت اہم اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مختصر سوانحعمری کے سلسلے میں ناظرینِ کرام کے روبرو پیش کر دوں۔

مَیں ۲۷۔ جون ۱۸۸۰ء کو ریاست شمالی ایلاباما (ریاستہائے متحدہ امریکہ) کے شہر ٹسکمبیا میں پیدا ہُوئی۔ میرے والد بزرگوار کا سلسلۂ نسب کیسپر کیلر سے ملتا ہے۔ جو ملک سوئٹزرلینڈ کے باشندے اور امریکہ کی ریاست میری لینڈ میں آکر آباد ہُوتے تھے۔ اگرچہ یہ

قول صحیح ہے کہ دُنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہُوا جس کے بزرگوں میں ایک نہ ایک شخص غلام نہ ہُوا۔ اور نہ کوئی غلام ہی ایسا ہے جس کے آباو اجداد میں سے کوئی شخص بادشاہ نہ گزرا ہو۔ لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے۔ کہ میرے سوئٹزرلینڈ کے آباو اجداد میں سے ایک بزرگ اس مُلک کے شہر زیورچ میں بہروں کے سب سے پہلے معلّم تھے۔ اور بہروں کی تعلیم کے موضوع پر اُنہوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ میرے اسی بزرگ مسمی کیسپر کیلر کا بیٹا ریاست الاباما کی وسیع سرزمین میں داخل ہو کر وہیں آباد ہوگیا۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ یہ بزرگ سال بھر میں ایک مرتبہ اپنی نو آبادی کی ضروریات فراہم کرنے کی غرض سے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹسکمبیا سے شہر فلاڈلفیا میں آیا کرتے تھے۔ اور میری خالہ کے پاس ابتک ان کے بہت سے خطوط موجود ہیں۔ جن میں ان کے تمام دوروں کا دلچسپ حال صاف صاف مذکور ہے۔

میری دادی جرنیل لافیئیٹ[۵۱] کے مصاحبوں میں سے ایک بزرگ الگزینڈر مور کی بیٹی اور الگزینڈر سپوٹسوڈ کی پوتی تھیں۔ جو ریاست ورجینیا کی نو آبادی کا پہلا حاکم تھا۔ وہ جرنیل رابرٹ ایڈورڈ لی کی رشتے کی بہن بھی تھیں۔

میرے والد بزرگوار مسمی آرتھر ایچ کیلر صاحب امریکہ کی متحدہ افواج کے کپتان تھے۔ اور میری والدہ صاحبہ کا نام کیسٹ ایڈمز تھا۔ اباجان کے دادا بنجمن ایڈمز نے ایک خاتون مسمات سُوسانا گڈ ہیو سے شادی کی تھی اور وہ ریاست میساچوسٹس کے شہر نیوبری میں مُدّت تک مقیم رہیں۔ ان کا بیٹا چارلس ایڈمز شہر نیوبری پورٹ میں پیدا ہُوا۔ اور بعدازاں اس نے ہیلینا کو نقل مکانی کیا یہ جگہ ریاست آرکنساز میں واقع ہے۔ جب ہمارے ملک میں خانہ جنگی شروع ہُوئی تو اس میں چارلس ایڈمز نے جنوبی ریاستوں کی طرف سے جنگ کی۔ اور برگیڈیر جرنیل کا عہدہ حاصل کیا۔ اس نے مسمات لوسی ہیلن ایوریٹ سے شادی کی۔ یہ خاتون اسی ایوریٹ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس سے ایڈورڈ ایوریٹ اور ڈاکٹر ایڈورڈ ایوریٹ ہیل جیسے بزرگ پیدا ہوئے ان کا ذکر اسی کتاب میں آگے چلکر آئیگا۔ اس جنگ کے خاتمہ پر اس خاندان نے ریاست ٹینی سی میں اپنی سکونت اختیار کی۔

اس مرض میں مبتلا ہونے سے پیشتر جس نے مجھے

---

[۵۱] مارکوئس لافیئیٹ (۱۷۵۷ء - ۱۸۳۴ء) مشہور سپاہی اور محب وطن تھا۔ امریکہ کی جنگ خود مختاری میں آبادکاروں کی طرف سے جنگ آزما ہُوا۔ بعدازاں فرانس کو لوٹا اور وہاں نیشنل گارڈ (قومی فوج) کا سپہ سالار بنایا گیا۔ انقلاب فرانس کے دوران میں اس نے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور لوئی فلپ کو تخت پر بٹھانے میں خاص طور پر ممد ہُوا۔ (مترجم)

بینائی اور سماعت سے محروم کر دیا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ اس مکان میں ایک بڑا وسیع مربع کمرہ اور ایک نوکروں کا دالان تھا۔ جنوبی ریاستوں میں عام دستور ہے کہ اصل سکونتی مکان کے پاس ایک چھوٹا گھر اور بنا لیتے ہیں۔ تاکہ ضرورت کے وقت اسے ساتھ شامل کر سکیں۔ میرے والد ماجد نے ایسا ہی ایک مکان خانہ جنگی کے بعد تعمیر کرا لیا تھا۔ اور جب انہوں نے میری اماں جان سے شادی کی۔ تو وہ اس مکان میں رہنے لگے یہ گھر انگور۔ گلاب اور ہنی سکل کی بیل سے خوب ڈھکا رہتا تھا۔ اور باغ کی طرف سے نظر ڈالنے پر وہ ایک کنج تنہائی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ننھی سی ڈیوڑھی پر گلاب اور سمائلکس کے پھولوں کا پردہ اس طرح پڑا رہتا تھا۔ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل رہتی تھی۔ یہ جگہ شہد کی مکھیوں اور گانے والے پرندوں کا اڈا تھی۔

ہمارا اصلی مسکن یعنی کیلر منزل جہاں گھر کے لوگ رہتے تھے۔ ہماری اس ننھی سی گلاب کے پھولوں والی آرامگاہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اور ہم اسے "عشق پیچہ کا سبزہ زار" کہا کرتے تھے۔ کیونکہ مکان اور اس آرامگاہ کے اردگرد کے تمام درخت خوشنما انگریزی عشق پیچہ کی بیل سے ڈھکے ہوتے تھے۔ اس مکان کے اندر ایک پرانی طرز کا باغ تھا۔ اور یہ باغ میرے بچپن کے زمانے کا جنت تھا۔

استانی جی کی تشریف آوری سے پیشتر بھی میرا یہ معمول تھا۔ کہ میں باکس وڈ کے درخت کی بنی ہوئی مربع اور سخت باڑ کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر چلا کرتی تھی۔ اور اپنی قوت شامہ کی رہنمائی سے گل بنفشہ اور گل سوسن کو دریافت کیا کرتی۔ جو موسم کے ابتدا میں کھلتے تھے۔ کبھی گھر میں بدمزاجی دکھانے اور لڑنے جھگڑنے کے بعد میں اپنے غصیلے چہرے کو اسی جگہ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس اور سرد پتوں میں چھپا کر تسکین حاصل کرتی تھی اس گلستان میں راستہ بھول جانا، خوشی خوشی ایک مقام سے دوسری جگہ گھوم کر یکایک کسی خوبصورت بیل تک پہنچنا، پھر اس کے پھولوں اور شگوفوں کے ذریعے ٹٹول کر اسے شناخت کر لینا، اور یہ معلوم کرنا کہ یہ وہی بیل ہے جو باغ کے اس سرے کی ٹوٹی پھوٹی بارہ دری پر چھائی رہتی ہے۔ کتنا پر لطف تھا! مجھے اس جگہ خمدار چنبیلی اور کلیمیٹس کا پھول اور بعض اور نادر، جھینے جھینے، خوشبودار پھول ملتے تھے۔ یہاں بعض پھول تیتری کی شکل سے مشابہ تھے۔ لیکن گلاب کے پھولوں کا تو ذکر ہی کیا ہے! یہ پھول بہت ہی پیارے اور سب سے زیادہ خوشنما تھے۔ میں نے شمالی حصۂ ملک کے گلزاروں میں کہیں بھی ایسے دلخوش کن پھول نہیں پائے

جیسے اپنے جنوبی وطن کے یہ بیلدار گلاب۔ یہ پھول ہماری
ڈیوڑھی سے لمبے لمبے ہاروں کی شکل میں لٹکے رہتے۔ اور
ان کی خوشبو سے تمام ہوا معطر ہو جاتی تھی۔ یہ خوشبو
سطح زمین کی ہر طرح کی غلاظت سے پاک و صاف تھی۔
اور علی الصباح جبکہ شبنم ان پھولوں کا مُنہ دھلاتی تھی۔
وہ مجھے اسقدر نرم اور متبرک معلوم ہوتے تھے کہ میں یہ
خیال کئے بغیر نہ رہ سکتی کہ وہ باغِ جنت کے کنول ہیں!

میری ابتدائی زندگی سادہ، اور بہت کچھ اس ڈھب
کی تھی۔ جیسے کہ ہر ایک بچے کی ہوا کرتی ہے۔ جس طرح
ہر خاندان کا پہلوٹھی کا بچہ پیدا ہو کر اشیاء کو دیکھنا بھالنا
اور اُنہیں اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔ وہی فتحمندی
میں نے بھی حاصل کی۔ حسب معمول میرا نام رکھنے کے
متعلق گھر میں قیل و قال ہوئی۔ اور گھر کا ہر فرد بشر اس بات
پر زور دیتا رہا۔ کہ پہلوٹھی کے بچے کا نام معمولی نہیں ہونا
چاہئے۔ ابا جان نے میرا نام ملفرڈ کیمبل اس بنا پر تجویز
کیا۔ کہ اس نام کی ایک بزرگ خاتون ہمارے خاندان
میں گزری تھیں۔ جن کی وقعت ان کے دل میں بیحد تھی۔
اور اس تجویز کے بعد اُنہوں نے اس بحث میں مزید حصہ
لینے سے انکار کر دیا۔

اماں جان نے اس عقدے کو یہ کہہ کر حل کیا۔
کہ "میری یہ خواہش ہے کہ اس بچی کا نام میری والدہ کے
نام پر رکھا جائے۔" نانی اماں کا اصلی نام ہیلن ایورٹ
تھا۔ لیکن مجھے گرجا گھر لے جانے کی خوشی میں ابا جان
فطرتاً اپنے تجویز کردہ نام کو راستے ہی میں بھول گئے۔
جب پادری نے بپتسمہ دیتے وقت پُوچھا کہ کیا نام رکھا
جائے۔ تو اُنہیں یاد آیا کہ گھر میں یہی طے ہُوا تھا۔ کہ
مجھے نانی اماں ہی کے نام سے پُکارا جائے گا۔ پس
اُنہوں نے ہیلن ایڈمز کا نام پیش کر دیا۔

مجھے بتایا جا چکا ہے کہ میں ابھی بچی ہی تھی۔ جبکہ
میں ضد اور تند مزاجی کی علامات ظاہر کرنے لگی۔ میں
جو کچھ دوسروں کو کرتا دیکھتی، اس کی نقل ضرور ہی کرنا
چاہتی تھی۔ میری عمر ابھی چھ ماہ کی تھی کہ میں "مزاج اچھا
ہے" اور اور باتیں ہکلانے لگی۔ اور ایک دفعہ تو جبکہ میں
نے تین دفعہ "چاے چاے چاے" صاف کہہ کر
گھر والوں کی توجہ اپنی طرف مائل کی۔ تو وہ سب کے
سب دنگ رہ گئے۔ بیماری کے بعد بھی مجھے ان ایام
کے سیکھے ہُوئے الفاظ میں سے ایک لفظ یعنی "پانی"
میری یاد سے محو نہیں ہُوا تھا۔ اور اس وقت جبکہ میری
تمام قوتِ گویائی مفقود ہو چکی تھی۔ میں اس لفظ (پانی)
کو بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ جدوجہد کرتی رہی۔ بلکہ میں نے
"واہ۔ واہ" کی آواز مُنہ سے اس وقت نکالنی بند کی تھی۔
جبکہ مجھے دستی حروفِ تہجی کے طریق پر اس لفظ کو ہجا

کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔

گھر والے کہتے ہیں کہ میں سال بھر کی عمر میں چلنے لگی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ امّاں جان مجھے نہانے کے ٹب میں سے باہر نکال کر اپنی گود میں لے رہی تھیں۔ کہ باہر کے فرش پر پتّوں کے سائے میں کچھ حرکت سی ہوئی۔ میں جھٹ اُدھر راغب ہوئی۔ اور سہمک کر لپکی۔ جب وہ ہیجان جاتا رہا۔ تو میں زمین پر گری اور رونے لگی۔ امّی جان نے جھٹ مجھے گود میں اُٹھا لیا۔

آہ! یہ خوشی کے دن جلد ہی گزر گئے۔ ایک مختصر سا موسم بہار، جس میں مینا اور سُرخ پرندوں نے اپنی راگنیاں گائیں۔ پھلوں اور گلاب کے پھولوں سے لدا ہوا موسم گرما اور درختوں کو سنہری اور قرمزی رنگت دینے والا موسم خزاں، ان سب نے اپنے اپنے تحفے ایک مشتاق اور مسرّت سے لبریز بچّی کی نذر کئے۔ اور ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد فروری کے مہیب اور ہولناک مہینے میں مجھے اُس ظالم مرض نے آن گھیرا۔ جس کے ہاتھوں میری آنکھیں اور کان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ اور جس نے مجھے سر سے ایک نوزائیدہ بچے کی سی مدہوشی میں ڈبو دیا۔ ڈاکٹر نے اس مرض کی تشخیص معدہ اور دماغ کے انجماد مواد کی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اب میرا زندہ رہنا محال ہے۔

لیکن ایک دن علی الصباح میرا بخار جس طرح اچانک اور بیخبری کے ساتھ چڑھا تھا۔ اسی طرح چپ چاپ، آناً فاناً اُتر گیا۔ اس دن گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ لیکن کسی کو معلوم نہ تھا۔ حتّےٰ کہ ڈاکٹر بھی اس سے بیخبر تھا کہ اب میں نہ تو کچھ دیکھ سکونگی، اور نہ سُن سکوں گی۔

تصوّر کرنے پر اپنی بیماری کی کچھ دھندلی سی یاد اب بھی میرے دل میں موجود ہے۔ خصوصاً امّی جان کا وہ ملائمت آمیز پیار مجھے اب تک نہیں بھولا۔ جبکہ میں بے چینی کی حالت میں کروٹیں لےلیکر جاگ اُٹھتی یا کسی قدر غنودگی کے بعد سخت درد اور سراسیمگی کے ساتھ چونک پڑتی۔ اور بخار سے جھلسی ہوئی خشک آنکھوں کو اس پیاری روشنی سے، جو مجھے دن بدن مدھم اور دھندلی دکھائی دینے لگی تھی۔ پرے ہٹا ہٹا کر دیوار پر جما دیا کرتی تھی۔ اس وقت امّی جان مجھے تھپک کر پیار کرتی تھیں۔ لیکن ان تیز رفتار، بے ثبات یادداشتوں کے علاوہ باقی تمام واقعات ایک بھیانک خواب کی طرح بہت ہی بے اصل اور بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں۔ میں بتدریج اس خاموشی اور تاریکی کی عادی ہو گئی۔ جو ہر وقت میرے اردگرد چھائی رہتی تھی۔ اور جبتک میری محترم اُستانی صاحبہ تشریف نہیں لائیں۔ اور انہوں نے

میری روح کو اس تاریکی کی قید سے آزاد نہیں کیا اسوقت تک مجھے یاد بھی نہ تھا کہ میری گزشتہ حالت کبھی موجودہ حالت سے مختلف بھی واقع ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنی زندگی کے پہلے اُنیس ماہ کے عرصہ میں وسیع سبزہ زار، روشن آسمان، خوشنما درخت اور پھول سب دیکھ چکی تھی جن کا تصوّر بعد کی تاریکی اب تک بھی نہیں مٹا سکی۔ سچ ہے بقول کسے "اگر ہم نے روزِ روشن کو ایک مرتبہ بھی دیکھ پایا ہے۔ تو وہ دن، اور جو کچھ اس دن نے ہمیں دکھایا ہے۔ ہمارا ہی تو ہے۔" کیونکہ اس کا نقش ہمارے قلب میں موجود ہے۔

دُوسرا باب

پانچ سال کی عمر تک بچپن کا زمانہ۔ ابتدائی تصوّرات تعلیمِ فطرت کا آغاز

مجھے مطلق یاد نہیں، کہ میری بیماری کے بعد کے ابتدائی مہینوں میں کیا کیا واقعات پیش آئے۔ مجھے صرف اسقدر یاد ہے کہ جب امّاں جان گھر کے کام کاج میں اِدھر اُدھر مصروف پھرا کرتی تھیں۔ تو وہ مجھے اپنی گود میں لئے رکھتی تھیں۔ یا میں خود ان کے کپڑوں سے چمٹی رہا کرتی تھی۔ میں ہر شے اور حرکت کو ہاتھوں سے چھُو کر محسوس کرتی تھی۔ اور اس طرح مجھے بہت سی اشیاء کا علم ہو گیا تھا۔ جلد ہی مجھے گھر والوں کے ساتھ ربط اور راہ و رسم کی ضرورت پیش آنے لگی۔ اور میں اس غرض سے بعض نامکمل اشارے کرنے لگی۔ مثلاً نفی اور اثبات کا اظہار، سر کو دائیں بائیں اور نیچے اُوپر حرکت دینے سے کرتی تھی۔ کسی کو اپنی طرف کھینچنے سے مجھے اس شخص کو بُلانا مطلوب ہوتا تھا۔ اور اسے پرے دھکیل دینے سے میری مراد ہوتی تھی۔ کہ "جاؤ" اگر مجھے روٹی درکار ہوتی تو میں روٹی کے ٹکڑے کاٹنے اور ان پر مکھن لگانے کی نقل کر کے بتا دیتی۔ اگر میں چاہتی کہ امّاں جان شام کے کھانے کے لئے ملائی کی برف تیار کریں۔ تو میں پہلے ہاتھ سے مشین کو ہلانے کا اشارہ کرتی۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتی۔ اس سے میری مراد "ٹھنڈک پہنچانے کا تصوّر دلانا" ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ امّاں جان بھی آہستہ آہستہ مجھے بہت کچھ سمجھا دینے میں کامیاب ہونے لگیں۔ جب وہ چاہتیں کہ میں انہیں کوئی چیز لا کر دُوں۔ تو مجھے اُن کا خیال ہمیشہ معلوم ہو جاتا۔ پھر میں اس چیز کو لانے کے لئے بالاخانے پر یا جہاں کہیں وہ اشارہ کرتیں، دوڑ کر چلی جاتی تھی۔ اس تمام تاریکی میں مجھے جس کسی چمکدار اور اچھی شے سے واقفیت حاصل ہوئی وہ درحقیقت اماں جان ہی کی شفقت اور دانائی کے طفیل تھا

میرے اردگرد جو کچھ گھر میں ہوتا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ واقف ہوگئی تھی۔ پہلے پہل میں نے دھلے ہوئے کپڑوں کو، جبکہ وہ دھوبی کے ہاں سے آتے تھے۔ تہ لگا کر بحفاظت رکھنا سیکھا۔ میں اپنے کپڑوں کو دوسروں کے کپڑوں سے تمیز کر لیتی تھی۔ اماں جان اور خالہ اماں کے طرز لباس سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ اب وہ سیر کے لئے باہر جانے والے ہیں۔ اس لئے میں ہمیشہ ان کے ساتھ جانے کی خواہشمند رہتی تھی۔ جب کبھی گھر میں کوئی مجلس گرم ہوتی تو میں ضرور بلوائی جاتی۔ اور جب مہمان رخصت ہوتے تو میں ہمیشہ اپنا ہاتھ ان کو الوداع کہنے کے طور پر ہلاتی تھی۔ اب جو میں سوچتی ہوں تو مجھے اس اشارے کا مطلب کچھ کچھ یاد آجاتا ہے۔ ایک دن جبکہ ایک شریف آدمی اماں جان کے پاس آیا تو سامنے کے دروازے کا بند ہونا، اور اور آوازوں کو جو اس شخص کی آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ میں نے بخوبی محسوس کیا۔ چنانچہ مجھے فی الفور خیال آیا۔ کہ اس وقت مجلسی لباس پہننا چاہیے۔ پس پیشتر اس کے کہ مجھے کوئی روکتا میں جھٹ بالاخانے پر بھاگ گئی۔ اور جس طرح میں نے دوسروں کو کرتے محسوس کیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں بہت سا تیل اور چہرے پر پوڈر لگایا۔ اس کے بعد میں نے اپنے سر پر نقاب ڈال کر اسے پن کے ساتھ ایسے طریق سے لگایا کہ میرا چہرہ پنہاں نہ ہو۔ اور نقاب کا دامن میرے کندھوں تک تہ بہ تہ لٹکنے لگا۔ پھر میں نے ایک بڑی گدی کمر کے پیچھے رکھ کر اسے پیٹی سے کس دیا۔ لیکن وہ اتنی ڈھیلی تھی کہ لٹک کر میرے گون کے کنارے کو چھونے لگی۔ بہرحال میں اس طرح آراستہ ہو کر نیچے اتر آئی۔ تاکہ مہمان کی خاطر و مدارات میں مدد دوں۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ کب یہ معلوم کیا کہ میں دوسرے لوگوں سے مختلف ہوں۔ تاہم استانی صاحبہ کے تشریف لانے سے پیشتر میں یہ دریافت کر چکی تھی۔ کہ جب اماں جان اور دوسرے لوگ کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو وہ میری طرح اشارے نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے منہ کو حرکت دیتے۔ یعنی کلام کرتے ہیں۔ بعض اوقات میں دو گفتگو کرنے والے اشخاص کے درمیان کھڑی ہو کر ان کے لبوں کو چھوا کرتی تھی۔ اور چونکہ میں اس تمام بات چیت کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے گھبرا کر میں بھی اپنے لبوں کو حرکت دیتی، اور وحشیانہ طریق سے اشارے کرتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ بھی نتیجہ نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر اس سے بعض اوقات تو مجھے اتنا غصہ آتا تھا۔ کہ میں اپنی ایڑیاں رگڑتی، چیختی اور چلاتی لیکن آخرالامر ہار کر رہ جاتی۔

میں اپنی شرارتوں سے بھی بخوبی واقف تھی۔ کیونکہ جب میں اپنی انّا کو پاؤں سے ٹھکراتی تو اسکے چیں بجبیں ہونے سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ اسے تکلیف پہنچی ہے۔ اور جب میری خفگی دُور ہو جاتی تو مجھے اپنے کئے پر تاسف ہوتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا کوئی موقع یاد نہیں۔ جس میں میری پشیمانی نے کسی مطلوبہ شے کے نہ ملنے پر مجھے اپنی شرارت سے باز رکھا ہو۔

انہی دنوں ہماری باورچن کی ایک چھوٹی سی سیاہ فام حبشی لڑکی مارتھا واشنگٹن اور ایک بوڑھی کتیا "بیلی" جو اپنے زمانے میں بہت زیادہ شکار کرنے والی تھی ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرتی تھی۔ مارتھا میرے اشارے سمجھ لیتی تھی اور مجھے اس سے اپنی خواہش کے مطابق کام لینے میں۔ کبھی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ مجھے اس پر حکومت کرنے میں لطف آتا تھا۔ اور وہ بالعموم میرے ساتھ دست بدست جنگ کے خطرے میں پڑنے کی بجائے میرے مظالم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھی۔ میں مضبوط، چست چالاک اور اپنے ہر ایک فعل کے نتائج سے بے پروا تھی میں اپنے خیالات سے بخوبی واقف تھی۔ اور ہمیشہ اپنی ہی بات منوایا کرتی خواہ مجھے اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا اور دھینگا مشتی ہی کرنا پڑے۔ میں اور مارتھا بہت سا وقت باورچی خانے میں آٹا گوندھنے۔ ملائی کی برف جمانے

کافی پیسنے، کیک کے پیالے پر لڑنے جھگڑنے اور مرغیوں اور چکوروں کو جو وہاں بکثرت جمع ہوتے تھے۔ خوراک بہم پہنچانے میں صرف کیا کرتی تھیں۔ ان گھریلو پرندوں میں بہت سے تو مجھ سے ایسے مانوس ہو گئے تھے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز میرے ہاتھ پر سے اُچک کر لے جاتے اور مجھے اپنا متجسس ہاتھ اپنے جسم پر پھیر لینے دیتے تھے۔ ایک دن ان میں سے بڑا پیٹو چکور، میرے ہاتھ سے ایک ٹماٹر (انگریزی بینگن) چھین کر لے بھاگا۔ پیٹو میاں کی اس کامیابی نے مجھے بھی ابھارا اور ہم نے اپنی باورچن کا ایک تازہ تیار کردہ کیک ہتیا لیا۔ اور لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ کر سب کا سب خوب مزے سے کھایا۔ جس سے مجھے بدہضمی ہو گئی۔ ممکن ہے کہ چکور کو بھی یہی سزا ملی ہو۔

گنی مرغی کی عادت ہے کہ وہ اپنے گھونسلے کو ہمیشہ ایسے مقامات میں اوجھل رکھنا چاہتی ہے۔ جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ میری سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی تھی کہ میں لمبی لمبی گھاس میں سے اس کے انڈوں کو تلاش کروں۔ چنانچہ جب میں انڈوں کے شکار کے لئے جانا چاہتی تو میں اس کا اظہار مارتھا واشنگٹن پر نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ میں اتنا کرتی کہ اپنے دونوں ہاتھ گول شکل میں ملا کر زمین پر رکھ دیتی۔ جس سے میری یہ مراد ہوتی

تھی۔ کہ گھاس میں کوئی گول مول چیز ہے۔ اس سے مارتھا میرا مطلب سمجھ جاتی تھی۔ جب خوش قسمتی سے ہمیں کوئی گھونسلا مل جاتا تو میں مارتھا کو اپنے گھر انڈے لے جانے کی کبھی اجازت نہ دیتی تھی۔ اور اسے پر زور طریق پر علامات کے ذریعے سے سمجھا دیتی، کہ " اری تو گر پڑیگی اور سب انڈے ٹوٹ پھوٹ جائینگے"

غلّے کے گودام، گھوڑوں کے اصطبل اور وُہ صحن، جہاں لوگ صبح وشام گائے بھینسوں کا دُودھ دوہتے تھے۔ میرے اور مارتھا کے لئے خاص دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ گوالے دُودھ دوہتے وقت مجھے اپنا ہاتھ گائے کی پیٹھ پر رکھ لینے دیتے تھے۔ اور میرے استعجاب کی تسکین کے معاوضہ میں گائے مجھ پر اکثر خوب دولتیاں چلایا کرتی تھی۔

کرسمس (بڑے دن) کی عید میرے نزدیک ہمیشہ باعثِ مسرت ہوتی تھی۔ مجھے یہ تو خبر نہیں تھی۔ کہ گھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ البتہ مجھے ان تمام خوشبوؤں میں مزا ملتا تھا۔ جو گھر میں چاروں طرف پھیلی ہُوئی ہوتی تھیں۔ اور میں ان تمام نوالوں کو مزے لے لے کر کھاتی تھی۔ جو گھر والے مجھے اور مارتھا کو ہمارے غل غپاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے دیتے تھے۔ کیونکہ ہم گھر کے کام کاج میں سختی سے حائل ہوتی تھیں۔ لیکن اس طرح ہارج رہنے سے خوشی میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ گھر والے ہمیں مصالحہ پیسنے، کشمش کو صاف کرنے اور ڈوئی کو زبان لگا کر چکھنے سے نہیں روکتے تھے

میں دوسروں کی تقلید میں اپنی جرابیں رسی پر لٹکا دیا کرتی۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ یہ تقلید کیوں میرے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث تھی؟ اور نہ اس فعل کے متعلق میرا استعجاب ہی اس درجہ شدید تھا کہ جس سے میں علی الصباح دن نکلنے سے پیشتر اُٹھ بیٹھتی اور اپنے موزوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیتی۔

میری طرح مارتھا کو بھی شرارت کرنے کا بیحد شوق تھا۔ جولائی کی ایک گرم سہ پہر ہے۔ دو ننھّے بچّے ہمارے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک آبنوس کی طرح سیاہ فام ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گھنے بالوں کے گچھے جو بُوٹ کے تسموں سے بندھے ہُوئے ہیں۔ بوتل کا کاک کھولنے والے پیچ کی طرح تمام سر پر آویزاں ہیں۔ دوسرا بچّہ گورا چٹّا اور لمبے لمبے سُنہری بالوں والا ہے۔ ایک کی عمر چھ سال ہے۔ تو دوسرا اس سے دو تین سال کے قریب بڑا ہے چھوٹا بچّہ نابینا ہے۔ یعنی میں خود۔ اور دوسرا ہی حبشی لڑکی مارتھا واشنگٹن ہے۔ ہم دونوں کاغذ کاٹ کاٹ کر گڑیاں بنانے میں مشغول ہیں۔ لیکن ہم جلد اس مشغلے

سے اُلجھ جاتی ہیں۔ اور اپنے اپنے بُوٹ کے تسمے
کاٹنے شروع کر دیتی ہیں۔ ہم اس سے فارغ ہو کر
ہنی سکل کے تمام پتے، جو ہماری گرفت میں آتے ہیں۔
کاٹ ڈالتی ہیں۔ تب میں مارتھا کے سلاخ نما بالوں
کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔ اور ان پر بھی قینچی سے ہاتھ صاف
کرنا شروع کر دیتی ہوں۔ پہلے تو وہ اس سے گھبرا اُٹھتی
ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ عوض معاوضہ گلہ ندارد
وہ قینچی پکڑ کر جھٹ میری ایک زلف اڑا دیتی ہے۔ وہ تو
اماں جان ہی بر وقت پہنچ جاتی ہیں۔ ورنہ مارتھا میرے
سر کا صفایا کر ہی چکی ہوتی۔ اللہ اللہ بچپن بھی عجیب
بادشاہت ہے !!

میری رفیق، یعنی ہماری کتیا بیلی بوڑھی اور سست
ہو گئی تھی۔ اور میرے ساتھ کھیلنے کی بجائے آگ کے
پاس سو جانا پسند کرتی تھی۔ میں نے اپنے اشاروں
کی زبان سے اسے سدھانے کی بیحد کوشش کی۔ مگر
وہ ایک کُند ذہن اور بے توجہ حیوان تھی۔ بعض اوقات
تو چونک کر وہ جوش میں آ جاتی اور کانپنے لگتی۔ اور پھر
بالکل بے حس و حرکت ہو جاتی۔ جیسے کہ کُتے کسی پرندے
پر ناک لگانے کے لئے ٹکٹکی باندھا کرتے ہیں۔ اس
وقت مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیلی اس طرح کیوں لیٹی
ہے ؟ میں فقط اتنا جانتی تھی کہ وہ میری ہدایت پر

حسب منشا عمل نہیں کر رہی ہے۔ میں اس سے ناراض
ہو جاتی۔ اور میرا سبق ہمیشہ بکطرفہ تکہ بازی پر ختم ہو جاتا
تھا۔ اس پر بیلی اُٹھتی اور کاہلی سے دو ایک انگڑائیاں
لیکر چولہے کی طرف جا کر لیٹ جاتی۔ میں تھک کر بایوس
ہو جاتی اور مارتھا کی تلاش میں نکل پڑتی۔

اوائل عمر کے کئی واقعات جُدا جُدا مگر صاف طور
پر میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اور اس خاموش، بے مقصد
اور تاریک زندگی کی یاد کو اور بھی تیز کئے دیتے ہیں۔

ایک دن اتفاق سے میرا لمبا کُرتہ پانی میں بھیگ
گیا اور میں اُسے نشست گاہ کے چولہے کی مدھم سی
آنچ پر پھیلا کر خشک کرنے کو بیٹھ گئی۔ کُرتہ میری
حسب منشا جلد خشک نہ ہوا۔ بس میں آگ کے اور نزدیک
ہو گئی۔ اور میں نے اسے گرم گرم راکھ پر رکھ دیا۔ آگ بھڑک
اُٹھی اور آن واحد میں شعلے میرے اردگرد پھیل گئے۔
حتٰے کہ میرا لباس مشعل بن گیا۔ میں نے خوف کے مارے
چیخ پکار شروع کی۔ یہ سُنکر بوڑھی انّا دیتی مجھے بچانے
کو دوڑی آئی۔ اس نے مجھ پر کمبل ڈال کر یوں تو میرا دم
بند کر دیا۔ مگر آگ بُجھا دی۔ اور میرے ہاتھوں اور
بالوں کے سوا اور کہیں سخت آنچ نہ لگی۔

اس عمر میں میں نے قفل کھولنا اور بند کرنا سیکھ
لیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت میں نے امّاں جان کو

گھر کے نعمت خانے میں مقفل کر دیا۔ اور چونکہ نوکر چاکر گھر کے ایک الگ حصّے میں رہتے تھے۔ اس لئے انہیں مجبوراً وہاں تین گھنٹے تک قید رہنا پڑا۔ وہ دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتی رہیں۔ اور مَیں باہر ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہُوئی دروازے کے دھماکے کو محسوس کر کے ہنسا کی۔ میری اس نہایت نازیبا حرکت سے والدین کو خیال پیدا ہو گیا۔ کہ جہانتک جلد ممکن ہو انہیں میری تعلیم کا بندوبست کرنا چاہئے۔ چنانچہ میری اُستانی مس سلیون صاحبہ کی تشریف آوری کے بعد مَیں نے انہیں بھی کمرے میں قید کرنے کا موقعہ جلد ہی نکال لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک دفعہ امّاں جان نے مس سلیون صاحبہ کو کوئی چیز دینے کے لئے مجھے اشارے سے سمجھایا۔ کہ جاکر بالا خانے پر سے انہیں لادو۔ لیکن جونہی کہ مَیں وہ چیز لاکر انہیں دے چکی، تو مَیں نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اسے قفل لگا دیا۔ اور کنجی کو کپڑوں کی الماری کے تلے چھپا دیا۔ مَیں کسی ذریعے سے بھی کنجی کا پتہ بتانے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ یہانتک کہ ابّا جان نے مجبور ہو کر ایک سیڑھی لگائی۔ اور بالا خانے کی کھڑکی میں سے اُستانی صاحبہ کو نیچے اتارا۔ اپنی اس حرکت سے مَیں بہت خوش ہُوئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس واقعہ سے کئی ماہ بعد مَیں نے اس کمرے کی کُنجی نکال کر دی تھی۔

جب میری عمر قریباً پانچ برس کی ہُوئی، تو ہم نے اپنے انگوری بیلوں سے ڈھکے ہُوئے مسکن سے ایک کشادہ گھر میں نقل مکانی کی۔ والد ماجد، امّاں جان، دو بڑے سوتیلے بھائی اور میری ایک چھوٹی بہن لڈربٹہ، جو میرے بعد پیدا ہُوئی تھی۔ بس یہی ہمارے خاندان کے اجزا تھے۔ ابّا جان کے متعلق میرا سب سے ابتدائی تصوّر وہ ہے۔ جبکہ وہ تنہا اپنے ہاتھ میں کوئی کاغذ مُنہ کے سامنے لئے بیٹھے ہوتے تھے۔ اور مَیں اخباروں کے بڑے بڑے ڈھیروں میں سے گھٹنوں کے بل چلتی ہُوئی ان کے نزدیک جا پہنچتی تھی۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت سی ہُوتی تھی۔ کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ مَیں ان کی نقل کیا کرتی۔ حتّےکہ ان کی عینک بھی اس خیال سے لگا لیتی تھی کہ شاید اس کی مدد سے کاغذ کا راز حل ہو جائے لیکن یہ عقدہ کئی سالوں تک نہ کُھل سکا۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا، کہ وہ کاغذ کیا معنی رکھتے تھے؛ یعنی یہ کہ ابّا جان ایک اخبار کی ادارت کیا کرتے تھے۔

میرے والد ماجد اپنے گھر کے شیدائی اور ایک بہت ہی شفیق باپ تھے۔ شکار کے مہینوں کے سوا، وہ شاذو نادر ہی گھر سے کہیں باہر جاتے تھے۔ گھر والے مجھے بتاتے ہیں کہ وہ بہت بڑے شکاری اور مشہور نشانہ باز تھے۔ گھر والوں کو چھوڑ کر انہیں اپنی بندوق

اور شکاری کتّوں ہی سے زیادہ اُنس تھا۔ وہ پرلے درجے کے مہمان نواز تھے۔ اور گھر لوٹتے وقت ایک نہ ایک مہمان ضرور ہی ساتھ لاتے تھے۔ انہیں اپنے وسیع باغ پر خاص ناز تھا۔ جہاں ضلع بھر کے اعلےٰ درجے کے تربوز اور سیب کی کاشت ہوتی تھی۔ اور وہ میرے لئے بہترین سیب اور موسم کے سب سے پہلے پکّے پکّے انگور لایا کرتے تھے۔ مجھے ان کا پیار سے تھپکنا۔ اور انگور کی ایک بیل سے دوسری بیل تک اُٹھائے لئے پھرنا اور میری خوشی سے خود بھی بیحد خوش ہونا، بخوبی یاد ہے۔

ابّا جان مشہور قصّہ گو بھی تھے۔ میرے اشاروں کی زبان سیکھنے کے بعد وہ اپنی بہت سی پرلطف کہانیاں میرے ہاتھ پر ایک بھدّے طریق سے ہجا کر کے سنایا کرتے تھے۔ اور ان کی کوئی خوشی اس سے بڑھ کر نہ تھی۔ کہ مَیں ان حکایات کو کسی مناسب موقع پر اشاروں ہی سے دُہراؤں۔

جب مَیں مُلک کے شمالی حصّے میں ۱۸۹۶ء کے سہانے موسم بہار کے آخری ایام کا لطف اُٹھا رہی تھی۔ تو مجھے ابّا جان کی وفات کی خبر پہنچی۔ وہ خفیف سے بیمار ہوتے۔ اور شدید تکلیف کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد انہیں اجل نے آلیا۔ آہ! یہ سب سے پہلا صدمہ تھا۔ جو مجھے پہنچا۔ اور موت کا پہلا ذاتی تجربہ تھا جو حاصل ہوا۔

امّاں جان کے متعلق مَیں کیونکر کچھ لکھوں۔ وہ مجھے اسقدر قریب معلوم ہوتی ہیں۔ کہ مَیں ان کا ذکر کرنا ایک غیر موزوں اور غیر خوش آیند حرکت تصوّر کرتی ہوں۔

بہت عرصے تک مَیں اپنی چھوٹی بہن کو ایک مزاحم ہستی سمجھتی رہی۔ کیونکہ مَیں جانتی تھی، کہ اب مَیں امّاں جان کی وہ اکلوتی، لاڈلی بچّی نہیں رہی۔ اس خیال سے مجھے حسد پیدا ہوتا تھا۔ اب وہ ہمیشہ ان کی گود میں رہتی تھی، جو پہلے میری نشستگاہ تھی۔ اور وہ ان کی تمام توجہ کو اپنی طرف مائل رکھتی تھی۔ ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے زخموں پر نمک چھڑکا گیا ہے۔ بات یہ ہوئی۔ کہ اس زمانے میں میرے پاس ایک بہت ہی عزیز، مگر ساتھ ہی بیحد خراب خستہ گڑیا تھی۔ جس کا نام مَیں نے نانسی رکھا تھا۔ یہ غریب، عزیز، اور ساتھ ہی ذلیل اس طرح یا اس لئے تھی، کہ نہ صرف میری محبت کا اظہار اس پر ہوتا رہتا تھا۔ بلکہ یہی بے زبان میری بدمزاجی کے حملوں کا بھی شکار رہتی تھی۔ جس سے وہ بہت بدشکل ہوگئی تھی۔ یوں تو میرے پاس اور گڑیاں بھی تھیں۔ جو باتیں کرتیں آوازیں نکالتیں اور اپنی آنکھوں کو کھولتی اور بند کرتی تھیں لیکن ان سب میں مجھے نانسی سے بڑھ کر کسی کے ساتھ محبت نہ تھی۔ نانسی کا ایک جھولا بھی تھا۔ مَیں اکثر اسے گھنٹہ

گھنٹہ بھر تک جھولا جھولاتی رہتی تھی۔ اور اس اثنا میں، جھولے اور گڑیا کی حفاظت کرنے میں مجھے کسی کا دخل گوارا نہ تھا۔ لیکن ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ میری چھوٹی بہن جھولے میں نچنت پڑی سو رہی ہے۔ ایک ایسے وجود کی شوخ چشمی اور الکڑ کو، جس کے ساتھ میرا کسی قسم کا رشتۂ اُلفت نہ تھا۔ میں کیونکر گوارا کرتی؟ پس میں نے غصّے سے دیوانی ہو کر جھولے پر حملہ کیا، اور اسے اُلٹا دیا۔ اگر اس موقع پر امّاں جان، بچّی کو تھام نہ لیتیں تو وہ ضرور مر جاتی۔ سچ ہے۔ جب ہم بچپن کی دو گونہ تنہا وادی میں سے گزرتے ہیں۔ تو ہم سب کا یہی حال ہوتا ہے کہ ہمیں اُس اُلفت اور پیار کا مطلق کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ جو ایک دوسرے کے ملاپ، محبت آمیز گفتگو اور افعال سے پیدا ہوتا ہے۔ بعد ازاں جب ہم انسانیت کے جذباتِ لطیفہ سے روشناس ہوتی ہیں اور ملذّ رہا ایک دوسرے کی اسقدر والا و شیدا ہو گئیں کہ کوئی فوری خیال جدھر ہماری رہنمائی کرتا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی جاتیں۔ حالانکہ نہ تو وہ میری اُنگلی کی زبان سمجھ سکتی تھی، اور نہ میں اس کی چلبلاہٹ اور میٹھی میٹھی باتوں کا کوئی تصوّر کر سکتی تھی۔

(باقی دارد) خادم محی الدین ایم اے

نوائے راز

سمجھ کر اے دلِ وحشی، نوا سنجِ فغاں ہونا
بہت دشوار ہے برہم زنِ بزمِ جہاں ہونا

شبِ فرقت بہت مشکل ہے سرگرمِ فغاں ہونا
مصیبت سے زیادہ ہے مصیبت نوحہ خواں ہونا

بہت آساں ہے یوں تو بیخودی کا رازداں ہونا
مگر ممکن بھی ہو عقدہ کشائے این و آں ہونا

اُٹھائیں سختیاں ہر ہر قدم پر دشتِ غربت میں
بلا کا پیش خیمہ تھا مرا بے خانماں ہونا

خدا توفیق دے تجھ کو تو ترکِ این و آں کر دے
بڑی خوش قسمتی ہے بے نیازِ دو جہاں ہونا

فنائے عشق میں مضمر حیاتِ جاودانی ہے
مبارک مٹنے والو تم کو بے نام و نشاں ہونا

کھُلا مشکل سے رازِ شعر گوئی رازؔ اب مجھ پر
بہت دشوار نکلا شاعرِ رنگیں بیاں ہونا

رازؔ

الناظر کا دوسرا انعامی مقابلہ

الناظر کے جملہ قلمی معاونین کو خاص طور پر اور مُلک کے دیگر اہل قلم حضرات کو عام طور پر اطلاع دی جاتی ہے کہ حسب شرائط ذیل اس مضمون پر خامہ فرسائی کریں :۔

عنوان

نذیر احمد ۔ حکیم محمد علیخاں ۔ سرشار ۔ شرر اور مرزا رسوا کے افسانوں کا مقابلہ کر کے بتائیے ۔ کہ ان میں بہترین ناول نویس کون ہے ۔ اور آپ اُن کے کس ناول کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

شرائط مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم سے کم ۳۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے ۔

(۲) ۱۵ ۔ نومبر تک دفتر الناظر میں وصول ہو جائے ۔

(۳) اصحاب ذیل مضامین مقابلہ کی جانچ کرینگے :۔

۱ ۔ جناب مولوی سید محفوظ علی بی ۔ اے رئیس بدایوں ۔

۲ ۔ جناب مولوی عبد الماجد بی ۔ اے دریا باد ضلع بارہ بنکی ۔

۳ جناب مولوی سید ہاشمی فرید آبادی رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ۔

۴ جناب منشی امیر احمد علوی بی اے جوڈیشل افسر نیپچ

۵ ۔ جناب مرزا محمد عسکری بی ۔ اے سکرٹری انجمن اُردو لکھنؤ

(۴) دو انعامات دیئے جائینگے :۔

اوّل ۔ پچاس روپیہ کی تھیلی اور پچاس جلدیں مضمون کی بعد طبع ۔

دوم ۔ پچیس روپیہ کی تھیلی اور پچیس جلدیں مضمون کی بعد طبع ۔

(۵) دونوں انعامی مضامین کی طبع و اشاعت کے جملہ حقوق بحق الناظر محفوظ رہینگے ۔

(۶) بقیہ مضمون بھی جبتک مجموعہ مضامین شائع نہ ہو جائے کہیں شائع نہ ہو سکیں گے ۔ اور مجموعہ کی اشاعت کا حق

صرف دفتر الناظر کو حاصل رہیگا۔

پہلی بار صرف ایک ہی انعام رکھا گیا تھا۔ اب کی دو انعام کر دیئے گئے۔ تا کہ زیادہ اصحاب کو اس مقابلہ میں شرکت کی ترغیب ہو۔ امید ہے کہ الناظر کے اس سلسلہ کو اہلِ نظر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اپنے اپنے مضامین وقت معینہ تک ارسال فرماکر خاکسار کو رہینِ مِنّت بنائیں گے۔

خاکسار:۔ ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ

یادِ ایام

(۱)

پیکرِ حسن بزم قدرت ہے — نغمہ پیرا رباب فطرت ہے
ایک مستی سی ہے ہواؤں میں — اک ترنم سا ہے فضاؤں میں
مستِ صہبائے حسن ہے دُنیا — غرقِ دریائے حسن ہے دُنیا
حسن ہے چاند میں ستاروں میں — حسن پھولوں میں حسن خاروں میں
حسن وادی میں حسن دریا میں — حسن گلشن میں حسن صحرا میں
کوہ میں حُسن جوئبار میں حسن — نغمۂ سازِ آبشار میں حسن

ایک دریائے حُسن جاری ہے
رُوح مصروف میگساری ہے

(۲)

چاندنی میں ہے سحر رعنائی — میں ہوں محوِ خیال آرائی
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا — خوابِ شیریں تھا اک فسانہ تھا
پیار تھا چاند سے ستاروں سے — سبزہ زاروں سے کوہساروں سے

نغمۂ آبشار سے اُلفت — دامنِ جوئبار سے اُلفت
گاہ شیدائے عشقِ پروانہ — حُسنِ شعلہ کا گاہ دیوانہ
جلوہ گاہِ جمال تھی دُنیا — ایک رنگیں خیال تھی دُنیا
رشکِ فردوس میری ہستی تھی — پیکرِ بیخودی و مستی تھی
حسن بھی عشق ناصبور بھی تھا
طور بھی برقِ کوہِ طور بھی تھا

(۳)

وقفِ طغیانیِ شباب ہوں میں — ایک گرداب اضطراب ہوں میں
مستِ پیمانۂ محبت ہوں — ایک دیوانۂ محبت ہوں
ایک دل میں ہزار ارماں ہیں — ایک قطرے میں لاکھ طوفاں ہیں
غرقِ دریائے حسنِ خوباں ہوں — قیدیِ گیسوے پریشاں ہوں
دولتِ حُسن کا بھکاری ہوں — دیرِ مستی کا اِک پُجاری ہوں
سیلِ اُلفت ہے میرے سینے میں — جوششِ مے ہے آبگینے میں
برقِ بیتاب ہوں شرار ہوں میں
مثلِ سیماب بے قرار ہوں میں

(۴)

عہدِ طفلی بھی خواب تھا گویا — ایک رنگیں حباب تھا گویا
مٹ گیا بحرِ زندگانی میں
موجِ طغیانیِ جوانی میں

اثر صہبائی

ہم نشیں! تو ہی بتا آخر کہ اب میں کیا کروں
بن نہیں پڑتی کوئی تدبیر، کیا چارہ کروں

عاشقی صبر آزما ہے اور دل ہے بے قرار
ضبط کا امکاں نہیں، کیا ضبط کا یارا کروں

تا بکے رویا کروں ناکامیٔ تدبیر کو
تا کجا محرومیٔ تقدیر کا شکوا کروں

تا بکے ترکِ تعلق دہر و اہلِ دہر سے
تا کجا دشتِ جنوں کی خاک میں چھانا کروں

تا بکے منت پذیرِ دیدۂ گوہر فشاں
تا کجا پھوٹی ہوئی تقدیر کو رویا کروں

دل کہ ہے اک مجمرِ سوزِ نہانِ آرزو
کس طرح کمبخت کو تسکین دوں ٹھنڈا کروں

مضطرب ہے روح بھی تن سے نکلنے کے لئے
موت آتی ہی نہیں لیکن بہانہ کیا کروں

دشمنِ جانِ حزیں ہیں بے قراریہائے دل
کیا کروں جمعیتِ خاطر کا ساماں کیا کروں

دل یہ کہتا ہے کہ مجھ کو دیجئے اذنِ بکا
چند نالوں میں زمانے کو تہ و بالا کروں

چاک کردوں پردۂ بے التفاتیہائے یار
میں تو رسوا ہو چکا، اس کو بھی اب رسوا کروں

سینۂ سوزاں میں مضطر نالۂ دلدوز ہے
اور تقاضا ہے کہ اب رازِ دروں افشا کروں

ہے تمنا کا تقاضا کیجئے تدبیر کچھ
تا بکے غم خانۂ دل میں رہوں، تڑپا کروں

یاس دیتی ہے مجھے ترکِ تمنا کی صلاح
آس کہتی ہے کہ کب تک میں ترا چارا کروں

اپنی اپنی کہہ رہے ہیں جسقدر ہیں غمگسار
سب ہیں آمادہ کہ میں ایسا کروں ویسا کروں

کشمکش میں مبتلا ہے الغرض جانِ حزیں
کیا کہوں، کس کی سنوں، اے رازؔ آخر کیا کروں

رازؔ

کُنج باغ میں

ایک صبح کوئی سات بجے بیزآرو تفریح سے واپس آکر باغ میں پہنچا۔ فنچکا ایک کنج میں جس کے گرد خوبصورت خوبصورت پھولوں کی بیلیں سایہ کئے تھیں ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ حسب معمول ایک انتہائی دل آویز لباس، اُس کے نازک جسم کو چھپائے تھا۔ صبیح چہرہ پر ایک نورِ سعادت تھا۔ اور بالوں کے اُوپر ایک سفید رومال اس طرح بندھا تھا۔ کہ اُس کا ایک کونہ سرک کر کسی قدر آنکھوں پر آرہا تھا۔ پاس ہی مختلف رنگ کے پھولوں کا ایک ڈھیر تھا جن پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ یہ اُس نے گلدستہ بنانے کے لئے توڑے تھے۔

بیزآرو نے قریب پُہنچ کر فنچکا کو سلام کیا۔

"اہا! آپ آگئے!" فنچکا نے جواب دیا۔ اور آنکھ پر آئے ہُوئے رومال کو ایک دلربایانہ انداز میں کچھ اُوپر ہٹایا تاکہ بیزآرو کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ اس کوشش میں اُس کا سفید ہاتھ کہنی تک کُھل گیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" بیزارو نے اُس کے قریب بیٹھ کر کہا۔ "میں سمجھا گلدستہ بنایا جا رہا ہے!"

"ہاں! کھانے کی میز کے لئے! نکولی کو گلدستے بیحد پسند آتے ہیں۔"

"مگر ابھی تو کھانے میں بہت دیر ہے، کس قدر خوبصورت پھول ہیں!"

"میں نے ابھی توڑ لئے۔ نہیں تو پھر دھوپ ہوجاتی۔ اور اس وقت باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے... گرمی کی وجہ سے میں ہلکان ہوتی جاتی ہوں مجھے خوف ہے کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں۔"

"کیا خوب! لائیے آپ کی نبض تو دیکھوں۔"

بیزآرو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نبض بالکل صحیح چل رہی تھی۔ اُس نے نبض کی چال شمار بھی نہیں کی۔ "آپ سو برس تک زندہ رہیں گی" اس نے اتنا کہا اور ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اُف! خدا نہ کرے۔"

"کیوں؟ آپ زیادہ زندہ رہنا نہیں چاہتیں؟"

کیوں نہیں! مگر سو سال! ہمارے پڑوس میں

ایک بڑھیا رہتی تھی۔ بچاسی برس کی عمر میں یہ حال تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور، کمر جھکی ہوئی، ہر وقت کھانسی کی شکایت، کثیف، بہری، ایسی زندگی کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!"

تو آپ کے خیال میں جوان رہنا اچھا ہے؟"

"اور نہیں کیا!"

"خوب! اچھا کس خیال سے؟"

"کس خیال سے! واہ! مجھے دیکھئے، اس وقت جوان ہوں، اپنی خوشی سے جہاں چاہوں جاؤں۔ جو چاہوں کروں کسی کی محتاج نہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کیا چاہئے؟"

"میرے لئے تو دونوں برابر ہیں، جوانی ہو، کہ بڑھاپا۔"

"یہ کیسے؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا!"

"اچھا، خود انصاف کیجئے، میری جوانی میرے کس کام کی۔ میں تنہا ہوں، تنہا، ناکارہ، ایک بیکار روح!"

"یہ آپ کے اختیار کی بات ہے۔"

"میرے اختیار کی بات ہرگز نہیں ہے! کم ازکم کسی نہ کسی کو مجھ پر ترس بھی تو کھانا چاہئے۔"

فنچکا نے ہیزاروو پر ایک غلط انداز ترچھی نظر ڈالی۔ مگر ایک حرف نہ کہا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آخر وہ بولی۔" یہ آپ کے ہاتھ میں کونسی کتاب ہے؟"

"یہ؟ یہ ایک ڈاکٹری کی کتاب ہے۔ بہت مشکل ہے۔"

"اور آپ اسے پڑھ رہے ہیں؟ ایسی خشک کتاب میں آپ کا جی کس طرح لگ جاتا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں، آپ کو اب پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کافی پڑھ چکے ہیں۔"

"جی ہاں! .... اچھا، ذرا اسے آپ تو پڑھئے!"

"میں کچھ سمجھوں گی بھی؟ روسی زبان میں ہے؟"

فنچکا نے موٹی، بھدی کتاب اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔" کتنی ضخیم کتاب ہے!"

"ہاں، روسی زبان میں ہے۔"

"کوئی زبان ہو، میری سمجھ میں ایک حرف نہ آیگا۔ اس خشک مبحث کو میں کس طرح سمجھ سکتی ہوں۔"

"میں نے کتاب اس لئے نہیں دی کہ آپ کچھ سمجھ سکیں۔ میں تو صرف آپ کو پڑھتے دیکھنا چاہتا ہوں آپ کی ناک ایک عجیب انداز سے آپ کی نظر کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سرکتی ہے۔"

فنچکا جو ابھی کتاب کا ایک صفحہ کھول کر زبان سے "آبوڈین" کا لفظ ہی کہہ سکی تھی ہنس پڑی۔ اس نے

کتاب پھینک دی..... وہ گر کر زمین پر آ رہی۔
بیزارو نے کہا۔ "آپ کی ہنسی میں بھی ایک بات ہے۔"

"رہنے بھی دیجئے۔

"مجھے آپ کی باتیں بڑی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ بس جیسے کسی چشمہ سے ایک لطیف گنگناہٹ کے ساتھ پانی ابل رہا ہو۔"

فنچکا نے ایک انداز خاص سے پہلو بدلا۔ "آپ کی باتیں بھی خوب ہوتی ہیں!" اپنی چٹکی میں ایک پھول پھراتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری باتوں میں کیا خاص بات ہے؟ آپ بیسیوں عقلمند عورتوں سے ہمکلام ہو چکے ہوں گے۔"

"آہ! یقین کیجئے، بیسیوں عقلمند عورتیں آپ کے پاسنگ برابر نہیں۔"

"یہ ایک ہی رہی!" فنچکا تالی بجا کر بولی۔
بیزارو نے اپنی کتاب زمین پر سے اٹھائی۔
"یہ ڈاکٹری کی کتاب ہے۔ آپ اسے پھینکتی کیوں ہیں؟"

"ڈاکٹری!" فنچکا نے دہرایا اور اس کی طرف گھوم پڑی۔ "سچ کہوں جب سے آپ نے وہ دوا دی ہے ـــ یاد ہے؟ ـــ کہہ نہیں سکتی مِتیا کسقدر آرام کی نیند سوتا ہے، میں نہیں سمجھتی آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں، سچ یہ ہے آپ کی مہربانیاں یاد رکھنے کے لائق ہیں۔"

بیزارو نے ایک خفیف تبسم کے ساتھ کہا۔ "مگر ڈاکٹروں کو فیس وغیرہ بھی دی جاتی ہے۔ آپ جانتی ہیں ڈاکٹر لوگ ذرا لالچی ہوتے ہیں۔"

فنچکا نے اپنی آنکھیں اٹھائیں جو اس کے دلکش چہرہ کی ہلکی سفید روشنی کے تقابل سے اور سیاہ نظر آتی تھیں۔ اور بیزارو کو غور سے دیکھا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بیزارو مذاق کر رہا تھا یا نہیں۔

"آپ چاہتے ہیں تو بیشک خوشی سے.....
میں ضرور نکولی سے اس کی بابت کہونگی....."

بیزارو نے بات کاٹ کر کہا۔ "کیا! آپ سمجھتی ہیں مجھے روپیہ کی خواہش ہے؟ نہیں میں آپ سے روپیہ نہیں چاہتا۔"

فنچکا نے سادہ نظروں سے پوچھا۔ "پھر کیا چاہتے ہیں؟"

بیزارو نے دوہرایا۔ "کیا چاہتا ہوں؟ آپ خود سمجھ سکتی ہیں!"

"میں کچھ نہیں سمجھتی۔" فنچکا کے چہرہ پر سرخی کی جھلک آگئی۔

"اچھا، مَیں بتاؤں؟ مَیں ..... مَیں ان پھولوں میں سے ایک پھول چاہتا ہوں۔"

فنچکا پھر ہنس پڑی اور بیزارو کی استدعا اسے اسقدر عجیب معلوم ہوئی۔ کہ اُس نے تالی بھی بجائی، وُہ ہنسی اور اپنی خوشامد اور تعریف سے خوش ہوئی۔

بیزارو اس کے چہرہ پر نظر جماتے رہا۔

آخرکار وہ بولی۔ "شوق سے لیجئے۔" اور اپنی جگہ پر جُھک کر وہ گلاب کے پھولوں میں سے ایک پھول چُننے لگی۔

"کونسا پھول لیں گے آپ —— سُرخ یا سفید؟"

"سرخ اور چھوٹا سا"

وہ گردن اُٹھا کر بولی۔ "یہ لیجئے۔" مگر فوراً دراز کیا ہوا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کُنج کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سُننے لگی۔

بیزارو نے پُوچھا "کون ہے؟"

"نکولی ہے نکولی؟"

نہیں وہ تو کھیت پر گئے ہوئے ہیں ..... علاوہ اس کے اُن کا کوئی ڈر ہی نہیں ..... مَیں بھی پاول پڑووچ ہے ..... "

گیا؟"

"مجھے شبہ سا ہوا کہ پاول آرہا ہے۔ مگر کوئی نہیں ہے ...... یہ پھول لیجئے۔" فنچکا نے بیزارو کو گلاب کا ایک پھول دیا۔

"پاول پڑووچ سے کس بنا پر آپ خائف رہتی ہیں؟"

"مَیں جب اُسے دیکھتی ہوں نہ معلوم کیوں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے آپ ہر وقت اُس سے لڑتے رہتے تھے؟ مَیں نہیں جانتی لڑائی کا سبب کیا ہے۔ مگر یہ جانتی ہوں کہ آپ اسے بالکل حقیر سمجھتے ہیں۔"

بیزارو مسکرایا۔ "لیکن اگر وہ مجھے مار بیٹھے۔" اُس نے کہا۔ "بتائیے آپ کس کا ساتھ دیں گی؟"

"میرے ساتھ کی ضرورت کیا ہے؟ آپ کسی سے شکست ہی نہیں کھا سکتے۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ مَیں کسی سے شکست نہیں کھا سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص اگر چاہے مجھ پر فتح حاصل کر سکتا ہے۔"

"کون؟"

"آپ نہیں جانتیں؟ سچ کہتے؟ دیکھئے جو پھول

آپ نے مجھے دیا ہے۔ اس کی خوشبو کس قدر پیاری ہے"
بیزارو نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔
فنچکا نے اپنی خوبصورت گردن بڑھائی۔ اور اپنا چہرہ پھول کے پاس لے گئی۔۔۔۔۔ رومال اُس کے سر سے سرک کر اس کے شانوں پر آ رہا۔ اور سیاہ چمکدار کچھ بنے کچھ بگڑے بالوں کا ایک ملائم گچھا نظر آنے لگا۔
"ایک منٹ ٹھہریے، مَیں اس پھول کو آپ کے ساتھ سونگھنا چاہتا ہوں۔" بیزارو جھکا اور فنچکا کے کھُلے ہوتے لبوں پر ایک بوسہ ثبت کر دیا۔
وہ چونک پڑی اور بیزارو کے سینہ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اُس نے اُسے پیچھے ہٹایا۔ مگر ذرا آہستہ سے ہٹایا۔ اس طرح کہ بیزارو اُس کے لبوں پر ایک دوسرے بوسہ پرّاں کا نشان چھوڑنے میں کامیاب ہُوا۔
جھاڑیوں کے اُس طرف ایک خُشک قہقہہ بلند ہُوا۔ فنچکا فوراً بنچ کے دوسرے کنارے پر سرک گئی۔ پاول پٹرووچ داخل ہُوا۔ اپنا سر خم کیا اور ایک ایسے انداز میں جس میں استحقار و نفرت کا دخل تھا۔
"آپ لوگ یہاں ہیں۔" کہتا ہُوا ہٹ گیا۔ فنچکا نے جلدی جلدی اپنے پھُول اکٹھا کئے۔ اور کنج سے نکلتی چلی گئی۔
"آپ کو ایسا نہ چاہتے تھا" چلتے چلتے اس نے بیزارو کے کان میں کہا۔ اُس کے لہجہ میں ایک اندازِ ملامت تھا۔

جلیل قدوائی

ابرِ بہار

اُٹھ رہی ہے سمت مشرق سے گھٹا مستانہ وار
پھیلتا جاتا ہے تا حدِ نظر ابرِ بہار

چھپ رہا ہے پردہ ابرِ سیہ میں آسماں
چل رہی ہے کوہساروں میں ہوائے خوشگوار

وادیوں میں ہر طرف چھائی ہُوئی ہے خامشی
کس قدر وجد آفریں ہے یہ سکوتِ کوہسار

جلوہ دکھلاتی ہے اپنا زیرِ دامانِ سحاب
نوعروسِ برق یعنی دخترِ ابرِ بہار

ذرّہ ذرّہ میں نظر آنے لگی ہے تازگی
انبساطِ رُوح سے لہرا رہا ہے سبزہ زار

کالی کالی یہ گھٹائیں، منبعِ آبِ رواں
بھینی بھینی یہ فضائیں مایۂ صبر و قرار

طائرانِ خوشنوا پیغام آزادی سے لئے
اُڑتے پھرتے ہیں ہوا پر ہر طرف مستانہ وار

نغمہ ہائے سرمدی جو دل میں ہیں ان کے بھرے
ہیں نکلنے کے لئے سینوں سے ان کے بیقرار

بارشِ ابرِ کرم سے یہ فضائے کائنات
دیکھتے ہی دیکھتے ہوجائے گی جب لالہ زار

شور سے اُس دم اُٹھالیں گے یہ سر پر آسماں
دم زدن میں ٹوٹ جائے گا سکوتِ کوہسار

ہوگئی محمل نشیں پھر دل میں یادِ روئے دوست
پھر رواں ہونے کو ہے آنکھوں سے اپنی آبشار

پھر ہوا لانے لگی خوشبوئے زلفِ عنبریں
دل سے پھر اُٹھنے لگا رنج و الم کا اک غبار

آنکھ ہے لبریز فرطِ اشتیاقِ دید سے
منتظر ہے پھر کسی کا یہ دلِ امید وار

موجۂ بادِ بہاری گو سبک رفتار ہے
چھیڑ سے اس کی مگر ہوتا ہے دل کو انتشار

آہ! یہ دل بھی کبھی تھا بار یابِ بزمِ دوست
ان مناظر کی کبھی لوٹی تھی اس نے بھی بہار

اب نہیں افسوس حاصل دل کو عیشِ قربِ دوست
اب نہیں دل کو ذرا تابِ خلشہائے بہار

آرزو ہے دل کی کھیتی بھی کبھی سرسبز ہو
گلشنِ حسرت میں بھی اے کاش آجائے بہار

اپنے دل سے بھی کوئی اے کاش اُٹھے ایسی گھٹا
جس سے کم ہوجائے کچھ میرے غمِ الفت کا بار

سینۂ سوزاں میں بھی بجلی چمک اُٹھے کبھی
اس سیہ خانہ سے بھی اُڑنے لگیں غم کے شرار

کاش میرا طائرِ دل بھی صدا دینے لگے
ہو کبھی میرا بھی ظلمت خانۂ دل مرغزار

بوئے الفت سے مرا سینہ بھی بس جائے کبھی
کاش دل کی بھی گھٹا یا رب! برس جائے کبھی

جلیل قدوائی

خاموش الہام گاہ

دنیا میں بہت سے باکوس[۵۱] ایسے ہیں۔ جو زرّیں گرز ہلاتے ہیں لیکن ایسی ہستیاں
کمیاب ہیں جو اپنے سینہ میں راستی کا پر تو جلوہ نما دیکھتی ہیں۔

(۱)

شاہ اطلیوس کے زمانے میں عوام الہامگاہوں
کی بہت حرمت کرتے تھے۔ ان الہامگاہوں میں مُلک
فریجستان کے شہر دردنج کی الہامگاہ خداوند فیبوس[۵۲]
سے کشف حاصل کرتی تھی۔ قیدِ رسم کے خلاف اس معبد
کی تجلیات کا موردِ تنزیل ایک مرد کشیش[۵۳] تھا۔ معبد کا
صحن ہمیشہ خوش عقیدت سائلین سے پُر رہتا تھا۔ جو
اپنے سوالات کو لکھکر بصد نیاز و حرمت پیش کیا کرتے
تھے۔ بعض غیر معمولی موقعوں پر زیارتگاہ کے بعید ترین
گوشوں سے ایک آواز سوالات کا جواب دیتی ہُوتی
سُنائی دیتی تھی۔ جو خود معبود کی آواز خیال کی جاتی تھی
اس بارگاہِ صداقت کا خزانہ طلائی اور نقرئی ساغروں
اور دیگر سامانِ آرائش سے مزیّن تھا۔ سکّوں اور قیمتی
جواہرات کے انبار جابجا نظر آتے تھے۔ دولتمند
دادخواہوں کے تحائف اور عوام کی جنس میں بے شمار
قربانیاں درگاہ کے خادموں کے روزینہ کے لئے کافی
ہوتی تھیں۔ اور دیگر اوقاف معبد کے حامیوں کی عزت
انسان اپنی عقل و فراست ریاضت و دیانت کے
سبب سے مشہور تھا۔ اسی لئے معبودوں کی طرف سے
اس کو انتہائے قربی عطا کی گئی تھی۔ لیکن کثرت گوشت خوری
اور فرطِ شراب نوشی کے سبب سے آخر ایک دن وہ معبد
کو خالی کر کے شکارِ اجل ہوگیا۔

پس الہامگاہ کے محافظین جانشین کے انتخاب
کے لئے جمع ہُوتے۔ اور کیونکہ وہ قدرتاً خواہشمند تھے
کہ معبد کی حرمت میں فرق نہ آتے۔ اس لئے اُنہوں
نے ایک قابلِ قدر کاہن کو اپنا رئیس روحانی منتخب
کیا۔ نیا کشیش خوبصورت۔ مرتاض۔ عاجز۔ پارسا غیور
اور عقلمند تھا۔ انتخاب یقیناً امید کے خلاف تھا۔ اس
لئے ضروری تھا کہ اس موقعہ پر کوئی غیر معمولی واقعہ رونما

۵۱ عیش و عشرت کا دیوتا ۵۲ روشنی و مہر کا دیوتا
۵۳ مذہبی مقتدا۔

ہو۔ اور واقعی ایک عجیب حادثہ رونما ہوا۔ کہ معبد کے محافظ حیران رہ گئے۔ معبود کے جوابات دفعتہً قطعی طور پر بند ہو گئے۔ رئیس روحانی کو حالتِ خواب میں الہام عطا نہ کئے گئے۔ پیشینگوئی کے اضطراب اور معبود کی جلوہ نمائی میں کمی کے سبب سے وہ مستقبل کے واقعات کا اظہار کرنے سے قاصر ہو گیا۔ معبد سے ندا کا پیدا ہونا منقطع ہو گیا۔ سائلین کی عرضداشتوں کا ڈھیر قربانگاہ پر لگ گیا جن کے جواب میں خاموشی تھی۔ پس عرضداشتوں کا آنا بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ خزانے میں تحائف کی آمد بھی ختم ہو گئی۔ معبد کے مکانات پجاریوں سے خالی ہو گئے کشیش نے معبود کے نام پر پے در پے قربانیاں کیں۔ تاکہ اس کی ناراضمندی رضامندی سے تبدیل ہو جائے معصوم کشیش اس ناراضگی کا بار اپنے کندھوں پر سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا۔ کہ معبود کے غصہ کا سبب اس کی کوئی پوشیدہ اور فاحش آلودگی ہے۔ یہ خیال دن بدن مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جس سے ملتا، اس کو خود سے متفق الرائے پاتا۔

ایک دن وہ غم زدہ حالت میں معبد کے اندر بیٹھا تھا۔ اور غور کر رہا تھا۔ کہ وہ کس طرح اپنے پاک فرائض سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔ یکایک اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ اور چونک کر نظر اٹھائی۔ تو سامنے ایک بڑھیا کو کھڑے پایا۔ بڑھیا بدشکل تھی۔ لیکن اسکی صورت میں رعب ضرور تھا۔ غور کرنے پر اس نے پہچانا کہ بڑھیا معبد کے ادنیٰ خادموں میں سے ہے۔

کشیش نے بڑھیا کو مخاطب کر کے کہا۔

"مادرِ محترم۔ یقیناً میرے خیال میں تم اس لئے آئی ہو کہ خداوند سے مَیں اور تم مل کر التجا کریں کہ وہ اپنے غصّہ کا سبب اور اس کے دفعیہ کا علاج ظاہر کر دے۔"

معزز بڑھیا نے جواب دیا۔ "نہیں بیٹا مَیں فیبوس یا کسی اور معبود کو بے فایدہ تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ میرے قبضہ میں وہ طاقت ہے۔ جو اس متروک معبد کی شان و شوکت کو واپس لا سکتی ہے مَیں یہ راز بتانے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ تو خود ایک مناسب معاوضہ پہلے مقرر کر لے۔"

کشیش مبہوت رہ گیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔

بڑھیا نے کہا۔ "راز کی قیمت ایکسو اشرفی ہے۔"

کشیش کے غصّہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اُس نے کہا۔

"کمبخت تیرے حریصانہ مطالبات سے ثابت ہوتا ہے کہ تو معبودوں کے راز سے ہرگز واقف

نہیں۔ تو مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے۔ میرے سامنے سے دُور ہو جا۔"

بڑھیا نے مطلق تعرض نہ کیا۔ اور فوراً نظروں سے اوجھل ہو گئی کشیش نے جلد اس واقعہ کو فراموش کر دیا۔ لیکن اگلے دن ٹھیک اسی وقت بڑھیا اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور کہا۔ "راز کی قیمت دوسو اشرفی ہے۔"

کشیش نے پھر اس کو اپنے سامنے سے نکالدیا اور اس کا یہ حکم بغیر حیل وحجت کے قبول کر لیا گیا۔ لیکن اب کشیش کے خیال میں اس واقعہ نے اہمیت اختیار کر لی۔ ایک اضطراب اس پر مسلط ہو گیا۔ بڑھیا کے بار بار کے اصرار نے ایک پر اسرار کیفیت اختیار کر لی۔

کشیش نے خیال کیا کہ معبودوں کے طریقے انسانی طریقوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اور اکثر وہ اپنے ارادوں کا اظہار پیچیدہ اور ناقابل یقین طریقہ سے کیا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کو ایک خاص نبیہ اور اس کی تین کتابوں کا قصّہ یاد آیا۔ اس کے بدن میں لرزہ پیدا ہُوا۔ اور اس نے سوچا۔ کہ کہیں اس کی نامناسب ضد کے سبب سے معبد اور اس کی شہرت و نیکنامی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ نہ ہو جائے۔

پس اس نے فیصلہ کیا۔ کہ اگر بڑھیا اگلے دن بھی حسب معمول آتی تو وہ اس سے ترشروئی سے پیش نہ آئے گا۔

مقررہ وقت پر بڑھیا پھر آئی۔ اور کہا۔ "راز کی قیمت تین سو اشرفی ہے۔"

کشیش خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور کہا۔ "اے فرشتۂ رحمت۔ تیرے مطالبات پورے کرنے کے لئے مَیں تیار ہوں۔ تو جلد از جلد میرے دلی اضطراب کو اطمینان قلبی سے تبدیل کر دے۔"

بڑھیا کا جواب مختصر اور تعجب خیز تھا۔ اُسنے اپنی کھُلی ہُوئی ہتھیلی کو آگے بڑھایا۔ کشیش نے جلدی سے اشرفیاں اس کی ہتھیلی پر گننی شروع کیں تھوڑے تھوڑے وقفہ پر گننے کا سلسلہ رُک جاتا۔ تاکہ بڑھیا اپنے ہاتھوں کو ایک چمڑے کے بٹوے میں خالی کر دے۔ نیز اکثر اوقات بڑھیا حرص کی نگاہوں سے ہر اشرفی کا فرداً فرداً امتحان کرتی اور بٹوے میں ڈال دیتی۔

اس عمل کے خاتمہ پر کشیش بولا۔ "براہِ عنایت اپنے عہد کو اب پُورا کر دو۔"

بڑھیا نے کہا۔ "الہامگاہ کے خاموش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مصدرِ وحی ناقابل ہے۔"

کشیش نے سرد آہ کھینچی اور کہا۔ "افسوس میں خود اس سے واقف ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ میرا گناہ کیا ہے۔ جس کی سزا اس قدر سخت ہے۔"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "گناہ یہ ہے کہ تیری عقل ابھی حد عروج تک نہیں پہنچی۔ اور تیری ناتجربہ کاری دور نہیں ہوئی۔ تیرا دماغ تیرے اتنے بڑے سر کے اندر ایک نہایت بے قدر اور ہلکی سی چیز ہے۔ تجھے اس وقت خیال ہوگا کہ میں معموں میں تجھ سے گفتگو کر رہی ہوں۔ اور بے معنی الفاظ استعمال کر رہی ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ تو دنیا میں احمق ترین انسان ہے"

متعجب کشیش کی خاموشی ابدی معلوم ہونے لگی۔ بڑھیا نے اس طرح کہنا شروع کیا۔

"کیا ایک مذہبی مقتدا کے لئے اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ کہ وہ مذہب کی اصل و بنیاد سے بے بہرہ ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مذہب وہ آلۂ فریب کاری ہے۔ جو چند ذی عقل۔ بے شمار احمقوں کے مقابلے میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس فریب سے طرفین مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن اول الذکر بہت فایدہ اٹھاتے ہیں۔ بیوقوف تھے وہ لوگ جو سوالات لیکر یہاں آتے تھے لیکن اب ناامید ہو کر دوسری الہامگاہوں میں جاتے ہیں۔ اور تجھ سے زیادہ عیار لوگوں کو مالامال کرتے ہیں۔ کو دن! کیا تو یہ خیال کرتا تھا۔ کہ سوالات کا جواب دینے والی آواز خداوند غیبوں کی آواز ہے؟ یہ کس طرح ممکن تھا؟ اس لئے کہ خداوند غیبوں کی ہستی بے اصل ہے۔ جو انبار عرصد اشتوں کے محراب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے جواب کے لئے ایک معمولی سے معجزہ کی ضرورت ہے۔ جو مافوق الطبیعت آواز معبد کے اندر سے آتی تھی۔ وہ دراصل ایک محترم ہستی کی آواز تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پوشیدہ جگہ مرحوم کشیش نے معبد میں تیار کرائی تھی۔ اس میں میں پوشیدہ رہتی تھی اور وقت ضرورت جواب دیا کرتی تھی۔ عالم شباب میں میں اس کی معشوقہ تھی۔ اور عالم پیری میں اس کی یار و مددگار۔ حسب سابق اب بھی تیرے لئے مددگار کا کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میری نصیحت پر عمل کر۔ اپنے ذلیل ترین توہمات کو نظر فراست سے دیکھ۔ اپنی سادگی کو مصلحت کی نظر سے جانچ۔ اپنی لاغری اور نزاری کو فربہی سے تبدیل کر دے۔ اپنی موجودہ تمسخر آمیز اور پریشان حالت کو خیرباد کہکر اپنے تدین کی شہرت پھیلا۔ اور عوام سے خراج تحسین طلب کر۔ مجھے یقین ہے کہ تو میری اس نصیحت کو تین سو اشرفیوں میں گراں خیال نہ کریگا۔

نوجوان کشیش نے بڑھیا کی تقریر کو اضطراب آمیز خاموشی سے سُنا۔ تقریر کے خاتمہ پر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے قابلِ نفرت ساتھی نے اس کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بڑھیا کو جھٹک کر معبد سے باہر نکل گیا۔

(۲)

نوجوان کشیش اسقدر مغموم تھا کہ اس کا دماغ مختل ہو گیا۔ اپنی حالت درست ہونے پر اس نے عہد کیا کہ شہر دردیخ سے بعید ترین حصّۂ دُنیا میں چلا جائے۔ اس کے دل میں آوارہ گردی اور خانہ بدوشی کا شوق پیدا ہُوا۔ بہت عرصہ نہ ہُوا تھا کہ اُس کے مضبوط اعضا نے اس کو تمام برّ اعظم ایشیا کی سیر کرا دی۔ اس کی سادہ ضروریات کے لئے جنگل کے خود رو پھل کافی تھے۔ کبھی کبھی وہ مزدوری بھی کرتا۔ اور اجرت سے اپنی ضروریات پوری کرتا۔ بتدریج ضمیر کی وہ ملامت جس نے اُسے معبد کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ انسانوں کی ابلہی و بیوقوفی کو دیکھ دیکھ کر ایک طنزیہ ترحم کی صورت میں تبدیل ہو گئی وہ انتشار جس نے اس کو تبدیل مکان پر آمادہ کیا تھا۔ گہرے تجسس اور مشاہدہ کی صفات میں تبدیل ہو گیا سوائے ایک خاص طبقہ کے اس نے ہر طبقہ کے انسانوں سے ملنا جُلنا شروع کر دیا۔ اور وہ یہ معلوم کر کے خوش ہُوا کہ وہ محدود باطینت جسکی اسکو اوائل عمر میں تعلیم دی گئی تھی۔ عالم غیر محدود کے قرب سے غائب ہونی شروع ہو گئی۔ ایک خاص طبقہ کے انسانوں سے، مذہبی مقتداوں سے، اس نے کچھ حاصل نہ کیا اس لئے کہ وہ ایسے رہنماؤں سے الگ رہنے میں ازحد محتاط تھا۔ وہ اس تمام عرصہ میں کسی معبد میں داخل نہ ہُوا۔ پیشینگو اور مذہبی پیشوا اور ہر وہ شخص جو مذہبی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے لئے قابلِ نفرت ہو گیا۔ آخر اُس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اگر وہ آگے بڑھتا تو اس کی ملاقات شام کے رمّالوں۔ ایران کے ساحروں اور ہندوستان کے جادوگروں سے ہو جاتی۔ جن سے وہ ازحد متنفر تھا۔ لیکن اس کے دل میں فرنگستان کی طرف رُخ کرنے کا خیال بھی پیدا نہ ہُوا۔ ابھی وہ اس ملک سے بہت فاصلے پر تھا کہ ایک دن شام کے وقت وہ ایک گاؤں کی سرائے میں جا کر ٹھہرا۔ سرائے کے ایک کمرے میں خاموش بیٹھا تھا۔ کہ یکایک اس نے ایسے الفاظ سُنے جو اس کے لئے ازحد تعجب خیز تھے۔

ایک دوسرے کمرے میں گاؤں کے باشندوں کا مجمع تھا۔ ان میں سے ایک شخص کوئی خاص واقعہ بیان کرتے ہُوئے کہنے لگا۔ "میرا قول ایسا ہی صحیح ہے۔ جیسا کہ دردیخ کا الہام"

کشیش یہ سنتے ہی چونک پڑا۔ اور اس کے منہ سے آہستہ چیخ کی آواز نکلی۔ تمام مجمع کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ لیکن کشیش نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوچھا:۔

"کیا واقعی درونخ کے الہام اس قدر صحیح ہوتے ہیں۔"

سب نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اور ایک شخص نے اس سے پوچھا۔ "کیا تو ایسا اجنبی ہے کہ اس واقعے سے بھی نابلد ہے۔ کیا تو نے کبھی کشیش یلبوس کا نام نہیں سنا؟

نوجوان مسافر نے کہا۔ "یلبوس! یلبوس!! یہ تو میرا نام ہے۔"

ایک دوسرا شخص بولا۔ "پھر تو تجھ کو خوش ہونا چاہئے۔ کہ تو ایسے پارسا اور عفیف انسان کا ہمنام ہے۔ جو معبودوں کا منظورِ نظر ہے۔ جس وقت وہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے قربانگاہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ تو اس کی شان و شوکت قابلِ دید ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جس نے اس کو دیکھا ہے۔ اس واقعہ کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اوہو! غور سے دیکھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اور تو بالکل ہم شبیہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تیرے ہمنام کی پیشانی میں مذہبی نورانیت جلوہ گر ہے۔ جو تجھ میں موجود نہیں۔"

تیسرے شخص نے کہا۔ "نورانیت۔ بیشک اگر فیبوس خود اپنی الہامگاہ کے فرائض کو انجام دیتا۔ تو اس کی شان بھی موجودہ کشیش سے برتر نہ ہوتی۔"

چوتھا شخص کہنے لگا۔ "کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ نیک یلبوس کے تقرر کے بہت دن بعد تک الہامگاہ خاموش رہی؟"

پانچویں نے کہا۔ "واقعی یہ بھی عجیب بات ہے کہ پہلے الہام میں اس نے ایک بڑھیا کی موت کی پیشینگوئی کی، جو معبد کی خادمہ تھی۔"

یلبوس۔ "ہیں یہ کس طرح ہوا۔"

موخرالذکر شخص نے جواب دیا۔ "یلبوس نے بڑھیا کے مرنے کی پیشینگوئی فقط ایک دن پہلے کی تھی۔ جو صحیح ثابت ہوئی۔ بڑھیا کے مرنے کی پیشینگوئی فقط ایک دن پہلے کی تھی۔ جو صحیح ثابت ہوئی۔ بڑھیا کے مرنے کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ ایک اشرفی جس کی دراصل وہ مالکہ نہ تھی۔ اس کے گلے میں اٹک گئی۔ جب کہ وہ اشرفی کو اپنی زبان کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

یلبوس نے اپنے دل میں کہا۔ معبودوں کی

طاقت بڑ گویا معبود واقعی کوئی ہستی رکھتے ہیں۔ اگر واقعی ان کی کچھ ہستی ہوتی تو کیا وہ اس قدر استہزا روا رکھتے) ایسے ایسے نامعقول تمسخر کو قائم رکھنا اور میرا نام چرا لینا! اپنی شکل کو میری صورت کی مانند بنا لینا! مجھ کو ان معبودوں کی قسم جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ میں اس فریب کو مشتہر کرونگا۔ ورنہ اپنی جان دیدونگا۔"

یلبوس علے الصباح بستر سے اُٹھا اور شہر درونسخ کا رخ کیا۔ جوں جوں وہ شہر کی جانب بڑھتا چلا گیا، فیبوس کی الہامگاہ کی شہرت زیادہ ہوتی گئی اور رئیس روحانی کے زہد کا قصہ ہر زبان پر سُنا گیا۔ کشیش کی وجاہت اور اس کی قوت روحانی کی ہر جگہ تعریف تھی۔ یلبوس جہاں جاتا دیکھنے والے اس مشابہت کا ذکر ضرور کرتے۔ جو اس کے اور موجودہ کشیش کے درمیان تھی۔ جب وہ شہر کے اندر پہنچا تو دیکھا کہ شہر کی سڑکوں میں لوگوں کا اژدہام ہے۔ ہر شخص معبد کی طرف چلا جا رہا ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ معبد میں کوئی اہم مذہبی جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ پرستش کی سنجیدگی جشن کی مسرت سے مل کر ایک عجب کیفیت پیدا کرتی تھی۔ یلبوس نے پہلے اس جم غفیر کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد منظر کی دلکشی نے اس کے سخت دل پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے دل میں اعتراف کر لیا کہ جس فریب کے انکشاف کے لئے وہ اس قدر مضطرب تھا۔ وہ بیگناہ خوشی کا سرچشمہ تھا۔ اس نے دُعا کی کہ کاش! مذہب کی اہمیت مصلحت کے نقطۂ نظر سے اس کے دل پر اس انداز سے کندہ کی جاتی نہ کہ اس ناجائز اور نفرت آمیز طریقہ سے جس کی مثال بڑھیا نے قائم کی تھی۔

جس وقت وہ عبادت گاہ میں داخل ہوا اس کے دل میں اس قسم کے شک آمیز خیالات موجزن تھے بلند قربانگاہ کے سامنے کشیش کھڑا تھا۔ کشیش نوجوان تھا۔ اور بعینہ اس کی تصویر۔ لیکن اُس کی ذات ایک الگ اور معین ہستی تھی۔ عضو عضو کی مشابہت مکمل تھی۔ لیکن قائمقام کشیش کے بدن پر سر سے پاؤں تک جمال کا نقرئی پرتو حائل تھا۔ اس کے چہرے پر ضو اور علویت کے آثار عیاں تھے۔ رعب جمال اس قدر تھا کہ فریب کا خیال بھی اس پر نہ گزر سکتا تھا۔ یلبوس اس منظر سے متاثر ہوا۔ اس کا یہ ارادہ کہ وہ مصنوعی مقتدا کی شہرت کو تہ و بالا کر دیگا۔ اور اس کو قربانگاہ سے گھسیٹ کر باہر نکالدیگا۔ فوراً فسخ ہو گیا۔ وہ مبہوت کھڑا تھا۔ اور اس کے دل میں متضاد قوتوں کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ یکایک قائم مقام کشیش کی خوش آہنگ صدا

فضا میں گونج اٹھی اور اس نے اس طرح کہا۔

"یلبوس کو ہمارے سامنے لاؤ۔" قدرتاً اس حکم سے ہر شخص حیران رہ گیا۔ یلبوس کا چہرہ بے شک سنجیدہ رہا۔ وہ کمال سرعت سے مجمع کی متحرک لہر سے نکلا۔ اور قربانگاہ کے سامنے اپنے ہمنام سے دو چار ہُوا۔ جب انبوہ نے ان دونوں کو دیکھا تو ایک چیخ کی آواز اس کی طرف سے بلند ہُوئی۔ اس لئے کہ علاوہ صورت کے دونوں کے لباس میں بھی مطلق فرق نہ تھا چشم زدن میں قائم مقام کشیش کا قد عظیم ترین ہوگیا۔ اس کے سر کے گرد نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا ہالۂ نور محیط ہوگیا دراز گیسو سنبل کی طرح اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ اس کی آنکھوں میں آسمانی نور جگمگانے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ اس کی کمر میں ترکش لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے کی آرائش سینکڑوں گنا بڑھ گئی۔ یلبوس اور تمام حاضرین دوزانو ہوکر جُھک گئے۔ کیونکہ سب نے معبود فیبوس کو اپنے سامنے جلوہ گر دیکھا!!!

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی، اس کے بعد فیبوس نے سکوت توڑا۔ اس کی آواز میں رعب خداوندی تھا۔

"یلبوس آخر اسقدر دور و دراز سفر کے بعد تجھ کو احساس ہوگیا کہ تو نے مجھ کو بہت عرصے تک پرستوس جانے سے روکا۔ اور اپنے فرائض سے مُنہ موڑ کر لامذہب اور وحشی لوگوں سے دل بہلاتا رہا۔ اور مَیں یہاں آکر تیرا کام سنبھالنے پر مجبور ہوگیا۔"

شرم آلودہ یلبوس خاموش سُنتا رہا۔ معبود نے اس طرح کہنا شروع کیا۔

"یہ خیال نہ کر کہ تو نے پوشیدہ طور سے معبودوں کو ناراض کیا ہے۔ تو نے معبود کی درگاہ کو چھوڑ کر راستی کی تلاش میں جو قربانی کی۔ وہ قابلِ قدر ہے۔ یہی وہ قربانی ہے جو ہماری نظروں میں بیش بہا ہے۔ لیکن اے یلبوس! آئندہ کے لئے خیال رکھ کہ انسان کی نااہلیت تیرے قدرتی جذبات پر فتح نہ حاصل کر سکے۔ تیرے پاکیزہ ترین جذبات پر ایک نالائق انسان کی گفتگو کا کچھ اثر نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اگر دروغ کی الہامگاہ فریب گاہ تھی تو کیا تیرے جسم کے اندر سے کوئی صدا بلند نہ ہوتی تھی۔ تو کیا ہوا اور پانی بھی خاموش تھے؟ کیا دستِ قدرت نے ستاروں کی شمع بھی گل کر دی تھی؟ اگر ایک بیرونی طاقت حکم دینے سے قاصر تھی تو کیا تو اپنے ضمیر کی طاقت سے بھی بے خبر تھا؟ اگر تو معبود کی طرف سے کوئی حکم عوام کو نہ سُنا سکتا تھا۔ تو کیا اپنے ضمیر کے احکام بھی ان کو نہ سنا سکتا تھا؟ یقین کر کہ تیرے دِل میں احساس مذہبی اُس

وقت حقیقی معنوں میں پیدا ہوا تھا۔ جبکہ تونے میرے اسی معبد کو غارت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس معبد کو جو تیرے نزدیک فریب اور توہمات کا گھر تھا۔"

یلبوس نے جرأت کر کے کہا۔" لیکن اے فیبوس! کیا تیری موجودگی سے مطہر ہو کر میں پھر معبد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور تیری الہامگاہ کا رئیس مذہبی قرار نہیں دیا جا سکتا؟"

فیبوس مسکرایا۔ اور کہا۔" ہرگز نہیں۔ تیرے عجیب تجربات۔ تیری دور و دراز مسافرت۔ تیرے مراقبے اور تیری مختلف طبقوں کے انسانوں سے ملاقات نے تجھ کو کشیش کے فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں رکھا۔ لیکن یقین رکھ کہ تو نے خود کو حکیم کامل بنا لیا۔ اس معبد کا کشیش کوئی مناسب آدمی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اور ان الہامات کی مدد سے جو وقتاً فوقتاً اس کو عطا کرنا میں مناسب سمجھوں۔ اپنے فرائض کو بوجہ احسن سرانجام دے سکتا ہے۔ اے یلبوس! تو اپنے قویٰ کو کسی پاکیزہ تر خدمت کے لئے وقف کر دے۔ جو فیبوس کی خدمت سے بہتر ہے اور جو ڈیلوس اور ڈلفی کی خدمت سے افضل اور اشرف ہے۔

یلبوس:" اے فیبوس! تیرا مطلب کس کی خدمت سے ہے؟"

فیبوس نے کہا۔" نسل انسانی کی خدمت سے اے میرے نورِ نظر۔"

محمد ذاکر بی۔ اے

رُباعی

ہو جس میں مزا وہ بے قراری اچھی
ہو جس سے سکوں وہ اشکباری اچھی
انجام فنا ہو جس کا لیکن اے دل!
کب ہوتی ہے ایسی آہ و زاری اچھی

اثر صہبائی

قیمت سالانہ چھ روپے | رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۷ | قیمت ششماہی ہے فی پرچہ ۱۰ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-

سیّد عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل، محمد اسمٰعیل (آنریری ایڈیٹر)، محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)

جلد (۷) | اشاعت ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء | نمبر (۳)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون / اثر خامہ	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون / اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	میری داستان حیات جناب خادم محی الدین بی اے بی ٹی	۲	۸	سرود بہار جناب پورن سنگھ ہنر	۴۸
۲	غزلیات جناب ہادی مچھلی شہری بی اے ایل ایل بی	۱۵	۹	اچھوتی شراب جناب عبدالرشید اعرابی	۴۹
۳	حسنِ ازل جناب حامد علی حامد بی اے (انٹرنیشنل)	۱۶	۱۰	وجدانیات جناب عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی	۶۴
۴	ہمنام کی جستجو جناب عبدالستار خاں	۱۷	۱۱	ایک خط " " "	۶۵
۵	غزل جناب احسن علوی	۳۵	۱۲	غم نصیب محمد ہادی حسین	۷۱
۶	شکرانہ وصل جناب رفیق از مالیر کوٹلہ	۳۶	۱۳	تبصرے محمد ہادی حسین	۷۸
۷	افسونِ شب جناب عبدالرشید ارشد	۳۷	۱۴	اشتہار	۸۰

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کیلئے محمد اسمٰعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے چمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا۔

میری داستان حیات

(مسلسل)

تیسرا باب

معلم کی تلاش - ریل کی سیر - ڈاکٹر بیل سے ملاقات

اس اثناء میں خیالات کے اظہار کی خواہش بڑھنی شروع ہوئی۔ اور میں گفتگو کے لئے جو چند علامات اور اشارے استعمال میں لاتی تھی۔ وہ روز بروز ناکافی ثابت ہونے لگے۔ اور جب میں اپنا مدعا دوسروں پر ظاہر کرنے میں ناکام رہتی تو ہمیشہ غصے سے آگ بگولا ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا بعض ناپدید ہاتھوں نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ اور میں ان کے جکڑ بند سے اپنا پیچھا چھڑانے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی ہوں۔ پس میں اس کے لئے جدوجہد کرتی تھی۔ نہ اس لئے کہ اس سے کوئی آسانی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ میری طبیعت میں ضد اور مقابلہ کرنے کا جوش بہت تیزی پر تھا۔ میں اس کشمکش سے عموماً تھک کر چور ہو جاتی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی تھی۔ اگر اس وقت اماں جان پاس ہوتیں تو میں ان کی گود میں چلی جاتی۔ میری بے بسی اور تکلیف اسقدر شدید ہوتی تھی کہ مجھے اپنی خفگی کے طوفان کا سبب بھی یاد نہ ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد دوسروں کے ساتھ گفتگو کرنے اور راہ و رسم پیدا کرنے کی ضرورت یہانتک بڑھی کہ یہ وحشت اور غضبناکی کے دورے روزانہ بلکہ ہر ساعت ہونے لگے۔

میرے والدین اس حالت کو دیکھ کر سخت سراسیمہ اور اندوہگیں رہتے تھے۔ اور یہ غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص ٹسکمبیا جیسی دور افتادہ ریاست میں اتنا فاصلہ طے کر کے آتے۔ اور مجھ جیسی ایک لڑکی کو تعلیم دینا گوارا کرے جو گونگی بھی ہو اور اندھی بھی۔ میرے خویش و اقارب کو اس میں شبہ تھا۔ کہ مجھے پڑھایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن اماں جان کو اس ظلمت میں اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی تھی تو وہ ڈکنز[۵] کی کتاب "امریکن نوٹس" تھی۔ جس میں انہوں نے ایک عورت لارا برجمن کا حال پڑھا تھا۔ اور انہیں کچھ کچھ

[۵] چارلس ڈکنز ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں وفات پائی۔ انگریزی ناول نویس تھا۔ اپنے امریکہ کی سیاحت کرکے کتاب "امریکن نوٹس" لکھی (مترجم)

یاد تھا کہ اس عورت کو گونگی اور اندھی ہونے کے باوجود تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہیں اس خیال سے مایوسی ہوتی تھی کہ ڈاکٹر ہو، جس نے اندھوں اور گونگوں کو تعلیم دینے کا طریق دریافت کیا تھا۔ مدت سے راہیِ عدم ہو چکا ہے۔ انہیں خیال تھا کہ اس علم کے طریقے بھی غالباً اسی کے ساتھ مفقود ہو چکے ہونگے اور اگر یہ نہ بھی ہو۔ تو بھی ایلا بامیا جیسے دور افتادہ شہر میں رہ کر مجھ جیسی ننھی بچی کیونکر فایدہ اُٹھا سکتی تھی؟"

جب میری عمر چھ سال کی ہوتی تو میرے بزرگوار کو اطلاع ملی۔ کہ شہر بالیٹمور میں ایک نامور کحال رہتا ہے۔ جو بہت سے مایوس العلاج بیماروں کی آنکھوں کے علاج میں کامیاب ہوا ہے۔ پس میرے والدین نے فی الفور میرا علاج کرانے کے لئے مجھے بالیٹمور لے جانے کا قصد کر لیا۔

یہ سفر جو مجھے بخوبی یاد ہے۔ بہت پُر لطف رہا۔ میں نے ریل میں بہت سے لوگوں کے ساتھ شناسائی پیدا کر لی۔ ایک خاتون نے گھونگوں کا ڈبہ دیا۔ ابا جان نے گھونگوں میں سوراخ کر دئے۔ اور میں نے انہیں تاگے سے پرو لیا۔ یہ ہار ایک مدت تک میرے اطمینان اور دل بہلانے کا باعث رہا۔ ریل کا گارڈ بھی بہت مہربان تھا۔ اور اکثر جب کہ وہ گشت لگا کر ٹکٹ جمع کرتا، اور انہیں اپنی لبلبی سے چھیدتا تو میں اسکے کوٹ کا دامن پکڑ کر ساتھ چمٹ جاتی۔ اس کی لبلبی جس کے ساتھ وہ مجھے کھیلنے کی اجازت دیتا تھا۔ بہت دلخوش کن کھلونا تھا۔ چنانچہ میں اس کی نشست کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھی گھنٹوں مقوے کے ٹکڑوں میں چھید نکال نکال کر اپنی دل لگی کرتی رہتی۔

میری خالہ نے مجھے تولیے کی ایک بہت بڑی گڑیا بنا دی۔ یہ بے ڈھنگی، بدشکل گڑیا ایک عجوبہ تھی۔ اس کا نہ تو منہ تھا۔ نہ آنکھ، نہ ناک تھی اور نہ کان غرض اتنا بھی نہ تھا جس کی مدد سے ایک بچہ اپنی قوتِ متخیلہ کے مطابق اس کے چہرے کا تصور کر سکے۔ معلوم نہیں کہ اس گڑیا کی آنکھوں کی عدم موجودگی، اس کے دوسرے تمام عیوب کے مقابلے میں مجھے کیوں اسقدر کھٹکتی اور حیرت میں ڈالتی تھی؟ میں نے یہ نقص ہر شخص کو بار بار جتایا۔ حتےٰ کہ لوگ میری اس حرکت سے بیزار ہونے لگے لیکن کسی کو اتنا مقدور بھی نہ ہوا کہ اس غریب گڑیا کی آنکھیں بنا دے۔ یکایک مجھے ایک بہت اچھا طریقہ سوجھا۔ اور یہ عقدہ حل ہو گیا۔ یعنی میں نے جھٹ پھلانگ کر اپنی نشست کے نیچے سے خالہ کا سر تلاش کر کے نکال لیا۔ یہ دراصل ان کی قمیص کا گریبان تھا۔ جسکی جھالر میں بڑے بڑے آویزے لگے ہوتے تھے۔ میں نے

اس میں سے دو آویزے کھینچ لئے۔ اور خالہ جان سے کہا کہ آپ انہیں میری گڑیا کی آنکھوں کے مقام پر سی دیں اُنہوں نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر استفہام کے طور پر دریافت کیا۔ کہ کیا میرا مدعا ان آویزوں کی آنکھیں بنانے کا ہے؟ اس پر میں نے شدومد سے پسندیدگی کے اظہار میں سر کو جنبش دی۔ یہ بلوری موتی اپنی جگہ پر درست سی دِ تے گئے۔ اور میں خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی۔ لیکن بعد ازاں میری گڑیا کی رغبت جلد ہی کافور ہوگئی۔ اس تمام سفر میں مجھے ایک دفعہ بھی بدمزاجی کا دورہ نہیں ہُوا۔ کیونکہ میری توجہ اور اُنگلیوں کو مصروف رکھنے کے لیئے یہاں بہت سی اشیاء موجود تھیں۔

جب ہم بالٹیمور پہنچے تو آنکھوں کا ڈاکٹر خوش خلقی سے پیش آیا۔ لیکن اس نے کہا۔ کہ "افسوس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس لڑکی کی آنکھیں لاعلاج ہیں۔ البتہ اسے تعلیم دی جا سکتی ہے۔" پھر اس نے ابّا جان سے کہا کہ شہر واشنگٹن کے ڈاکٹر سکندر گراہم بیل[۱] سے مشورہ کرنا چاہیئے۔" ہم اس مشورے کے بموجب فی الفور ڈاکٹر بیل سے ملاقات کرنے کیلیئے واشنگٹن کی طرف روانہ ہوتے۔ لیکن میرے والد ماجد کے دل میں اُداسی اور شبہات جاگزیں تھے۔ میں ان کی دلی تکلیف سے بالکل بیخبر تھی۔ کیونکہ مجھے تو ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل و حرکت کرنے میں لطف آرہا تھا۔ میں بچّی تو تھی ہی۔ وہاں پہنچکر میں نے ڈاکٹر بیل کی اس ہمدردی اور ملائمت آمیز برتاؤ کو فی الفور محسوس کیا۔ جس کے طفیل اُنہوں نے بیشمار دلوں کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ کیونکہ ان کے حیرت انگیز انکشافات اور ان کی علمی قابلیت نے لوگوں کو محوِ حیرت کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے پیار سے مجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھاتے رکھا۔ اور میں اس اثناء میں ان کی گھڑی ٹٹولتی رہی۔ جسے اُنہوں نے میری خاطر بجا کر دکھایا۔ مجھے یہ معلوم ہوگیا۔ کہ وہ میرے اشاروں کی زبان کو سمجھ رہے ہیں۔ اس سے مجھے ان کے ساتھ فوراً اُنس ہوگیا۔ لیکن اس بات کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ یہ ملاقات ایک ایسا دروازہ ہے جس میں سے گزرنا میرے تاریک غاروں کو روشنی کے جلووں سے معمور کر دیگا۔ اور میں اپنے موجودہ تجرد و توحش کے چٹیل میدان سے قدم بہ قدم چل کر دوستانہ تعلقات، رفاقت، علم اور اُنس و محبت کے وسیع

---

[۱] سکاٹلینڈ کے دارالخلافہ ایڈنبرا میں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہُوا۔ ۱۸۷۱ء میں امریکہ پہنچکر بوسٹن یونیورسٹی میں علم تشریح الابدان کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اسنے ۱۸۷۶ء کی ایک نمائش میں اپنی ایک ایجاد کا نمونہ پیش کیا جو بعد میں ترقی کر کے ٹیلیفون بن گئی۔ اسنے ایک اور آلہ فوٹوفون بھی ایجاد کیا جس سے روشنی کے ذریعے فاصلے پر آواز پہنچا سکتے ہیں۔ اس نے بہروں کی تعلیم پر بہت سی محنت اور توجہ صرف کی ہے اسکا انتقال حال ہی میں ۱۹۲۲ء میں ہُوا ہے (مترجم)

سبزہ زار تک پہنچ جاؤنگی۔

ڈاکٹر بیل نے میرے والد ماجد کو یہ مشورہ دیا۔ کہ وہ ڈاکٹر اینیگنوز کو جو شہر باسٹن کے مدرسہ پرکنز انسٹی ٹیوشن کے منصرم ہیں۔ اور جہاں ڈاکٹر ہو نے اندھوں کی تعلیم کے متعلق بہت محنت اور جانسوزی کا کام کیا ہے، ایک خط لکھیں۔ اور ان سے دریافت کریں۔ کہ ان کے ہاں میری تعلیم کا آغاز کرنے والا قابل اُستاد ہے یا نہیں۔ ابّا جان نے فوراً خط لکھ دیا۔ اور چند ہفتوں کے بعد ۱۸۸۶ء کے موسم گرما میں مسٹر اینیگنوز کی طرف سے بہت سی تسلّی تشفی کے ساتھ یہ جواب آیا۔ کہ ایک اُستانی مل گئی ہے لیکن یہ اُستانی آئندہ مارچ سے پہلے نہ پہنچ سکیں۔

الغرض میں اس طرح مصر سے نکلکر کوہ سینا پر پہنچی۔ اور ایک خدائی طاقت نے میری رُوح کو چھُو کر روشن کر دیا۔ اس کی مدد سے میں نے بہت سے عجائبات دیکھے۔ اس متبرک پہاڑ سے مجھے یہ آواز سُنائی دی۔ کہ "علم نام ہے محبت کا۔ نور کا اور دلفریبی کا۔ غرض علم میں سبھی کچھ موجود ہے۔"

چوتھا باب

اُستانی کی آمد۔ علم کا اشتیاق۔ روح کی بیداری

جس دن میری اُستانی صاحبہ مس این مانسفیلڈ سیلوِن[۵] ہمارے ہاں آئیں۔ وہ دن مجھے اپنی تمام عمر میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ یادگار معلوم ہوتا ہے۔ اور جب میں اُس بے انتہا تفاوت اور اختلاف پر غور کرتی ہوں۔ جو میری اور ان کی زندگی کے درمیان موجود ہے۔ تو میری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی۔ یہ قابلِ یادگار تاریخ ۳۔ مارچ ۱۸۸۷ء تھی۔ جبکہ میری عمر تین ماہ کم سات برس کی تھی۔

میں اُس دن گھر کی ڈیوڑھی میں خاموش اور سراپا انتظار کھڑی تھی۔ میں نے امّاں جان کے اشاروں اور گھر میں

---

[۵] اس عبارت میں بنی اسرائیل کے ملک شام سے مصر میں جانے اور ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر تشریف لے جاکر انوارالٰہی سے بہرہ ور ہونے اور اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہونے کی طرف استعارے کے طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[۵] اضلاع متحدہ امریکہ کی ریاست میساچوسٹس میں بمقام سپرنگفیلڈ پیدا ہوئی۔ اوائل عمر میں اسکی بینائی قریباً زائل ہو چکی تھی۔ اور وہ ۷۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو پرکنز نابینا سکول میں داخل ہوگئی۔ اس وقت اسکی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ خوش قسمتی سے بعد ازاں اسکی نظر عمل جراحی سے عود کر آئی۔ اس مدرسے سے ۱۸۸۶ء میں فارغ التحصیل ہوئی۔ چھ سال تک وہ ایک اور نابینا طالبہ علم مس لارا برجمن کے ہمراہ ایک ہی مکان میں رہی پس نابیناکی تعلیم اور اسکے طریقوں سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ اور بہروں کو زبان سکھانے میں بھی اس نے اپنی ذاتی کوشش سے دسترس حاصل کی۔ (مترجم)

اِدھر اُدھر کی چست نقل و حرکت سے قیاس کر لیا تھا۔ کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے پس مَیں گھر کے دروازے پر جا کھڑی ہُوئی۔ اور انتظار کرنے لگی۔ سہ پہر کے سُورج کی شعاعیں ہنی سکل کی بیل کے اندر سے جو ڈیوڑھی پر چھائی ہُوئی تھی گزر کر میرے اُوپر اُٹھے ہُوئے چہرے پر اپنا عکس ڈال رہی تھیں۔ میری اُنگلیاں بیخبری کی حالت میں اُن پتّوں اور شگوفوں کو ٹھہر ٹھہر کر چھُوتی تھیں جن سے مَیں ہر وقت خلا ملا رکھتی تھی۔ اور جو ہمارے جنوبی موسم بہار کی تعظیم اور استقبال کے لئے ابھی ابھی پھُوٹے تھے۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میرا مستقبل میرے لئے کیا کیا عجائبات پیش کرنے والا ہے۔ اب تک میرا یہ حال رہا تھا۔ کہ مَیں کئی ہفتوں سے متواتر غم و غصّہ اور تلخ کامی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس پُر جوش کشمکش کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھ پر ایک شدید نقاہت پیدا کرنے والا ملال طاری ہو گیا تھا۔

کیا تمہیں کبھی گھنی دُھند کے اندر سمندر کے سفر کا اتفاق ہُوا ہے؟ جبکہ تمہیں محسوس ہُوا ہو کہ ایک غبار آلود تاریکی تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہُوئے ہے۔ اور تمہارا بھاری بھر کم جہاز فکر مندی کی حالت میں اپنے شاقول اور لمبی رسّی سمیت، ساحل کی طرف پانی کی گہرائی ماپتا ہُوا راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلا جا رہا ہو۔ اور تم ایک دھڑکتے ہُوئے دل کے ساتھ منتظر ہو کہ دیکھیں اب کیا ظہور میں آتا ہے؟ بعینہٖ میری بھی یہی حالت تعلیم شروع ہونے سے پیشتر تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جہاز کی طرح میرے پاس نہ تو راستہ معلوم کرنے کا قطب نما موجود تھا اور نہ پانی کی گہرائی ماپنے والی لمبی رسّی۔ نہ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا۔ کہ میری منزل مقصود کتنی دور رہ گئی ہے؟ میری روح کی خاموش پکار یہ تھی۔ "مجھے روشنی دو۔ اور تاریکی سے باہر نکالو!" درحقیقت محبت کی روشنی عین اس وقت بھی، جبکہ میری یہ کیفیت تھی۔ مجھ پر جلوہ گر ہو رہی تھی۔

مجھے نزدیک آنے والے قدموں کی آہٹ محسوس ہُوئی۔ مَیں نے امّاں جان سمجھ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ کسی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مجھے اس نیک دل خاتون، یعنی میری اُستانی نے، جو مجھ پر تمام اشیاء کا حال منکشف کرنے والی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے اپنے دامِ الفت میں گرفتار کرنے والی تھی۔ پکڑ کر خوب زور سے بغلگیر کیا۔

جس دن اُستانی صاحبہ تشریف لائیں اس سے اگلے روز وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں اور اُنہوں نے مجھے ایک گڑیا عنایت کی۔ یہ گڑیا پرکنز انسٹیٹیوشن کے نابینا بچّوں نے میرے لئے بھیجی تھی۔ اور لارا برجمن

نے اسے کپڑے پہناتے تھے۔ لیکن مجھے اس کا علم ایک
عرصہ کے بعد ہوا تھا۔ جب مَیں کچھ عرصہ تک اس کیساتھ
کھیل چکی تو مس سیلون صاحبہ نے چپکے سے آہستہ آہستہ
میرے ہاتھ پر لفظ گڑیا کا ہجا "گ۔ڑ۔ی۔ا" اپنی انگلی
سے لکھ دیا۔ مجھے اس اُنگلی کے کھیل میں فوراً دلچسپی پیدا
ہوگئی اور مَیں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی اور جب
مَیں بالآخر حروف کو بالکل ٹھیک طور پر نقل کرنے میں
کامیاب ہوگئی۔ تو مَیں طفلانہ خوشی اور غرور سے پھولی نہ سمائی
مَیں بھاگ کر بالاخانے پر سے اماں جان کے پاس نیچے
اُتر گئی۔ اور اپنا ہاتھ اُٹھا کر گڑیا کے ہجے کئے۔ مَیں یہ
نہیں جانتی تھی کہ مَیں کسی لفظ کا ہجا کر رہی ہوں۔ اور الفاظ
کی بھی کوئی ہستی ہے۔ مَیں تو فقط بندر کی طرح نقل کر رہی
تھی۔ اور اپنی اُنگلیوں کو چلائے جا رہی تھی۔ بعد کے ایام
میں مَیں نے اسی طرح نافہمی کی حالت میں بہت سے
الفاظ جیسے سوئی، ٹوپی، پیالہ اور بعض افعال مثلاً بیٹھو،
کھڑے ہو، چلو، کا ہجا کرنا سیکھ لیا۔ لیکن اس بات کو
سمجھنے کے لئے کہ ہر شے کا ایک جُداگانہ نام ہوتا ہے۔
اُستانی صاحبہ کو کئی ہفتے صرف کرنے پڑے۔

ایک دن جبکہ مَیں اپنی نئی گڑیا سے کھیل رہی
تھی۔ اُستانی صاحبہ نے چیتھڑوں والی گڑیا بھی میری گود
میں دیدی۔ اور لفظ گڑیا کا ہجا کر کے مجھے یہ سمجھانے کی
کوشش کی کہ دونوں کو گڑیا کہتے ہیں۔ اسی روز سویرے
ہی سے ہم دونوں لوٹا اور پانی پر بحث کرتی اور سر مارتی
رہیں۔ اُستانی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ
کہ لوٹا اور شے ہے اور پانی اور شے۔ لیکن میں ان دونوں
کو خلط ملط کرتی رہی۔ مایوس ہو کر اُنہوں نے اس مضمون کو
کسی اور موقع پر اُٹھا رکھا۔ اور جب اُنہوں نے بار بار
اس تفاوت کے سمجھانے کی کوشش کی تو مَیں اس سے
اُکتا گئی۔ تنگ آکر مَیں نے نئی گڑیا کو پکڑا اور فرش پر دے مارا
جب اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور میرے پاؤں میں
لگے۔ تو مَیں اس حرکت سے بہت خوش ہوئی۔ غصّے کی
اس مجنونانہ حرکت سے نہ تو مجھے کچھ افسوس ہوا۔ اور نہ
پشیمانی۔ میری اس خاموش اور تاریک دُنیا میں کسی گہرے
تاثر یا شفقت اور ملائمت کو دخل نہ تھا۔ مجھے ایسا معلوم
ہوا۔ کہ اُستانی صاحبہ نے ان ٹکڑوں کو چولھے کے ایک
طرف جھاڑو سے اکٹھا کر کے رکھ دیا ہے۔ اور مجھے اس
سے ایک گونہ اطمینان ہوگیا۔ کہ وہ شے جو میری بے چینی
کا موجب تھی۔ مجھ سے الگ کر دی گئی ہے۔ اُنہوں نے
میری ٹوپی لا کر دی۔ اور مَیں سمجھ گئی کہ وہ مجھے باہر دھوپ
تاپنے کے لئے لے جا رہی ہیں۔ اس خیال سے (اگر
ایک ناقابلِ بیان حس کو خیال کہا جا سکتا ہے) میں
خوشی کے مارے اُچھلنے لگی۔

ہنی سکل کی خوشبو کی کشش سے جو کنوئیں والے مکان کے اردگرد چھایا ہوا تھا۔ ہم نے کنوئیں کی راہ لی۔ وہاں کوئی شخص پانی کھینچ رہا تھا۔ جھٹ استانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر نل کے نیچے رکھدیا۔ جونہی میرے ہاتھ پر پانی گرنے لگا۔ انہوں نے میرے دوسرے ہاتھ پر لفظ "پانی" کا ہجا پہلے آہستگی سے اور پھر جلدی جلدی کر دیا۔ میں اس اثناء میں خاموش کھڑی رہی۔ اور میری تمام توجہ ان کی انگلیوں کی حرکات پر جمی رہی۔ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی بھولی بسری شے کی دھندلی سی یاد دل میں آرہی ہے۔ ایک خیال بازگشت کی لہر کا دوڑتا تھا کہ زبان کا راز مجھ پر عیاں ہو گیا۔ مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ پانی اس عجیب وغریب ٹھنڈی شے کا نام ہے جو میرے ہاتھ پر بہ رہی ہے۔ اس زندہ لفظ کی حقیقت نے میری رُوح کو بیدار کیا اور اسے امید، خوشی اور روشنی سے منوّر کر کے آزاد کر دیا۔ گو ابھی اس آزادی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل تھیں لیکن وقت ان سب کو دُور ہٹا دینے والا تھا۔

میں کنوئیں والے مکان سے علم حاصل کرنے کے شوق میں خوشی خوشی روانہ ہوئی۔ آہا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہر شے اپنا ایک مستقل اور جداگانہ نام رکھتی ہے اور مجھے ہر ایک نئے نام سے ایک نیا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم کھڑکی کی طرف لوٹے تو مجھے ہر شے میں جسے میں چھوتی تھی زندگی کی لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اب میں ہر چیز کو اس نرالی اور نئی روشنی کے ساتھ دیکھ رہی تھی جو مجھ کو ابھی ابھی پہنچی تھی۔ دروازہ میں سے گزرتے ہی مجھے اپنی وہ گڑیا یاد آئی۔ جسے میں نے توڑ ڈالا تھا۔ میں راستہ ٹٹول کر چولھے تک گئی۔ اور میں نے شکستہ ٹکڑوں کو جمع کر کے انہیں جوڑنے کی ناکام کوشش شروع کی۔ تب میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیونکہ اب مجھے اپنی کرتوت معلوم ہوئی۔ اور اپنی عمر میں پہلی مرتبہ مجھے پشیمانی اور تاسف کا احساس ہوا۔

اس دن میں نے بہت سے نئے الفاظ سیکھے مجھے تمام کے تمام تو یاد نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ میں ماں۔ باپ۔ بہن۔ اُستانی ضرور تھے۔ یہی وہ لفظ ہیں جن کے ذریعے دنیا نئی نویلی اور شگوفوں اور پھولوں سے لدی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اس اہم دن کو شام کے وقت جب میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی دن بھر کے پُر لطف مشاہدوں کا تصوّر کر رہی تھی۔ اور پہلی مرتبہ اُس چیز کی خواہشمند ہوئی کہ جلد صبح ہو تو میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت مجھ سے بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی بچہ خوش وخرم اور شاداں ہوگا۔

پانچواں باب

مظاہر قدرت کی سیر

میری رُوح کی اس اچانک بیداری کے سبب مجھے بہت سے واقعات یاد ہیں۔ جو ۱۸۸۷ء کے موسم سرما کے بعد پیش آئے۔ میرا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مَیں ہر شے کو چھو کر اُس کا نام یاد کر لیتی۔ اور مَیں جسقدر زیادہ اشیا ہاتھ میں لیکر ان کا نام اور استعمال سیکھتی تھی اسی قدر بیرونی دُنیا کے ساتھ میرے تعلقاتِ احساس زیادہ پُر لطف اور مستقل ہوتے جا رہے تھے۔

جب سُورج مکھی اور سفید گیندے کے پھُول کھلنے لگے۔ تو مس سلیون میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ان کھیتوں میں سے جہاں لوگ زمین میں بیج بونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دریائے ٹینیسی کے کنارے پر لے گئیں۔ یہاں گرما گرم گھاس پر بیٹھ کر مجھے قدرت کی فیاضی کا پہلا سبق حاصل ہُوا۔ مجھے یہ علم ہُوا کہ سُورج اور مینہ کی برکت سے ہر ایک درخت اور سبزی ترکاری، جو آنکھ کو بھلی معلوم ہوتی۔ اور خوراک کے لئے موزوں ہے۔ زمین میں سے اُگتی ہے۔ پرندے اپنا گھونسلا بناتے ہیں۔ اور ایک مُلک سے لیکر دوسری سرزمین تک زندہ رہتے اور پھلتے پھُولتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا، کہ گلہری، ہرن، شیر اور ہر ایک جانور اپنے لئے خوراک اور جائے پناہ حاصل کرتا ہے۔ اشیاء کے علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مجھے اس دُنیا کی لذّت اور مسرت زیادہ ہی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ اس سے بہت عرصہ پیشتر جبکہ مَیں نے حساب کے سوال نکالنا یا زمین کی شکل کو بیان کرنا سیکھا تھا۔ مس سلیون صاحبہ مجھے خوشبودار جنگلوں، گھاس کی پتّیوں، یہانتک کہ میری ننّھی سی بہن کے ہاتھوں کے خوشنما گڑھوں اور لکیروں کے حُسن کو پرکھنا سکھا چکی تھیں۔ اُنہوں نے میرے ابتدائی خیالات کا رشتہ، قدرت کی نیرنگیوں کے ساتھ جوڑ کر مجھے محسوس کرا دیا تھا۔ کہ تمام پھُول اور پرندے میرے دامانِ ہستی کے ساتھ وابستۂ الفت ہیں۔

لیکن اسی زمانہ میں مجھے یہ تجربہ بھی ہُوا کہ قدرت ہر وقت مہربان اور ملتفت نہیں رہتی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اور اُستانی دونوں ایک لمبی سیر کے بعد لوٹ کر گھر آ رہی تھیں۔ یہ ایک سہانی صبح تھی۔ لیکن ہماری واپسی پر موسم بہت گرم ہونے لگا۔ ہوا کے بند ہونے سے دم گھٹتا تھا۔ ہم نے راستے میں دو تین مرتبہ درختوں کے نیچے آرام کیا۔ اور ہماری آخری آرامگاہ گھر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک جنگلی شفتالو کا درخت تھا۔ اس درخت کا سایہ نہایت دلخوش کن تھا۔ اس پر چڑھنا ایسا آسان

معلوم ہوتا تھا کہ مَیں اُستانی صاحبہ کی مدد سے کھسک کر ایک نشست پر جا بیٹھی۔ یہاں ہوا خوب ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ اُستانی جی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم دوپہر کا کھانا وہیں بیٹھ کر کھائیں۔ مَیں نے نچلے بیٹھے رہنے کا اقرار کیا۔ اور اُستانی صاحبہ کھانا لانے کے لئے گھر کو روانہ ہوئیں۔

اتنے میں یکایک درخت پر ایک انقلاب آیا۔ یعنی سُورج کی تمام حرارت ہوا سے مفقود ہو گئی مَیں نے سمجھ لیا کہ آسمان تیرہ و تار ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ تمام حرارت جو مجھے روشنی کا کام دے رہی تھی۔ کرّہ ہوائی سے بالکل غائب ہو گئی۔ اس وقت زمین میں سے ایک عجیب طرح کی بُو آنے لگی۔ مَیں سمجھتی تھی کہ یہ بُو وُہی ہے جو ہمیشہ طوفان سے پیشتر آیا کرتی ہے۔ پس میرے دل پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو گیا۔ مَیں نے اپنے آپ کو عزیزوں، حتےٰ کہ خُدا کی بنائی ہُوئی مضبوط زمین تک سے جدا اور الگ تھلگ پا کر اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ ایک نامعلوم وسیع دُنیا مجھے اپنے اندر لپیٹے ہُوئے تھی۔ مَیں سراپا انتظار اور خاموش تھی۔ اور خوف کے مارے مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ کاش کہ اُستانی جلد لوٹ آئیں! اس سے بڑھ کر میری خواہش یہ تھی کہ مَیں کسی طرح درخت سے نیچے اُتر وں لمحہ بھر تو ایک منحوس اور ناگوار سنّاٹے میں گُزرا لیکن پھر یکایک

درختوں کے پتّوں میں سرسراہٹ شروع ہُوئی۔ درخت کے اندر ایک تھرتھراہٹ سی کوندگئی۔ اور ایک ایسا تیز جھونکا چلا کہ اگر مَیں اپنی تمام طاقت سے درخت کی شاخ کے ساتھ چمٹی نہ رہتی۔ تو ہوا مجھے نیچے دے مارتی۔ درخت آگے پیچھے جھُومنے اور خم کھانے لگا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ٹُوٹ کر گرنے لگیں۔ نیچے چھلانگ مارنے کی ایک وحشیانہ خواہش نے میرے دِل پر قبضہ کر لیا لیکن دہشت نے مجھے بچاتے رکھا۔ مَیں ٹہنی کے نیچے دبک گئی میرے اردگرد کی شاخیں ہوا کے زور سے مجھے کوڑے مار رہی تھیں۔ اور مجھے ٹھیر ٹھیر کر ایک قسم کی کڑکڑاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ کہ گویا کوئی وزنی شے ٹوٹ کر گر رہی ہے یہ دھماکا آہستہ سے درخت کی اس ٹہنی تک پُہنچا جہاں مَیں بیٹھی تھی۔ اس سے میری تشویش انتہا درجے تک پُہنچ گئی۔ مَیں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بس اب درخت مجھے لے گریگا، کہ اتنے میں اُستانی صاحبہ نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اُتار دیا۔ اس وقت مَیں ان کے ساتھ چمٹ گئی اور اپنے پاؤں دوبارہ زمین پر پا کر خوشی کے مارے کانپنے لگی۔ مجھے ایک نیا سبق حاصل ہُوا۔ یعنی یہ کہ قدرت اپنے بچّوں کے ساتھ بعض دفعہ کھُلم کھُلا لڑائی کرتی ہے۔ اور اس کے نرم نرم پنجوں کے اندر بیرحمی کے ناخن بھی پنہاں ہیں اس مشاہدے کے بعد مدت تک کسی درخت پر

نہیں چڑھی۔ کیونکہ اسکے خیال ہی سے میری رُوح فنا ہونے لگتی تھی۔ لیکن بالآخر چھوئی موئی کے ایک درخت کی دلآویزی نے جبکہ وہ عالم شباب میں اپنی پُوری بہار دکھا رہا تھا میرے اس خوف کو دُور کر دیا۔ موسمِ بہار کی ایک دلفزا صبح کو جبکہ مَیں باغ کی بارہ دری میں تنہا بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ مجھے ایک نادر اور لطیف خوشبو آنے لگی۔ مَیں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور بلا سوچے سمجھے مَیں نے اپنے ہاتھ پھیلا دِئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا موسم بہار کی رُوح پھلواڑی میں حلول کر گئی ہے۔ مَیں نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کہ "یہ کونسی خوشبو ہے؟" فی الفور مجھے معلوم ہُوا کہ چھُوئی موئی کے شگوفے اپنی بہار دے رہے ہیں۔ مَیں راستہ ٹٹول کر باغ کے سرے تک پُہنچی۔ اور مَیں نے چھُوئی موئی کا درخت راستہ کے موڑ پر باڑ کے نزدیک کھڑا پایا۔ یہ درخت گرما دینے والی دُھوپ کی روشنی میں جھُوم رہا تھا۔ اور اُس کی شگوفوں سے بھری ہُوئی ٹہنیاں جُھک جُھک کر لمبی گھاس سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ سبحان اللہ! مجھے دُنیا میں اس درخت سے بڑھ کر نفیس اور بہار آفریں چیز پہلے کبھی معلوم نہیں ہُوئی تھی۔ اس کی نرم نرم پتّیاں ذرا سے چھونے پر کیا پژمردہ سی ہو جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا باغِ جنّت کا درخت زمین پر اُتار دیا گیا ہے۔ مَیں نرم پنکھڑیوں کے ایک جھنڈ میں سے گُزر کر اسکے بڑے تنے تک پُہنچی۔ اور لحظہ بھر تو سوچ بچار اور دو دلی کی حالت میں رہی۔ پھر حوصلہ کر کے مَیں نے اپنا قدم شاخوں کی درمیانی فراخ جگہ پر رکھا۔ اور اُچک کر درخت پر چڑھ گئی۔ مجھے اپنی گرفت قائم کرنے میں کچھ وقت محسوس ہُوئی۔ کیونکہ شاخیں بڑی بڑی تھیں۔ اور اُن کی چھال ہاتھ کو چبھتی تھی لیکن میرے دِل میں ایک پُر لطف خیال یہ تھا کہ مَیں ایک غیر معمولی اور عجیب و غریب کرتب کر رہی ہوں۔ پس اس خیال سے مَیں بلندی پر چڑھتی گئی۔ حتٰے کہ ایک چھوٹی سی نشست پر پُہنچی۔ جو کسی شخص نے اتنی مُدّت سے وہاں بنا رکھی تھی۔ کہ وہ درخت کا جزو بن گئی تھی۔ مَیں وہاں بہت دیر تک بیٹھی رہی اور اپنے آپ کو ایک پری کی مانند تصوّر کر رہی تھی۔ جو کسی گلابی رنگ کے بادل پر سوار ہو کر اُڑ رہی ہو۔ اس کے بعد مَیں نے بہت سے مسرت کے اوقات اپنے اس بہشتی درخت پر بسر کئے۔ ان اوقات میں مجھے اکثر دلخوش کن خیالات اور چمکیلے خواب آیا کرتے تھے۔

چھٹا باب

تصورات مجردہ

اب میرے پاس تمام زبان کی کُنجی موجود تھی جسے مَیں استعمال کرنے کی شائق ہو رہی تھی۔ جو بچّے کان رکھتے اور سُن سکتے ہیں۔ وہ کسی خاص جدو جہد کے بغیر آسانی سے

کوئی زبان سیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ جو الفاظ دوسروں کے مُنہ سے نکلتے ہیں وہ انہیں جھٹ اُچک کر خوشی خوشی حفظ یا ضبط کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک نابینا بہرا بچّہ انہیں ایک سُست رفتار اور بسا اوقات تکلیف دہ عمل ہی سے حاصل کر سکیگا۔ لیکن عمل خواہ کوئی بھی اختیار کیا جائے۔ اس کا نتیجہ ضرور حیرت انگیز ہوگا۔ چنانچہ ہم اپنا علمی سفر کسی شے کا نام سیکھنے سے شروع کرتے ہیں۔ اور بتدریج قدم بقدم ترقی کر کے ایک ایسی منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ جہاں ہم نے زبان کے اس فاصلہ کو طے کر لیا ہوتا ہے۔ جو ہمارے پہلے ٹوٹے پھوٹے تلفظ سے لیکر شیکسپیئر کے کسی مصرع کے بیدا کئے ہوئے خیال تک حاوی ہوتا ہے۔

پہلے پہل جبکہ میری اُستانی مجھے کسی نئی چیز کے متعلق کچھ بتاتی تھیں۔ تو میں بہت کم سوالات پوچھتی تھی۔ میرے خیالات غیر معین اور ذخیرۂ لغات ناکافی تھا لیکن جوں جوں اشیاء کے متعلق میری واقفیت بڑھی اور میں نے الفاظ کو زیادہ تعداد میں سیکھنا شروع کیا تو میرا میدانِ تجسس وسیع تر ہوگیا۔ اور میں مزید واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے بار بار ایک ہی مضمون کی طرف لوٹتی تھی۔ بعض اوقات کوئی نیا لفظ کسی ایسے بیان کو تازہ کر دیتا۔ جسے کسی ابتدائی مشاہدے

نے میرے ذہن میں منقّش کیا ہوتا تھا۔

مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے۔ جبکہ میں نے پہلی مرتبہ لفظ "محبّت" کے معنی دریافت کئے۔ اور یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ ابھی میں نے بہت سے الفاظ کا مطلب نہیں سیکھا تھا۔ ایک دن مجھے باغ میں ابتدائی موسم کے کچھ بنفشہ کے پھول ملے۔ میں انہیں اُٹھا کر اپنی اُستانی کے پاس لے آئی۔ اُنھوں نے مجھے فرطِ محبّت سے چومنے کی کوشش کی لیکن اس زمانے میں مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ مجھے امّاں جان کے سوا کوئی اور شخص پیار کرے۔ مس سلیون صاحبہ نے لطف و کرم سے اپنی باہیں میرے ارد گرد ڈال دیں۔ اور ہاتھ پر اس فقرہ کا ہجّا کیا۔ "میں ہیلن سے محبّت کرتی ہوں۔" میں نے دریافت کیا "محبّت کیا ہوتی ہے۔" اس پر اُستانی صاحبہ نے مجھے اپنے نزدیک کھینچا۔ اور میرے دل پر اُنگلی لگا کر کہا۔ "محبّت یہاں ہوتی ہے۔" مجھے اپنے دل کی دھڑکن سے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی۔ اُن کے الفاظ سے مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا۔ تاوقتیکہ میں نے اپنے دل کو نہیں چھوا۔

میں نے ان کے ہاتھ میں لئے ہوئے بنفشہ کے پھولوں کو سونگھ کر کچھ اشاروں میں اور کچھ الفاظ کی مدد سے ایک سوال کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "کیا محبت پھولوں

کی شیرینی کو کہتے ہیں؟" اُستانی نے نفی میں جواب دیا۔ مَیں پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اس وقت آفتاب ہم پر اپنی تمام آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مَیں نے آسمان کی اس سمت کی طرف جو حرارت کا سرچشمہ تھی اشارہ کرتے ہُوئے پھر سوال کیا۔ "کیا وہ محبت نہیں ہے؟" کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ سُورج سے بڑھ کر جس کی حرارت سے تمام اشیا نمو حاصل کرتی ہیں۔ کوئی شے خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اُستانی نے پھر بھی اپنا سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ جس سے مجھے بیحد حیرت اور مایوسی ہُوئی۔ مجھے اس سے نہایت تعجب ہُوا۔ کہ میری اُستانی مجھے محبت جیسی شے نہیں دکھا سکتیں!

اس کے ایک دو روز بعد مَیں چھوٹی بڑی مختلف قسم کی گولیوں کو ایک خاص قرینے کے ساتھ دھاگے میں پرو رہی تھی۔ ترتیب یہ تھی کہ دو بڑی گولیوں کے بعد دو چھوٹی گولیاں پروئی جائیں۔ مَیں بہت سی غلطیاں کرتی جاتی تھی اور اُستانی نہایت صبر و تحمّل کے ساتھ بار بار میری درستی کرتی جاتی تھیں۔ بالآخر مجھے اپنی اس ترتیب میں ایک نمایاں غلطی کا احساس ہُوا۔ اور لحظہ بھر کے لئے مَیں نے اپنے سبق پر متوجہ ہو کر یہ سوچنے کی کوشش کی۔ کہ مجھے گولیوں کو کیونکر ترتیب دینا چاہئے تھا۔ اُستانی جی نے میری پیشانی کو چھو کر خاص زور دیکر لفظ "سوچ" کا ہجّا کیا۔ فی الفور مجھے معلوم ہُوا۔ کہ یہ لفظ اس عمل کا نام ہے جو اس وقت میرے ذہن میں ہو رہا تھا۔ تصوّرِ مجرد کے متعلق میرا یہ پہلا وجدانی ادراک تھا۔

مَیں دیر تک خاموش رہی۔ کیونکہ میری توجہ رنگین گولیوں سے ہٹ کر اس نئے تصوّر کی روشنی میں لفظ محبت کے معنی معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اُس دن مطلع ابر آلود رہا۔ اور کچھ کچھ دیر کے بعد ہلکا ترشح ہو جاتا تھا۔ لیکن جب یکایک سُورج اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ نمودار ہُوا تو مَیں نے پھر اُستانی سے سوال کیا۔ "کیا یہ (سورج) محبّت نہیں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "محبت ان بادلوں سے کچھ کچھ مشابہ ہے، جو سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر چھا رہے ہیں۔ اس کے بعد سادہ اور آسان الفاظ میں جنہیں مَیں اس وقت سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اُنھوں نے یوں تشریح کی۔ "تم بادلوں کو چھو نہیں سکتی ہو۔ ہے نا؟ لیکن تم بارش کو محسوس کر سکتی ہو۔ اور جانتی ہو کہ پھول اور پیاسی زمین گرمی کے بعد بارش سے کسقدر محظوظ ہوتے ہونگے۔ اسی طرح تم محبت کو بھی چھو نہیں سکتی ہو۔ لیکن تم اس کی حلاوت اور شیرینی کو جو اس کی وجہ سے ہر شے میں پائی جاتی ہے محسوس کرتی ہو یا نہیں؟ محبت کے بغیر تم خوش نہیں رہ سکتی ہو اور نہ کھیلنا پسند کرتی ہو۔"

اب یہ دلآویز حقیقت مجھ پر عیاں ہوتی ہیں نے محسوس کیا۔ کہ میری اور دوسری روحوں کے درمیان ایسے خطوط کھنچے ہوتے ہیں۔ جو آنکھوں سے اوجھل ہیں۔

میری تعلیم کی ابتداہی سے مس سلیون صاحبہ نے یہ رویّہ جاری رکھا۔ کہ وہ مجھ سے ایسے انداز میں کلام کیا کرتی تھیں کہ گویا وہ کسی سُننے والے بچّے کے ساتھ بول رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مُنہ سے بولنے کی بجائے وہ جملوں کا ہجا میرے ہاتھوں پر کیا کرتی تھیں اگر مجھے ان الفاظ اور محاورات کا علم نہیں ہوتا تھا جو میرے خیالات کے اظہار کے لئے ضروری تھے، تو وہ خود انہیں مہیّا کر دیتی تھیں۔ حتّے کہ جب میں اپنی گفتگو کو انجام تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ تو وہ خود اس کا اشارہ کر دیتی تھیں۔ جس سے مدعائے کلام طے ہو جاتا تھا۔

یہ عمل چند برس تک جاری رہا۔ اور ضروری تھا کہ جاری رہے۔ کیونکہ روزانہ نہایت معمولی میل جول میں بھی جو کئی ایک محاورات اور جملات استعمال ہوتے ہیں انہیں ایک بہرا بچّہ مہینہ بھر میں نہیں سیکھ سکتا جو ننھّا بچّہ سُن سکتا ہے۔ وہ انہیں پے در پے دہرانے اور نقل کرنے سے بآسانی سیکھ لیتا ہے۔ جو گفتگو وہ اپنے گھر میں سُنتا ہے۔ وہ اس کے ذہن میں ایک تحریک اور ہیجان پیدا کئے رکھتی ہے۔ اور اس مختلف مضامین کا اشارہ ملتا رہتا ہے۔ اسی سے اس کے خیالات کا اظہار خود بخود ہوتا رہتا ہے لیکن بہرے بچّے کو یہ قدرتی تبادلۂ خیالات میسر نہیں۔ میری اُستانی نے یہ بخوبی معلوم کر لیا تھا۔ اور اُنہوں نے مختلف محرکات، جن سے بے بہرہ تھی۔ مہیّا کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ یہ اس طرح کہ حتے الامکان وہ جو کچھ سُنتی تھیں اسے زبانی بار بار دُہراتی تھیں۔ اور مجھے گفتگو میں حصّہ لینے کا طریق بتاتی تھیں۔ لیکن ابھی بولنے کی جرأت کرنے میں بہت عرصہ باقی تھا۔ اور مناسب وقت پر میرے درست کلام کرنے میں اس سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔

اندھوں اور بہروں کے لئے گفتگو کی خوبیوں کا سمجھنا از حد دشوار ہے۔ یہ دِقّت اُن کے لئے کسقدر زیادہ ہوتی ہوگی۔ جو بیک وقت اندھے ہونے کے علاوہ بہرے بھی ہوں۔ وہ آواز اور لب ولہجہ کی تمیز نہیں کر سکتے۔ اور نہ کسی مدد کے بغیر تمام قسم کے لہجوں کی شناخت کر سکتے ہیں۔ جن سے الفاظ بامعنی ہو جاتے ہیں۔ اور نہ وہ کلام کرنے والے کے چہرے کے اظہار کو دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات ایک ہی نظر کسی شخص کے کلام کی روح ہوتی ہے اور اسکے مدعا کو ظاہر کر دیتی ہے۔

(باقی پھر) خادم محی الدین

غزلیات

(۱)

مرے ماتم میں اُس زلفِ پریشاں کا بکھر جانا
مری بگڑی ہوئی قسمت کا گویا تھا سنور جانا

نگاہِ لطف کی امید میں جیتا ہوں برسوں سے
کہ مَیں نے رشتۂ ہستی کو بھی تارِ نظر جانا

ملی آ کر جو بیباکانہ میری چشمِ حیراں سے
مجھے پہلے ہی سے اس کی نظر نے بیخبر جانا

تمنّا نے لگا رکھا تو مجھ کو دشتِ حسرت میں
اسی کو خضر سمجھا اور اسی کو راہبر جانا

اسی احساس نے زندہ مجھے رکھا محبت میں
کہ شامِ وعدہ کو مَیں نے تمنّا کی سحر جانا

مری بزمِ عزا سے ان کو کیا نقصان پہنچیگا
تری زلفوں کو آتا ہے بگڑ کر بھی سنور جانا

تعجب کیا اگر پیمانۂ رنج و الم چھلکا
کسی دن اس دلِ بیتاب کا لازم تھا بھر جانا

قیامت تھا بھری محفل میں اُس چشمِ فسونگر کا
نگاہیں اہلِ محفل کی بچا کر کام کر جانا

محبت میں اسے مَیں رشکِ صد راحت سمجھتا ہوں
مری تکلیف کو تو نے کہاں اے چارہ گر جانا

ہمیشہ چشمِ فتاں اک نیا پیغام لاتی ہے
کبھی تو دل بڑھا دینا کبھی مایوس کر جانا

چھلک کر دامنِ امید کو رنگیں بنا دے گا
نہیں بیکار ہادیؔ ساغرِ حسرت کا بھر جانا

---

(۲)

وہ کہتے ہیں اگر منظور ہو فرقت میں مر جانا
تو اک دن میری تیغِ ناز کے صدقے اُتر جانا

محبّت چیز کیا ہے مَیں نے کب اے چشمِ تر جانا
کبھی دردِ نہاں سمجھا کبھی سوزِ جگر جانا

غنیمت ہو گیا پیمانۂ ہستی کا بھر جانا
بہت اچھا ہوا میرے لئے فرقت میں مر جانا

نگاہِ شوق میں اس وقت تک کیا کیا نہیں کھٹکا
تری راہِ محبت میں مرا یوں بے خبر جانا

تری بے عہدیوں کا راز طشت از بام کرتا ہے
نگاہِ ناز کا یوں پردۂ دل سے گزر جانا

ہمارے دیدۂ تر کی بدولت اے غمِ ہجراں
مبارک موتیوں سے ہو ترے دامن کا بھر جانا

کبھی موقع دیا اس نے نہ اظہار تمنّا کا
ہمیشہ شوق کا اس نے مجھے دریوزہ گر جانا

مجھے اب زندگی بیکار سی معلوم ہوتی ہے
قیامت ہو گیا ہے نشۂ غم کا اُتر جانا

کہیں ایسا نہ ہو بن نیم بسمل ہو کے رہ جاؤں
اجل اس کی اداؤں پر کہیں تو بھی نہ مرجانا

ہُوتے جاتے ہیں قائل وہ بھی ہادی جذبِ اُلفت کے
جنھوں نے میری آہوں کو ہمیشہ بے اثر جانا

ہادی مچھلی شہری

حُسنِ ازل

شباب گل کے دن تھے جوشِ ایّامِ بہاراں تھا
جمالِ ماہ وقفِ بارشِ انوار عریاں تھا

بلائیں لے رہے تھے لالہ و گل سروِ رعنا کی
گلستاں جس سے صورت خانۂ بزمِ چراغاں تھا

تعجب کیا ؟ گماں گر سرو پر ہوتا تھا طوبےٰ کا
ہوا کے چھیڑنے سے جھومتا تھا نغمہ سنجاں تھا

صبا کیا تھی ؟ ہوا دی جارہی تھی آذرستاں کو
کہ پتّہ پتّہ عکسِ آتشِ گل سے فروزاں تھا

ستاروں نے رقابت کی نظر اس بزم پر ڈالی
کہ نورِ ماہ اک اک قطرۂ شبنم میں رقصاں تھا

وہ ڈر تھا جوشِ طوفانِ فروغِ ماہ کا اُس کو
کہ زیرِ دامنِ اشجارِ پنہاں پر توستاں تھا

صدائے خندۂ گل سے چمن میں گونج پیدا تھی
نثار اس بزمِ عشرت پر بہارستانِ رضواں تھا

یکایک مجھ پہ نرگس نے تحیّر کی نظر ڈالی
مَیں اس بزمِ مسرت میں بھی وقفِ یاس و حرماں تھا

مجھے حسنِ ازل کی جستجو بیتاب رکھتی ہے
بقدرِ ظرف کب رنگِ بہارِ باغِ رضواں تھا

حامد علی خاں

ہمنام کی جستجو

یوں تو وقوعہ خود ہی عجیب ہے۔ پھر اس کے متضاد اجزا کا باہمی امتزاج اسے عجیب تر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ کہ ایک غریب اس فریب میں مبتلا ہو کر اپنی فہم و فراست سے ہاتھ دھوتے آج تنکے چن رہا ہے۔ اور ایک قانونی شکنجہ میں پھنس کر اپنی زندگی محبوس زندان ہو کر بسر کر رہا ہے۔ تو میرا خون ابلنے لگتا ہے۔

ہومس کا اپنے فرصت کے زمانہ میں یہ معمول تھا کہ وہ کئی دنوں تک اپنی خوابگاہ سے باہر نہ نکلتا۔ چنانچہ کئی دنوں کے بعد ایک روز وہ صبح کو اپنے ہاتھ میں ایک دستاویز لئے ہوئے اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "لیجئے ڈاکٹر صاحب لیجئے!! موقع ہے اور خوب ہاتھ آیا ہے۔ کچھ کما لیجئے ہاں! آپ نے گیرڈب کا نام بھی کبھی سنا ہے یا نہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ میں نے تو یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

"اجی اگر یہ شخص مل گیا تو پھر کیا ہے۔ روپیہ ہی روپیہ لیجئے نا!"

"آخر؟"

"یہ قصہ طویل بھی ہے اور عجیب بھی لیکن میں یہ ضرور کہونگا۔ کہ انسانی فطرت کی پردہ کشائی میں اس سے قبل ہمیں کبھی ایسے واقعہ سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ وقوعہ اپنی ندرت اور نوعیت کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔ وہ شخص ابھی ملنے اور کچھ زبانی گفتگو کرنے کیلئے آنیوالا ہے۔ اس سے ملاقات ہونے سے پہلے میں اس کے متعلق اور کچھ نہ کہونگا بہرحال اس کا نام گیرڈب ہے۔"

ٹیلیفون کی ڈائرکٹری میرے سامنے کھلی ہوئی رکھی تھی۔ اور میں ناامیدی سے اس عجیب نام کی تلاش میں مصروف تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اپنے موقع پر یہ نام موجود ہے۔ تو میرے استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہگئی۔ اور میں اپنی اس کامیابی پر خوشی سے چلا اٹھا۔

"لیجئے! نام تو یہ موجود ہے۔"

ہومس نے ڈائرکٹری میرے ہاتھ سے لے لی۔

اور پڑھا۔ " گیرڈب این ٹسل رائیڈر اسٹریٹ ڈبلو"
اور کہنے لگا۔ " یہ تو اُس شخص کا پتہ ہے جس کا آج
خط آیا ہے۔ ہمیں تو اسی نام کے دوسرے شخص
کی ضرورت ہے۔"

اتنے میں مسز ہڈسن طشت پر ایک ملاقاتی
کارڈ لئے ہوئے اندر آئی۔ میں نے کارڈ اٹھا لیا۔
دیکھا اور خوش ہو کر کہا۔ " لیجئے! وہ بھی آگیا۔ یہ دوسرا
شخص ہے۔ اس کا نام جان گیرڈب ہے۔ اور
پتہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کاؤنسلر اٹ لا۔ مورویل کن
ساس۔ یو۔ ایس۔ اے۔"

ہومس کارڈ دیکھ کر مسکرا دیا اور مجھے واپس
دیکر کہنے لگا۔ " آپ پھر دیکھتے یہ شخص بھی اس سازش میں
شریک ہے۔ مجھے تو بالکل ہی امید نہ تھی۔ کہ وہ آج ہی مجھ سے
ملیگا۔ بہرکیف اس سے بہت سی دریافت طلب باتیں
حل ہو جائینگی۔"

اتنے میں وہ شخص ہمارے کمرے میں داخل
ہوا پستہ قد گٹھیلا جسم۔ گول چہرہ۔ ڈاڑھی مونچھ صاف
بشرہ سے گمان ہوتا تھا کہ کوئی کاروباری امریکن ہے
مجموعی حیثیت سے ہم اسے ایک شگفتہ رو شخص کہہ سکتے
ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی۔ اور
غیر معمولی چمک، جس کے ہر تغیر پر اس کے خیالات کی
تبدیلیوں کا پتہ لگتا تھا۔ لب و لہجہ امریکن لیکن اتنا
کرخت نہیں، جتنا کہ امریکنوں کا ہوا کرتا ہے۔

آتے ہی دریافت کیا۔ " مسٹر ہومس کون ہیں؟"
پھر دیکھ کر کہنے لگا۔ " خوب آپ کی تصویریں اور
آپ کے چہرہ میں ذرا سا بھی فرق نہیں۔ ہاں تو غالباً
میرے نام کا آپ کو ایک خط ملا ہوگا۔ یعنی نیتھن
گیرڈب کا؟"

ہومس نے جواب دیا " تشریف رکھئے" اور
دستاویز اٹھا کر کہنے لگا۔ " ابھی تو آپ سے بہت سی
گفتگو کرنا ہے۔"

" ہومس نے کہا۔ " جان گیرڈب تو یقیناً آپ
ہی ہیں۔ اور اس دستاویز میں بھی آپ ہی کا نام درج
ہے؛ لیکن فی الحقیقت انگلستان میں آپ کا قیام ایک
مدت سے ہے۔"

" یہ آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ کہ میرا قیام یہاں
ایک زمانہ سے ہے۔ مجھے تو آپ کو دیکھتے ہی شبہ
ہوگیا تھا۔"

" جناب والا! آپ سرتاپا انگریزی وضع میں
ہیں۔"

گیرڈب نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور کہا۔
" مسٹر ہومس میں خوب سمجھتا ہوں۔ کہ یہ سب آپ کی

چالاکیاں ہیں لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ آپ مجھی پر وار کر بیٹھیں گے۔ بھلا آپ نے میری کس چیز کو دیکھکر کہا۔ کہ مَیں انگریزی وضع میں ہوں۔"

"آپ کے کوٹ کے مونڈھوں کی قطع اور آپ کے جوتوں کی نوک کو دیکھ کر کسے شُبہ ہو سکتا ہے کہ یہ انگریزی وضع کے نہیں۔"

مجھ کو تو اس کا مطلق خیال ہی نہ تھا کہ میری وضع میں اتنا فرق آگیا ہے۔ کہ مَیں اہل اسلام کے مشابہ ہو گیا ہوں۔ ہاں ضرورت مجھے تھوڑے عرصہ سے یہاں لے آئی ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ اسی کا اثر ہو۔ اس بحث کو چھوڑ دیجئے بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس دستاویز کے متعلق گفتگو کیجئے۔ جو آپکے ہاتھ میں ہے۔"

ہوس نے اپنے اس ملاقاتی کو ایک حد تک پریشان کر دیا۔ جس کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں ہو رہے تھے۔

"مسٹر گیرڈب! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں ذرا صبر کیجئے۔ جلدی کیا ہے؟" ہوس نے نہایت تشفی بخش لہجہ میں کہا۔ "ڈاکٹر واٹسن آپ کو بتا دینگے کہ اصل معاملہ سے میرے اس قسم کے تجاوز آئندہ چلکر اصل معاملہ پر اکثر روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ خیر اب یہ فرمائیے کہ مسٹر نیتھن گیرڈب آپ کے ہمراہ کیوں تشریف نہ لائے؟"

ہمارے ملاقاتی نے غصّہ سے کہا۔ "انہوں نے معلوم نہیں کیوں آپ کو بلا ضرورت اس معاملہ میں شریک کر لیا۔ حالانکہ اس معاملہ سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تو ہم دونوں کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اُنہوں نے خواہ مخواہ آپ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مَیں آج صبح ان سے ملنے گیا۔ اور انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ اور مجھے بیوقوف بنایا۔ یہ سُنکر مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور مَیں یہاں آیا۔"

"مسٹر گیرڈب انہوں نے مجھ کو جو شامل کیا ہے آپ پر بدگمانی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس معاملہ کا حل ہو جائے یہ حل آپ دونوں کے حق میں جسقدر اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ یہ آپ خود ہی سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ یہ جانتے ہیں۔ کہ مجھے ہر قسم کی اطلاعات کی بہم رسانی کے جو ذرائع میسّر ہیں۔ ان سے کامیابی کا جلد یقین ہو سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے امداد طلب کی ہے۔"

"یہ بالکل دوسری بات ہے" اس نے جوابدیا۔ "آج صبح مَیں اسے ملنے گیا تھا۔ اس وقت اُنہوں

نے مجھ سے کہا کہ میں نے ایک سراغرساں کو بلایا ہے۔ میں نے اُن سے آپ کا پتہ دریافت کیا اور آپ سے ملنے آیا۔ ذاتی معاملات میں میں پولیس کی دست اندازی قطعی نہیں چاہتا۔ اگر آپ ہمیں مدد دینا چاہتے ہیں تو صرف اس شخص کا پتہ لگا دیجئے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

"جی ہاں! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" ہومس نے جواب دیا۔" چونکہ آپ خود تشریف لے آئے ہیں اس لئے میں آپ ہی کی زبانی سب کیفیت سُن لوں غالباً آپ کے ہمنام دوست کو تو اس کا مطلق علم نہیں؟"

مسٹر گیرڈب نے مجھ پر شبہ اور اجنبیت کی نگاہ ڈالی۔

"کیا ان کو بھی اس معاملہ کا حال معلوم ہو جانا چاہیئے؟"

"یہ تو میرے شریک کار ہیں۔ اور ہم دونوں ہمیشہ ملکر کام کیا کرتے ہیں۔"

"اب تو رازداری کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ واقعات یہ ہیں سُن لیجئے۔ میں اختصار سے بیان کرتا ہوں۔ اگر آپ کو کنساس سے ذرا بھی تعلق ہے تو یہ بتانا کہ الگزنڈر ہملٹن کون تھا؟ تحصیل حاصل ہے۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ اس نے ایک بہت بڑی جائیداد منقولہ پیدا کی۔ بعد میں شکاگو میں گیہوں کی کھیتی شروع کر دی۔ اور اس میں بھی بہت کمایا۔ اب اس نے اپنا سرمایہ زمین خریدنے میں صرف کر دیا۔ اور ایک علاقہ کا علاقہ خرید لیا۔ یہ زمین قلعہ ڈاج کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا کچھ حصّہ زرخیز ہے۔ اور کچھ معدنی زمین ہے غرضیکہ اسے زر کی کان سمجھئے۔

"نہ تو اس کا کوئی عزیز تھا۔ اور نہ اقارب۔ مگر اُسے اپنے نام کی ندرت پر فخر تھا۔ یہی نام ہم دونوں کی باہمی ملاقات کا باعث ہُوا۔ میں ٹوپیکا میں وکالت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ میں اس کا ہمنام ہوں تو اس پر شادیٔ مرگ طاری ہوگئی۔ اس سے قبل اُسے یقین ہی نہ تھا۔ کہ دُنیا میں اس کے ہمنام بھی موجود ہیں۔ اب تو اُس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا ایک ہمنام اور تلاش کر لوں۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ مجھ کو اپنے مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنا ہمنام تلاش کرتا پھروں۔ اس نے کہا۔ خیر اب تو آپ جو چاہیں اپنی تشفی کے لئے کہہ لیں۔ مگر ایک وقت آئیگا۔ کہ آپ محض اس مقصد سے تمام دُنیا کا طواف کریں گے۔ میں نے اس وقت اس کی باتوں کو مذاق ہی سمجھا تھا۔ لیکن اب مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا

تھا، سچ تھا۔ اور اس کے الفاظ میں صداقت اور حقیقت پنہاں تھی۔

" اس ملاقات اور اس گفتگو کے بعد سال بھر کے اندر ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اپنے انتقال کے وقت اس نے ایک وصیت نامہ تحریر کرایا جسکی جسٹری کنساس میں ہوئی۔ یہ ایک عجیب وصیت نامہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میں اپنے دو ہمنام اور تلاش کر لوں تو اس کی سب جایداد ہم تینوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہو جائیگی۔ اور ہمیں ہر ایک کو پانچ ملین ڈالر کا حصہ ملیگا۔ جب تک ہم تینوں ایک جگہ نہ ہو جائیں مجھ کو کوئی حق نہیں کہ اُس کی جایداد سے ایک حبہ بھی پاؤں۔

" یہ نادر موقع اور منفعت بخش ذریعہ میرے لئے کچھ ایسا جاذب توجہ ہُوا کہ میں نے اپنی وکالت کو خیرباد کہا۔ اور اپنے ہمنام کی جستجو میں مصروف ہو گیا۔ میں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ہر ریاست کو چھان مارا لیکن کہیں کامیابی نہ ہُوئی۔ جب وہاں ناکامیاب ہُوا تو میں نے انگلستان کا رُخ کیا۔ لندن کی ایک ڈائرکٹری میں مجھے ایک نام ملا۔ پرسوں میں اس کے یہاں گیا تھا۔ اس سے تمام واقعات بیان کر دئے وہ بھی تنہا ہے۔ چند عورتیں اس کی رشتہ دار ہیں۔ اُن کے سوا طبقہ ذکور میں اس کا کوئی بھی نہیں۔ وصیت نامے میں تین بالغ مردوں کی شرط ہے۔ اب تو ہم دو ہُوئے پھر بھی ایک کی ضرورت ہے۔ آپ ہمارا ایک ہمنام تلاش کر دیجئے۔ ہم آپ کا حق الخدمت اور تمام مصارف ادا کر دینگے۔"

" واٹسن! آپ نے دیکھا" ہومس نے مُسکرا کر مجھ سے کہا۔" میں نے کہا تھا نا کہ یہ عجیب وہی بات ہے۔" پھر ملاقاتی سے مخاطب ہو کر کہا۔" کیا آپ نے اخباروں میں اس کا اشتہار نہیں دیا؟"

" مسٹر ہومس! میں نے سب کچھ کیا۔ لیکن میرے ایک اشتہار کا بھی جواب نہ آیا۔"

" واقعی یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ اخیر میں فرصت کے وقت اس پر غور کروں گا۔ آپ ٹوپیکا سے تشریف لائے ہیں۔ وہاں مجھ سے اور ایک صاحب سے خط و کتابت تھی۔ ڈاکٹر لائینڈر صاحب جو ۱۸۹۰ء میں وہاں کے میر بلدیہ تھے۔ افسوس کہ اس کا انتقال ہو گیا۔"

" واہ صاحب ان کا کیا کہنا جاتے۔ مرحوم کی یاد اب تک باقی ہے۔ وہ بڑی خوبی کے آدمی تھے۔ ہاں تو مسٹر ہومس اس معاملہ میں جو کچھ بھی کریں۔ اس کی اطلاع آپکو دیتے جائیں۔ غالباً دو ایک دن کے بعد پھر اس کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوگا۔" یہ یقین دلا کر ہمارا امریکن ملاقاتی اُٹھا۔ اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

(۲)

ہومس نے اپنا پائپ سُلگایا۔ اور خوب مزے سے کش پر کش لینے لگا۔ اس کے چہرہ پر عجیب مسکراہٹ تھی۔

"کہئے کیا ہے؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"بھئی! مَیں ابتک حیرت میں ہوں۔ حیرت!"

"یہ حیرت کیسی؟"

ہومس نے اپنے مُنہ سے پائپ علیحدہ کر لیا۔

"واٹسن! مجھے تو یہی تعجب ہے کہ اس شخص نے کیوں ہرزہ گوئی کی۔ اور اس سے اس کا کیا مطلب ہے؛ مَیں نے بھی اسی قسم کی باتیں اس سے دریافت کیں بعض موقعوں پر یہی مناسب ہوتا ہے کہ اس قسم کی دروغ بافیوں کا رد کر کے فوراً ہی حملہ کر دیا جائے۔ اور بعض وقت مناسب موقع کا انتظار کرنا پڑتا ہے مَیں نے عمداً اُسے یہ موقع دیا۔ تاکہ وہ یہ سمجھ لے۔ کہ اس نے ہم کو بیوقوف بنایا ہے۔ یہ شخص اپنا کوٹ کم از کم ایک سال سے استعمال کر رہا ہے۔ اس کے کوٹ کی آستینوں میں کہنی کے قریب کثرت استعمال سے جھول آگیا ہے۔ پتلون بھی گھٹنوں کے پاس جھولدار ہوگیا ہے۔ لیکن اس دستاویز کے مطابق اسکا بیان ہے۔ کہ چند دن ہوتے کہ وہ امریکہ سے لندن آیا ہے

اخباروں میں مَیں نے کوئی اشتہار اس مضمون کا نہیں دیکھا۔ مَیں اخباروں میں ہمیشہ تفحص کے کالم دیکھا کرتا ہوں۔ اور ان سے مجھ کو بہت سی اطلاعات بہم پہنچا کرتی ہیں۔ بھلا یہ کب ممکن تھا کہ مَیں ایسا اشتہار دیکھتا اور اس کے متعلق کوئی کارروائی نہ کرتا۔ مَیں ٹوپیکا کے کسی ڈاکٹر لائسنڈر کو نہیں جانتا۔ مَیں نے اس قسم کی بے بنیاد باتیں محض اس لئے پوچھی تھیں کہ اُس کا جھوٹ کھُل جائے۔ غرضکہ جو کچھ بھی اُس نے کہا سب جھوٹ۔ یہ ضرور ہے کہ وہ امریکہ کا باشندہ ہے لیکن ایک مُدت سے لندن میں قیام پذیر ہے۔ اور اسی طویل قیام کی وجہ سے اس کے لب ولہجہ میں بہت فرق آگیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں ابتک یہ نہ آیا کہ اس لغو اور مہمل ہمنام کی تلاش کی آڑ میں وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ شخص بدمعاش ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ بڑا طباع اور عقلمند بھی ہے۔ اب ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے۔ کہ دوسرے صاحب کس قسم کے ہیں۔ کہیں وہ بھی تو اسی قماش کے نہیں۔ ذرا آپ ٹیلیفون کی گھنٹی تو دیجئے۔"

مَیں نے ٹیلیفون کی گھنٹی دی۔ اور اس کے جواب میں ایک باریک لرزتی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"جی ہاں۔ مَیں ہی نیتھن گیرڈب ہوں۔ کیا آپ مسٹر ہومس ہیں؟ مَیں مسٹر ہومس سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے دوست نے ٹیلیفون کے سننے کا آلہ لے لیا۔ مَیں وہی لرزتی ہُوئی آواز سُنتا رہا۔

"ہاں وہ یہاں آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ غالباً آپ اسے نہیں پہچانتے؟ کب سے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف دو دنوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ جی ہاں یہ بڑی قابلِ توجہ بات ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا آج شام کو آپ گھر پر رہتے گا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ غالباً آپ کا ہمنام اُس وقت نہ ہوگا؟ بہت اچھا۔ ۔ ۔ مَیں آؤنگا اور اس کے متعلق گفتگو کرونگا۔ ڈاکٹر واٹسن صاحب بھی میرے ساتھ آئینگے ۔ ۔ ۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ باہر بہت کم جایا کرتے ہیں۔ ۔ ۔ اچھا ہم شام کو ۶ بجے آئینگے۔ آپ ہمارے آنے اور اس گفتگو کا ذکر امریکن وکیل سے نہ کیجیے گا ۔ ۔ ۔ ۔ بہت اچھا ۔ ۔ ۔ تسلیم!"

رائیڈر اسٹریٹ جو ایجور شاہ راہ کی ایک شاخ ہے۔ اور جس کا ٹائبرن نامی خوفناک درخت سے صرف چند قدموں کا فاصلہ ہے۔ موسم بہار کی دلکش شام کو نہایت سہانی معلوم ہوتی تھی۔ آفتاب غروب ہو رہا اور اس کی طلائی شعاعیں عجیب نظر فریب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ جہاں ہم جا رہے تھے۔ وہ جارجین طرز کی ایک پُرانی عمارت تھی۔ اس عمارت کی زیرین منزل میں دو بڑی کھڑکیاں تھیں۔ اور ہمارا موکل اسی منزل میں رہا کرتا تھا۔ یہ کھڑکیاں اُس کمرہ میں تھیں جہاں وہ ٹہلا کرتا تھا۔ جب ہم اندر جانے لگے تو ہومس نے ایک پیتل کی تختی کی طرف اشارہ کیا۔ اس تختی پر اس کا عجیب و غریب نام کندہ تھا۔

"واٹسن! یہ شخص یہاں بہت دنوں سے رہتا ہے۔ اور یہ تختی ایک مدت سے یہاں لگی ہُوئی ہے۔" ہومس نے اس کی اُڑی ہُوئی رنگت اور میلی سطح کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہی اس کا اصلی نام ہے۔ اور یہ بھی قابلِ غور امر ہے۔"

اس مکان میں ایک ہی زینہ تھا۔ اُوپر ایک لمبے کمرے میں کئی تختیاں دروازوں پر لگی ہُوئی تھیں۔ بعضوں پر دفتروں کے نام کندہ تھے۔ اور بعضوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگوں کے رہنے کے کمرے ہیں۔ جہاں مجرد لوگ رہا کرتے ہیں۔ ہمارے موکل نے دروازہ کھولا۔ اور بطور معذرت کے کہنے لگا۔ کہ آج ملازمہ چار ہی بجے چلی گئی۔ مسٹر نیتھن گیرڈب، دراز قد، ڈھیلے جوڑ کا خمیدہ پشت، دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اسکے سر پر چاند تھی۔ عمر ساٹھ سال کی ہوگی۔ چہرہ زرد تھا۔

اور بدن پر جُھریاں آرہی تھیں۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا
تھا کہ اسے ورزش کی کبھی عادت نہ تھی۔ آنکھیں گول
اور سبز نما داڑھی تھی۔ ایک عجیب حلیہ اور ہیئت تھی۔
مجموعی طریقہ پر اچھا اثر پڑتا تھا۔ وہ کسی قدر وہمی تھا۔
یہ مکان بھی اپنے مکین سے کچھ کم عجیب نہ تھا
بلکہ یہ چھوٹا سا عجائب خانہ تھا۔ اس وسیع کمرے میں
الماریاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ اور ان میں
طبقات الارض اور تشریح الابدان سے تعلق رکھنے
والی اشیاء کا ایک چیدہ اور انتخابی ذخیرہ تھا۔ دروازہ
کے دونوں طرف دو شیشہ دار الماریاں تھیں۔ جن میں
تتلیاں اور پتنگے قرینہ اور ترتیب سے رکھے ہوتے
تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک شیشہ دار میز تھی جس میں
سخت پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑے رکھے ہوتے
تھے۔ اور ایک خوردبین بھی تھی۔ جس کی نلی چمک رہی
تھی۔ ایک طرف پرانے سکّوں کا صندوق۔ دوسری
طرف ایک الماری تھی۔ جس میں چقماق کے اوزار ترتیب
سے رکھے ہوتے تھے۔ میز کے عقب میں ایک الماری
تھی۔ جس میں معدنی ہڈیوں کا ذخیرہ تھا۔ دیوار پر روغن
چڑھے جمجموں کی ایک قطار تھی۔ جس کے نیچے باقاعدہ
نام لکھے ہوتے تھے۔ میں اس شخص کے ہمہ گیر ذوق
سے متعجب سا رہ گیا۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ
مختلف مضامین کا عالم ہے۔ وہ ہمارے سامنے کھڑا
تھا اور اس کے ہاتھ میں شمائے[۵۱] لیدر کا ایک ٹکڑا تھا
جس سے وہ ایک پرانے سکّہ کو صاف کر رہا تھا۔
اس نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ " یہ
اُس زمانہ کا ہے۔ جب سائبراکوزا[۵۲] اپنے عروج پر تھا۔
میں اس عروج ہی کے زمانہ کو بہترین زمانہ سمجھتا ہوں
بعضوں کا خیال ہے کہ سکندر کا زمانہ بہترین زمانہ
ہے۔ مسٹر ہومس اس کرسی پر تشریف رکھتے نا۔ اگر آپ
اجازت دیں تو میں یہ ہڈیاں صاف کر لوں۔ ہاں آپ
کون؟ خوب یاد آئے ڈاکٹر واٹسن صاحب۔ آپ ذرا
مہربانی فرما کر اس جاپانی ظرف کو ادھر رکھ دیجئے۔ آپ
دیکھتے ہیں مجھ کو ان اشیاء سے کتنا ذوق ہے۔ میرے
معالج مجھ سے ہمیشہ باہر ہوا خوری کو جانے کے لئے
کہا کرتے ہیں۔ لیکن جب میری دلچسپی کا سب سامان
یہاں موجود ہے۔ تو میں خواہ مخواہ باہر کیوں جاؤں؟
یقین جانئے کہ اس الماری کے سامان کو سجاتے
اور اُس کی فہرست تیار کرنے میں مجھ کو کم از کم تین مہینے

[۵۱] ایک قسم کا نرم چمڑا
[۵۲] جزیرہ سسلی میں ایک یونانی نو آبادی تھی۔ جو بعد میں خود ایک سلطنت ہو گئی تھی۔ اور اپنے زمانہ میں یہ شہر تہذیب اور تمدن کا مرکز تھا۔

لگیں گے۔

ہوسؔ نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔

"کیا آپ کبھی باہر تشریف نہیں لے جاتے؟"

ہوسؔ نے دریافت کیا۔

"میں کبھی کبھی اتفاق سے سوتھبیز یا کرسٹیز کو جاتا ہوں۔ ورنہ میں اپنے اس کمرے ہی میں رہا کرتا ہوں۔ ایک تو میں یوں بھی کمزور ہوں۔ اور دوسرے مطالعہ اور تفحص سے مجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جس وقت سے میں نے یہ خوشخبری سنی ہے۔ اس وقت سے مجھے کچھ رنج سا ہوتا ہے۔ کہ مجھے اس کمرے سے علیحدہ ہونا پڑیگا۔ لیکن یہ رنج بھی خوشگوار ہے۔ دو گیبر ڈب تو اب موجود ہی ہیں۔ صرف ایک کی ضرورت ہے۔ یقیناً وہ بھی مل جائیگا۔ میرا ایک بھائی تھا۔ لیکن وہ تو مر چکا ہے۔ عورتوں کی شرط نہیں خیر کوئی دوسرا مل ہی جائیگا۔ میں نے سنا ہے۔ کہ آپ عجیب و غریب واقعات اور معاملوں کا پتہ لگایا کرتے ہیں۔ اسی لئے میں نے آپکو تکلیف دی ہے کہ اس کا پتہ بھی لگا دیجئے۔ امریکن تو سچ کہتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے جو کچھ کیا ہے کوئی غیر مناسب کارروائی نہیں۔"

"آپ نے بڑی عقلمندی کی" ہوسؔ نے جواب دیا۔ "لیکن کیا فی الحقیقت آپ امریکہ میں جایداد حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں؟"

"دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو مجھ کو اپنا ذخیرہ چھوڑنے کی ترغیب دے سکے۔ مجھے اس شخص نے یقین دلایا ہے۔ کہ پہلے میں اپنا حق قائم کرلوں تو وہ خود میرا حصہ خرید لیگا۔ پانچ ملین ڈالر کہا جاتا ہے مجھے قومی ذخیرہ فراہم کرنے کا ذوق ہے۔ چند نادر اشیاء ہیں۔ لیکن کمی سرمایہ کی وجہ سے نہیں خرید سکتا۔ ہوں۔ اگر یہ رقم ہاتھ لگ گئی تو میں حسب خواہش اپنا ذخیرہ مکمل کرلونگا۔"

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنے ہمنام کی جستجو میں وہ کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے گا۔

ہوسؔ نے کہا "میں تو محض آپ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ یہ میری عادت بھی ہے کہ جن کے معاملات میں لیتا ہوں۔ ان سے ذاتی تعارف اور ملاقات رکھنا پسند کرتا ہوں۔ مجھ کو جن باتوں کی ضرورت تھی۔ وہ میں نے آپکے امریکن ہمنام سے دریافت کر لی ہیں۔ آپ کا صاف تحریری بیان میرے پاس موجود ہے۔ میں اس وقت آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کا مفصل جواب دیجئے۔"

ہوسؔ نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ اس امریکن

کے آنے کے قبل آپ اس معاملہ سے بالکل ناواقف تھے؟"

"جی ہاں۔ میں بالکل ناواقف تھا۔ وہ تو گتے دوشنبہ کو آیا۔"

"کیا آج اس نے ہماری ملاقات کا بھی آپ سے کچھ ذکر کیا؟"

"وہ جب میرے یہاں آیا تو بہت خفا تھا۔"

"آخر وہ ناخوش کیوں تھا؟"

"وہ اسے اپنی توہین اور تذلیل سمجھتا تھا۔"

"اُس نے آپ کے سپرد کوئی کام تو نہیں کیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کہیں آپ سے اُس نے کچھ روپیہ تو نہیں لیا یا روپیہ تو نہیں مانگا؟"

"جی نہیں، نہ تو اُس نے مانگا اور نہ کچھ لیا۔"

"اس کی گفتگو سے اس کا کچھ اور ارادہ تو ظاہر نہیں ہوتا تھا؟"

"جو کچھ اس نے کہا اسی معاملہ کے متعلق کہا۔ بجز اس خاص معاملہ کے اُس نے اور کسی قسم کی گفتگو نہیں کی۔"

"کہیں آپ نے اس سے یہ تو نہیں کہدیا کہ ہم لوگ شام کو آنے والے ہیں؟"

"ہاں میں نے اس سے اسکا ذکر کیا تھا۔"

ہوس تھوڑی دیر تک اپنے خیالات میں مستغرق رہا۔ اور میں دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ کسی گہری فکر میں ہے اور کچھ غور کر رہا ہے۔

"آپ کے اس ذخیرہ میں کوئی بیش قیمت چیز تو نہیں ہے؟" ہوس نے دریافت کیا۔

"میں متمول نہیں ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میرا ذخیرہ منتخب اور چیدہ ہے۔ لیکن بہت قیمتی نہیں ہے۔"

"آپ کو نقب زنی کا خوف تو نہیں؟"

"بالکل نہیں"

"آپ ان کمروں میں کب سے سکونت پذیر ہیں؟"

"پانچ سال سے"

ہوس یہ سوالات کر ہی رہا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ کو تحکمانہ انداز میں کھٹکھٹایا۔ ہمارے موکل نے دروازہ کھول دیا۔ اور امریکن وکیل کچھ پریشان سا اندر داخل ہوا وہ ایک کاغذ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیجئے! میں تو سمجھتا تھا کہ دیر ہو گی لیکن اب میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں خدا کے فضل سے آپ امیر کبیر ہو گئے۔ جناب والا ہمارا کام بفضل تعالےٰ باحسن عنوان انجام کو پہنچ گیا۔ جناب ہوس ہمکو افسوس ہے کہ ہم نے آپ کو ناحق تکلیف دی۔"

اس نے ہمارے موکل کو وہ کاغذ دیدیا۔ ہمارا موکل ایک اشتہار کو جس پر نشان لگا ہوا تھا پڑھنے لگا میں نے اور ہومس نے بھی جھک کر اُس اشتہار کو دیکھا۔ وہ اشتہار حسب ذیل تھا:-

Howard Garrideb

ہوورڈ گیرڈب

Constructor of Agricultural-Machinery.

زراعتی آلات ساز

Binders, reapers, steam and hand plows

اسٹیم اور دستی ہل فصل کاٹنے اور گٹھا باندھنے کی مشین

Drills harrows, farmer's carts,

کسانوں کی گاڑی۔ سراوں اور کوڑا دینے کے آلات

buckboard & all other appliances

اور دوسرے اوزار

Estimates for Artesian wells

Apply Grosvenor Buildings-Aston

درخواستیں گراسوینر بلڈنگز۔ آسٹن کو بھیجئے

ہمارے موکل نے خوش ہو کر کہا۔ "خوب اب تو تین پورے ہو گئے۔"

امریکن نے کہا۔ "لندن کے ماسوا میں نے برمنگھم میں بھی تحقیقات شروع کر دی تھی۔ وہاں سے میرے ایجنٹ نے یہ اخبار بھیجا ہے۔ اب ہمیں بعجلت تمام اس معاملہ کو تکمیل تک پہنچا دینا چاہئے۔ میں نے ہوورڈ گیرڈب کو لکھدیا ہے۔ کہ آپ کل تیسرے پہر اس سے ملیں گے۔"

"ہیں! کیا اس سے ملنے کے لئے آپ مجھے بھیجنا چاہتے ہیں؟"

"جناب ہومس! آپ ہی فرمایئے! کیا یہ مناسب نہیں کہ آپ وہاں تشریف لے جائیں؟ میں یہاں اجنبی ہوں اور میرا قصّہ بھی عجیب ہے۔ ایسی حالت میں یکایک وُہ مجھ پر کب یقین کرنے لگے۔ آپ میں اور ان میں ہموطنی کا تعلق ہے۔ یقیناً آپ جو کچھ کہینگے اس پر اُن کو یقین آ جائے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں۔ لیکن کل مجھے چند ضروری کام ہیں۔ خیر اگر آپ کو ذرا سی بھی میری ضرورت محسوس ہوتی تو میں آپ کی امداد کے لئے فوراً حاضر ہو جاؤنگا۔"

"لیکن میں نے ایک مدت سے اتنا بڑا سفر نہیں کیا۔"

"مسٹر گیرڈب بھلا یہ بھی کوئی سفر ہے۔ آپ یہاں سے ۱۲ بجے روانہ ہونگے اور ۲ بجے پہنچ جائینگے۔ اور پھر رات ہی کو واپس آ جائینگے۔ علاوہ ازیں وہاں آپ کو کرنا ہی کیا ہے۔

صرف اتنا کہ اس شخص کا آپ حلفیہ بیان لے لیں اور بس۔"
پھر ذرا جوش میں آکر کہا " مجھے دیکھئے کہ میں امریکہ سے
آرہا ہوں۔ کیا آپ چند سو میل نہیں جا سکتے۔ کہ یہ معاملہ
طے ہو جاتے۔"

" درست ہے"! ہومس نے کہا۔" آپ جو کچھ کہتے ہیں
بالکل بجا ہے۔"

نیتھن گیرڈب نے کسی قدر تردد سے اپنا سر ہلایا۔
اور کہا" جب آپ کا یہ اصرار ہے تو میں ہی جاوں گا
اور خصوصاً اس لئے کہ آپ یہ خوشخبری لے آتے ہیں۔"

" اب تو یہ طے شدہ بات ہو گئی۔ کہ آپ تشریف
لیجا ئینگے" ہومس نے کہا۔" لیکن جب آپ واپس آئیں
تو پوری کیفیت مجھ سے ضرور بیان کیجئے گا۔"

" بہتر ہے۔"

" اچھا تو!" امریکن نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا" مجھے
ضرورت ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل آپ کو برمنگھم رخصت
کرنے آؤنگا۔ تسلیم۔"

امریکن کے جاتے ہی میرے دوست کے چہرے سے
پریشانی کے آثار زائل ہو گئے۔

ہومس نے نیتھن گیرڈب سے مخاطب ہو کر کہا۔
" میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ذخیرہ کو اچھی طرح دیکھوں۔
کیونکہ میں علم شے بہ از جہل شے عمل کرتا ہوں۔ اور جو میرے

لئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ آپکا کمرہ مفید معلومات
حاصل کرنے کا بہترین مقام ہے۔"

ہمارے موکل نے نہایت خندہ پیشانی سے سب
چیزیں دکھلائیں۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی
تھیں۔

" میں نے آپ کی فہم رسا کی بہت تعریف سُنی ہے"
اُس نے کہا۔" اگر آپ کو وقت ہو تو میں پورا کمرہ دکھلادوں"

" اس وقت تو مجھ کو عجلت ہے۔ مگر آپ نے سب
چیزیں قرینے سے ترتیب وار رکھی ہیں۔ اور ہر چیز کے
نیچے اس کے نام کی چٹ چپکا دی ہے۔ ایسی حالت میں
اگر میں آپ کے ہمراہ نہ بھی ہوں تو بھی اچھی طرح دیکھ سکتا
ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کل دیکھ لونگا۔"

" جی نہیں مجھے کوئی عذر نہیں۔ کل آپ تشریف
لائیے۔ اور اچھی طرح دیکھ لیجئے۔ کل یہ کمرہ بند رہیگا لیکن
میں اس کی چابی مسز سانڈرس کے پاس چھوڑ جاؤنگا۔
وہ یہاں ۴ بجے شام تک رہتی ہیں۔ جب آپ آئینگے
تو وہ کمرہ کھول دینگی۔"

" بہتر ہے مسز سانڈرس سے آپ کہدیجئے گا
ہاں یہ تو فرمائیے۔ کہ آپ کا ہاؤس ایجنٹ کون ہے؟"

اس سوال کے اچانک پوچھتے ہی ہمارا موکل کچھ
حیرت زدہ سا ہو گیا۔

اُس نے جواب دیا۔ "نیولوٹے اینڈ اسٹیل، ایجور روڈ۔ یہ آپ نے کیسے پُوچھا؟"

ہومس نے مسکرا کر کہا۔ "جب کبھی مکانوں کے متعلق کوئی ذکر آتا ہے تو میں یہی پوچھ لیا کرتا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عمارت کس طرز کی ہے۔ کوین این یا جارجین؟"

"جارجین طرز کی ہے۔"

"ہاں مجھے پہلے ہی یہ سمجھ لینا چاہئے تھا۔ بہت اچھا خدا آپکو برنگھم کا سفر مبارک کرے۔ تسلیم!"

ہم دونوں وہاں سے اُٹھ کر سیدھے ہاؤس ایجنٹ کے دفتر میں پہنچے۔ لیکن دفتر بند تھا۔ وہاں سے بیکر اسٹریٹ کی طرف چلے گئے۔ کھانا کھاچکنے کے بعد تک اسکے متعلق کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

"ابتو یہ مسئلہ حل ہوا جاتا ہے۔" ہومس نے کہا۔ "اور غالباً اس کا خاکہ آپ کے ذہن میں آہی گیا ہوگا۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا یہ کیا ہے۔"

اس معاملہ کی ابتدا تو بالکل صاف ہے۔ انتہا کے متعلق مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ بھی کل معلوم ہو جائیگا۔ کیا آپ کو اشتہار میں کوئی بات نہیں معلوم ہوئی؟"

اور تو کچھ نہیں البتہ Plough کا املا غلط ہے۔"

"واٹسن! آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ غالباً آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا۔ کہ اس اشتہار کی انگریزی کتنی خراب ہے۔ لیکن یہ اچھی امریکن ہے۔ مطبع والوں کو جس عبارت میں اشتہار ملا۔ اُنہوں نے بجنسہٖ ویسا کمپوز کر کے چھاپ دیا۔ علاوہ اس کے آپ لفظ Back Bond پر خیال کیجئے۔ پھر Artesian Wells کو دیکھئے سب انہی کے یہاں مروّج ہیں۔ اشتہار تو ٹھیٹ امریکن ہے۔ لیکن ایک انگریزی کارخانہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کا آپ نے کیا مطلب سمجھا؟"

"میری سمجھ میں تو صرف اتنا آیا۔ کہ اشتہار دینے والا کوئی امریکن ہے لیکن اس اشتہار دینے سے اسکی کیا غرض ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آئی۔"

"کئی حل ہوسکتے ہیں لیکن زیادہ قرین قیاس مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقہ پر نیتھن گیرڈب برنگھم جائے۔ اس وقت اس امریکن کی گفتگو سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔ پہلے میں نے یہی چاہا تھا کہ بڈھے کو روکدوں اور کہدوں کہ آپ ایک وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پھر مَیں نے سوچا کہ امریکن کو اور موقع دیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال سے مَیں نے بڈھے کو برنگھم جانے کا مشورہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ کل اس کا مقصد بھی معلوم ہو جائیگا۔"

(۳)

ہومس علی الصباح اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ ناشتہ کے وقت لوٹا۔ اس کے چہرہ پر متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔

"واٹسن! یہ معاملہ نہایت نازک اہم اور خطرناک ہے۔ میں جتنا غور کرتا ہوں اُتنا ہی خطرناک نظر آتا ہے بہرکیف خطرہ زیادہ ہے۔"

"ہومس! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بارہا ہم دونوں کو خطرے پیش آتے۔ یہ واقعہ کچھ ایسا نہیں کہ آخری ثابت ہو۔ اس میں خصوصیت ہی کونسی ہے؟"

"میں اسے خطرناک اس لئے سمجھتا ہوں کہ میں نے پتہ لگالیا ہے کہ یہ امریکن وکیل وہی مشہور قاتل اور قزاق ہے۔ جس کا نام کیلر ایوانس ہے۔"

"مگر میں اب بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔"

"آپ کو اگر ہوکلینڈ رزبانی یاد ہوتا تو آپ فوراً سمجھ جاتے۔ بہرحال آج صبح میں اسکاٹ لینڈ یارڈ (لندن کا مشہور دفتر خفیہ پولیس) گیا تھا۔ بھئی میں وہاں کی باقاعدگی اور ترتیب و طریقہ بہم رسانی اطلاع کی کیا تعریف کروں ہر چیز باموقع اور ہر ضروری بات کی پوری اطلاع موجود ہے۔ ایسا باقاعدہ دفتر تو روئے زمین پر کہیں نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہاں کے کارکن اپنے نظریہ میں بعض اوقات کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ تو اُن کی فہم و ذکاوت کا قصور ہے۔ مسٹر لیسٹرسے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں مشہور مجرموں کے فوٹو خانہ میں گھسے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے امریکن وکیل کا مُسکراتا ہوا چہرہ اپنے موقع پر موجود ہے۔ اس فوٹو کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"جس میں ونٹر عرف مورکرافٹ عرف کیلر ایوانس"

میں نے اس کی ہسٹری شیٹ[1] سے چند ضروری نوٹ لے لئے ہیں۔ اس کی عمر ۴۴ سال کی ہے۔ شکاگو کا باشندہ ہے۔ وہاں اس نے تین خون کئے تھے جیل سے پولٹیکل اثر کی وجہ سے رہا ہوگیا۔ ۱۸۹۲ء میں لندن آیا۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں اس سے اور ایک شخص راجر پریس بری نامی سے ایک قہوہ خانہ میں جوا کھیلتے کھیلتے جھگڑا ہوگیا۔ اور اس نے فوراً اُسے گولی ماردی وہ مرگیا لیکن عدالت میں یہ ثابت ہوا۔ کہ مقتول نے ابتدا کی تھی۔ چنانچہ قاتل کو سزا ہوگئی۔ شناخت کے بعد معلوم ہوا کہ مقتول بھی شکاگو کا باشندہ اور مشہور مصنوعی سکّہ ساز تھا۔ کیلر ایوانس کی میعاد قید ۱۹۰۱ء میں ختم ہوئی۔ اور وہ رہا ہوگیا۔ ابتک

[1] ہر پولیس دفتر میں مشتبہ اشخاص کے چال چلن، حرکات و سکنات تعلقات کے متعلق پوری اطلاعات ایک کتاب میں لکھی جاتی ہیں۔ جس کو نامۂ اعمال سمجھنا چاہئے۔ اسی نامۂ اعمال کو ہسٹری شیٹ کہتے ہیں۔

پولیس اس کی نگرانی کرتی ہے۔ لیکن رہا ہونے کے بعد سے اُس نے اپنا طریقہ چھوڑ دیا۔ اور کسی قسم کی شکایت نہیں

"اس قماش کے لوگ عموماً اپنے ساتھ پستول رکھتے ہیں اور فوراً حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! ہم کو اس شخص سے مقابلہ پیش آنے والا ہے!"

"مگر اس سے یہ نہ معلوم ہُوا کہ وہ کس شکار کی تلاش میں ہے؟"

"یہ معمہ بھی خود حل ہو جائیگا۔ میں اپنے موکل کے ہاؤس ایجنٹ کے یہاں بھی گیا تھا۔ وہاں یہ معلوم ہو گیا۔ کہ مسٹر گیرڈب کے اس مکان میں آنے کے قبل یہ مکان ایک سال تک خالی رہا۔ اس سے پہلے خاص اس کمرہ میں جو آجکل مسٹر گیرڈب کا عجائب خانہ ہے۔ ایک آوارہ منش شخص رہا کرتا تھا۔ اس کا نام وارڈن تھا۔ جب میں نے اس کا حلیہ دریافت کیا تو معلوم ہُوا کہ وہ دراز قد۔ ریشدار اور گندمی رنگ کا تھا۔ اس حلیہ کو اگر پریسی بری کے حلیہ سے جسے کیلر ایوانس نے گولی ماری ہے۔ ملایا جاتے تو کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اب ہمیں یہ نظریہ قائم کرنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ کہ گیرڈب کے پہلے اس مکان میں امریکہ کا مشہور مجرم اور مصنوعی سکہ ساز پریسی بری رہا کرتا تھا نیز اس سے اور کیلر ایوانس سے گہرے تعلقات تھے۔"

"لیکن اس سلسلہ نظریات کے اور بھی دوسرے اجزاء کیا ہیں؟"

"بعد کو وہ بھی معلوم ہو جائیں گے۔"

ہومس نے دراز سے دو پستول نکالے۔ ایک مجھے دیا۔ اور ایک اپنے جیب میں رکھ لیا۔ اور کہا۔ "اگر ہمارے امریکن دوست نے ذراسی بھی بدعنوانی کی تو پھر ہماری طرف سے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا جائیگا واٹسن صاحب! اپنی اس نئی مہم پر روانہ ہونے کے لئے صرف ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔"

(۴)

ہم مسٹر گیرڈب کے مکان پر ٹھیک ۴ بجے شام کو پہنچے۔ مسز سانڈرس اپنے مکان جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے بلا پس و پیش دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہُوئے۔ ہومس نے مسز سانڈرس کو اطمینان دلایا۔ کہ ہمارے جانے کے بعد کمرے کا اسباب اپنی اصلی حالت میں ملیگا۔ دروازہ بند ہُوا۔ اور چند ہی منٹ کے بعد ہم نے مسز سانڈرس کو جاتے ہُوئے دیکھا۔ اس وقت کمرے کے اندر ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ہومس نے بعجلت تمام پورے کمرہ کا معائنہ کیا۔ ایک کونہ میں ایک تختہ کھڑا تھا۔ اس کی آڑ میں ہم دونوں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اور آہستہ

آہستہ ہومس نے اپنی تجویز بیان کرنی شروع کر دی اُس نے کہا "تم تو جانتے ہو کہ گیرڈب اس کمرے سے ایک منٹ کو بھی نہ نکلتا تھا۔ اور امریکن بدمعاش کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے گیرڈب کو اس کمرے سے ٹالے۔ اس غرض کے حصول کے لئے اس نے یہ سازش تیار کی ہے۔ گیرڈب کے عجیب نام سے اُسے موقع بھی مل گیا۔ لیکن مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سازش بڑی عقلمندی سے تیار کی گئی ہے۔ نیز مجھے تو یقین ہو گیا ہے۔ کہ یہ سازش کسی مقصد مجرمانہ کے حصول کی خاطر تیار کی گئی ہے۔ مگر قصہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب وغریب اور جاذب توجہ ہے۔"

پھر بھی یہ نہ معلوم ہو سکا۔ کہ وہ چاہتا کیا ہے؟"

"بھائی! ہم اسی عقدہ کشائی کے لئے یہاں آتے ہیں۔ مَیں نے بہت غور کیا ہے لیکن میرے ذہن میں یہی بات آتی ہے۔ کہ اس سازش کا تعلق ہمارے موکل سے مطلق نہیں۔ بلکہ پریس بری کے قتل سے تھا۔ وہ تھا بھی اس امریکن کا ساتھی۔ اس کمرہ میں ضرور کوئی نہ کوئی مجرمانہ راز پوشیدہ ہے۔ اولاً تو مجھے یہ خیال ہوا تھا۔ کہ ہمارے موکل کے اس ذخیرہ میں کوئی ایسی بیش بہا چیز ضرور ہے جس سے وُہ خود تو ناواقف ہے۔ لیکن مجرم کی نگاہ اس پر پڑ چکی ہے مگر جب مجھے یہ معلوم ہُوا کہ اس کمرہ میں راجرس پریس بری رہا کرتا تھا۔ تب میرا خیال پلٹ گیا۔ اور مجھے یقین سا ہو گیا کہ کوئی اہم راز ہے۔ اور اس راز کا تعلق خاص اس کمرہ سے ہے۔ خیر اب ہمیں نہایت اطمینان اور سکون سے انتظار کرنا چاہئے۔ کہ پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔"

ہمارے منتظرہ وقت کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی ہم نے بیرونی دروازہ کے کھلنے کی آواز سُنی، تو فوراً تختے کی آڑ میں سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں دروازہ کے قفل میں کنجی کے پھیرنے کی آواز سنائی دی اور معاً وہ امریکن کمرہ میں داخل ہُوا۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔ اور ایک اطمینان کی نگاہ کمرہ کی ہر چیز پر ڈالی۔ یہ یقین ہوتے ہی کہ کمرہ ہر خطرہ سے خالی ہے۔ اُس نے اپنا اُوور کوٹ اتار کر ایک کرسی پر رکھ دیا۔ اس کے بعد نہایت اطمینان اور مشاقی سے اُس میز کی طرف بڑھا۔ جو کمرے کے بیچوں بیچ رکھی ہُوئی تھی۔ اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔ اور فرش کی دری کو لپیٹ کر ایک طرف کیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی جیب سے ایک اوزار نکالا۔ اور اُس سے فرش کو زور سے دبانے لگا۔ اس دباؤ سے فرش کے تختوں میں جنبش پیدا ہُوئی۔ اور اُن کے سرکنے کی آواز ہونے لگی۔

ان تختوں کے سرکنے سے ایک مربع تہ خانہ نکل آیا۔
اب اُس امریکن نے ایک موم بتی روشن کی۔ اور اُسے
لیکر تہ خانہ کے اندر کو دپڑا۔

ہمارا اپنی کمین گاہ سے نکلنے کا وقت ہو چکا تھا
ہومس نے اشارتاً میری کلائی دبائی اور ہم دونوں تختہ
کی آڑ سے نکلکر تہ خانہ کے قریب پہنچ گئے۔ ہم احتیاطاً
نہایت آہستہ اور قدم دبا کر چل رہے تھے پھر بھی اُس
نے ہمارے قدموں کی چاپ سن لی۔ اور سر نکال کر ہم
لوگوں کو دیکھنے لگا۔ یک بیک اُس کا چہرہ غصّہ سے سُرخ
ہوگیا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ دو پستولوں کی نلیاں
اُس کے سر کا نشانہ بنا تے ہوتے ہیں۔ تو اس کے
چہرہ پر شرم آمیز متانت کے آثار دکھائی دینے لگے۔

"خوب!" اُس نے متانت سے کہا! اور اُوپر
نکل آیا۔" اب میری سمجھ میں آیا کہ آپ میرے پیچھے
پڑ گئے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ آپ بازی لے گئے" اتنے
میں اس نے اپنے جیب سے پستول نکالا۔ اور دو فیر
کر دئے۔ گولی میری ران سے پار ہو گئی۔ مگر ہومس نے
فوراً ہی اپنے پستول کے دستے سے بڑے زور سے
اس کے سر پر ایک ضرب کاری لگائی۔ جسکے لگتے ہی
اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اور وہ فرش پر گر پڑا۔
ہومس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے پستول کو چھین لیا

اور اچھی طرح دیکھ لیا۔ کہ اس کے پاس کوئی دوسرا ہتھیار
تو نہیں۔ اس کے بعد اُس نے مجھے سہارا دیکر اُٹھایا اور
ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

"واٹسن! کہیں تمہارے گہرا زخم تو نہیں لگا؟
خُدا کے لئے بتاؤ بھی۔"

اس وقت مجھے ظاہری سرد مہری کے نقاب کی
آڑ میں خالص محبت اور اخلاص کی جھلک نظر آرہی
اُس کی صاف اور پر سکون آنکھوں میں آنسو بھر آتے
تھے۔ اور اُس کے پُر استقلال لبوں پر جنبش دکھلائی
دیتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اس دل و دماغ کے
انسان کی محبت کے جذبات کا اندازہ ہوا۔ اور میری
ناچیز موانست اور خدمات کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

مَیں نے جواب دیا۔" ہومس! تردد کی ضرورت
نہیں۔ یونہی ہلکی سی خراش آگئی ہے۔"

اُس نے جیب سے چاقو نکال کر میرا پتلون کاٹ
ڈالا۔ اور دیکھ کر اطمینان کے لہجہ میں کہنے لگا۔" ہاں تم
ٹھیک کہتے ہو۔ یہ زخم گہرا نہیں ہے۔" اس کے بعد اُس
نے خشمگین نگاہوں سے گرفتار شدہ ملزم کو دیکھا۔ جو
اب بیٹھ گیا تھا۔ اور مخبوط نگاہوں سے ہم لوگوں کو دیکھ
رہا تھا۔ اس سے مخاطب ہوکر ہومس نے کہا۔" خدانخواستہ
کہیں تمہاری گولی سے واٹسن کا کام تمام ہوگیا ہوتا تو

خدا کی قسم تم بھی اس کمرہ سے زندہ نہ جانے پاتے۔
اب تم اپنے متعلق کیا کہتے ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیوریاں بدل کر وہیں لیٹ گیا۔ مَیں ہومس کے سہارے اس تہ خانہ تک پُہنچا۔ جو تختوں کے سرکنے سے نمودار ہُوا تھا۔ ہم نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس میں وہ موم بتی جو ایوانس اندر لیکر اُترا تھا۔ ابتک روشن تھی۔ اندر ایک زنگ آلود چھاپنے کی مشین تھی۔ اور چند کاغذ کی گڈیاں تھیں۔ وہیں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر ترتیب وار نہایت صفائی سے چھوٹی چھوٹی کاغذ کی گڈیاں جمی ہوئی رکھی تھیں۔

"یہ تو چھاپنے کی مشین ہے! مصنوعی نوٹ سازی کا اسباب؟"

"جی ہاں" ہمارے قیدی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہُوتے کہا۔ "جی یہ اس سکّہ ساز کا اسباب ہے۔ جس کے مقابل کا لندن میں کوئی دوسرا نہیں۔ یہ مشین پریس بری کی ہے۔ میز پر آپ جو گڈیاں دیکھتے ہیں یہ ایک ایک گڈی دو ہزار پونڈ کے نوٹوں کی ہے۔ اور یہ نوٹ اسی کے ہاتھ کے بناتے ہُوتے ہیں۔ یہ نوٹ ایسے ہیں جو ہر جگہ بغیر خرخشہ اچھی طرح چلیں گے انہیں لے لیجئے۔"

ہومس نے ہنس دیا اور کہا۔ "مسٹر ایوانس! ہم کو ان نوٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی یقین رکھئے کہ آپ کو اب چھٹکارا ملنا غیر ممکن ہے۔ آپ ہی نے پریس بری کو گولی ماری تھی نا؟"

"جی ہاں گولی مَیں نے ہی ماری تھی جس کی پاداش میں پانچ سال کی سزا بھی ہُوئی۔ حالانکہ حملہ پہلے اسی نے کیا تھا۔ اس شخص کو نوٹ بنانے میں کمال تھا بھلا کسی کی کیا مجال کہ اس کے بناتے ہُوتے نوٹوں اور بنک آف لندن[۵۱] کے نوٹوں میں ذرا سا بھی فرق نکال دے۔ اگر مَیں نے اُسے گولی نہ ماری ہوتی تو آج لندن میں اسی کے نوٹ نظر آتے۔ ایسی حالت میں مجھے بجائے انعامی تمغہ دینے کے سزا دی گئی۔ صرف میں ہی اس راز کو جانتا تھا۔ کہ وہ نوٹ کہاں بنایا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب نہیں کہ مَیں اس جگہ پہنچنے کی کوشش میں نہ ہوں۔ کیا آپ کو پھر بھی تعجب ہوسکتا کہ جب مَیں نے اس مخبوط الحواس شخص کو جس کا نام بھی عجیب ہے۔ اس کمرہ میں رات دن ہمیشہ موجود پایا۔ تو مجھے اُس کو یہاں سے ٹالنے کی ضرورت ہُوتی۔ مَیں نے اُسے یہاں سے جس خوبی سے ہوسکا ہٹایا۔ بہتر تو یہی تھا کہ اس کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ لیکن مَیں فطرتاً رحمدل واقع ہوا ہوں اس لئے مَیں نے مناسب نہ سمجھا۔ کہ اس کو مارا جاتے۔

[۵۱] بنک آف لندن دُنیا میں سب سے بڑا بنک ہے۔

میں کسی پر اس وقت تک گولی نہیں چلاتا جب تک میں اپنے دشمن کے ہاتھ میں بھی بندوق نہ دیکھ لوں۔ مسٹر ہومس آپ ہی کہتے نا میں نے کیا کیا ہے ؟ میں نے اس پریس کو اب تک استعمال نہیں کیا۔ اور نہ اس کمبخت بوڑھے کو ہاتھ لگایا۔ آپ مجھے کہاں لیجانا چاہتے ہیں ؟"

"جی ہاں آپ نے بجز قتل کرنے کی کوشش کے اور تو کچھ نہیں کیا۔" ہومس نے جواب دیا۔ "لیکن ہم کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ جس کا کام ہے وہ خود کر لیگا۔ واٹسن صاحب! ذرا اسکاٹلینڈ یارڈ کو ٹیلیفون تو دیجئے وہاں آپ کے ٹیلیفون کا انتظار ہوگا۔"

(۵)

ہمنام کی جستجو کے قصہ کے اختراع کے اصلی واقعات یہ ہیں۔ ہمیں بعد کو معلوم ہوا کہ گیرڈب کو سخت صدمہ ہوا اور جب اس کی موہوم امیدوں پر پانی پھرا۔ تو وہ پاگل سا ہوگیا۔ اور پاگل خانہ بھیجدیا گیا۔ جس دن پریس بری کا چھاپہ خانہ ملا اس دن سے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں خاص خوشی منائی گئی۔ یارڈ میں اس کی اطلاع تو موجود تھی کہ اس کا چھاپہ خانہ ہے۔ لیکن اس کے مارے جانے کے بعد یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ چھاپہ خانہ کہاں ہے۔ ایوانس نے فی الحقیقت ایک بڑی خدمت انجام دی اور اس کی اس کارروائی سے بہتیرے خفیہ پولیس کے افسروں کو چین، آرام میسر ہوا۔ لیکن عدالت نے ایوانس کے اس فعل کو دوسرے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔ اور اُسے وہیں دوبارہ پھر بھیج دیا۔ جہاں سے ابھی ابھی وہ باہر آیا تھا۔

کانن ڈائل

غزل

عجیب چیز ہے عاشق کی جان مضطر بھی
کہ دلستاں کی ثنا خواں ہے زیر خنجر بھی

نگار ناخن تدبیر سے رہے برسوں
سمجھنے کاش کوئی چیز ہے مقدر بھی

تھی سخت جانیٔ عاشق کی آزمائش آج
فغاں کناں ہے تبر بھی سناں بھی خنجر بھی

ہیں میگسار بلا نوش تیرے اے ساقی
کہ تشنہ لب ہی رہے خم کے خم چڑھا کر بھی

نگاہِ ناز ادھر بھی ہو بارش پیکاں
کہ منتظر یہ جگر بھی ہے قلب مضطر بھی

کہاں کی سیری قسم لو کبھی پیا ہو اگر
شراب چشم ستمگر سے جام بھر کر بھی

کہیں ہے بزم طرب اور کہیں ہے مجلس غم
عجب مرقع ہے احسن جہاں کا منظر بھی

احسن

شکرانۂ وصل

آمد نگارم مستانہ ناگاہ — چشمے کشادم برحسن دلخواہ
صد جلوہ دیدم در روئے آں ماہ — شب ہائے غم را شد رشتہ کوتاہ
القصّہ رستم از ہجر جانکاہ
الحمدللہ الحمدللہ

دل را ربودی۔ دیں را ربودی — دردم فزودی چوں رُخ نمودی
بر ہر دو عالم چشم کشودی — خود را نہفتی۔ گویا نہ بودی
آخر ز حیرت بُردم بتو راہ
الحمدللہ الحمدللہ

روزے بہ خلوت با ما نشستی — دل را رہاندی از وہم ہستی
از جلوۂ جاں نیرنگ بستی — افسونِ آب و گل را شکستی
ایمن نمودی از عقل گمراہ
الحمدللہ الحمدللہ

حجلہ نشینے۔ عالم ستانے — آشوب عہدے۔ شورِ جہانے
شکر فروشے۔ شیریں دہانے — دی شب نشستہ۔ با ما زمانے
بختم درخشاں چوں جلوۂ ماہ
الحمدللہ الحمدللہ

اکنوں نیازم با مے فروشاں — کارے ندارم با زہد کوشاں
ابرِ بہاری۔ ہر سو خروشاں — پیمانہ رقصاں۔ میخانہ جوشاں
ما ئیم و کیفے از لعل دلخواہ
الحمدللہ الحمدللہ

در حجلۂ جاں۔ عیشم مدام است — از لطف جاناں۔ کارم بہ کام است
دورِ زمانہ پیوستہ رام است — مُرغ سلیماں دائم بدام است
ایں دلق پوشے در حضرت شاہ — الحمدللہ الحمدللہ

افسونِ شب

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!" کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچے اور میری نیند اچاٹ کر گئے اور ابھی آدھی رات بھی نہ گزری ہو گی کہ میں اُٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھُلی تو میں نے اپنے مالک مکان دکھن بابو کو دیکھا۔ میں جلدی سے اُٹھا۔ اور ایک ٹوٹی پھوٹی کرُسی سرکاتے ہُوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔ اور اُسے متردّد نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ نظر جو اُٹھائی تو گھڑی میں اڑھائی بج چکے تھے۔

دکھن بابو کا چہرہ زرد تھا۔ اس کی بھیانک آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔ اُس نے کہا۔ "آج رات مرض کے آثار عود کر آتے ہیں۔ تمہاری دوا میرے لئے مطلقاً صحت بخش ثابت نہیں ہُوئی۔"

میں نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ "شاید تم نے پھر شراب نوشی شروع کر دی ہے۔"

دکھن بابو نے برہم ہو کر کہا۔ "تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ تم نے جو میرے مرض کی وجہ شراب سوچی ہے یہ تمہارا وہم ہے۔ اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے تمہیں میری ساری داستان سُننی ہو گی۔"

طاق میں ایک چھوٹا سا ٹین کا بنا ہُوا مٹی کے تیل کا لیمپ مدھم سی روشنی دے رہا تھا۔ میں نے بتی اُکسائی۔ روشنی میں اِک گونہ چمک پیدا ہو گئی۔ اور ساتھ ہی بتی میں سے دُھواں اُٹھنے لگا۔ چادر کو شانوں پر اوڑھے ہوئے میں نے اخبار کے پرچہ کو تپائی پر رکھ دیا اور بیٹھ گیا۔ دکھن بابو نے اپنی داستان شروع کی۔

چار سال کا عرصہ ہُوا مجھے ایک خوفناک عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ میں قریب مرگ تھا کہ بیماری نے یکایک ایسا پانسہ پلٹا کہ میں قریباً ایک ماہ کے بعد تندرست ہو گیا۔ بیماری کے دوران میں میری بیوی بڑے انہماک سے میری تیمار داری میں مصروف رہی۔ اس کو دن رات میں ایک لحہ بھی دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ ان ایام میں نحیف عورت نے اپنی جان توڑ کوششوں سے اجل کے فرشتے کیلئے گھر کا دروازہ مسدود کر دیا۔ اس پر کھانا اور نیند حرام ہو گئی۔ اس کے خیالات و تفکرات کا مرکز میں ہی میں ہو گیا۔ اجل مجھے اپنے خونی جبڑوں سے چھوڑ کر اس طرح چلدی جس طرح کبھی کوئی شکار اپنے شکاری کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل جاتا ہے۔ لیکن جاتے جاتے ایک کاری چرکہ اپنی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔

میری بیوی ان دنوں امید سے تھی۔ اور کچھ عرصہ بعد اُسے ایک مردہ بچہ تولد ہُوا۔ اب میری باری تھی کہ مَیں اُس کی تیمارداری شروع کروں۔ لیکن یہ اس کے لئے . . . . بہت تکلیف دہ ثابت ہُوا۔ وہ گھبرا کر کہتی "خُدا کے واسطے میرے کمرے میں کیوں ایسی قیامت برپا کر رکھی ہے۔" اگر مَیں رات کے وقت اس کے کمرہ میں جاتا اور اُسے پنکھا جھلنا چاہتا اس بہانہ سے کہ مَیں اپنے آپ کو جھل رہا ہوں۔ تو وہ اور بھی برافروختہ ہوجاتی اور اگر اس کی خدمتگاری میں میرے کھانے کے وقت میں معمول سے دس منٹ بھی دیر ہوجاتی ۔ تو اُسے طرح طرح کی منت سماجت اور طعن و تشنیع کا موقعہ ہاتھ آجاتا۔ اس کی امداد کی خاطر اگر مَیں کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ خدمت انجام دینے کے لئے جاتا تو اس کا نتیجہ برعکس ہوتا۔ وہ کہتی۔ "آدمی کو اتنا پریشان نہ ہونا چاہیئے۔"

میرا خیال ہے کہ تم نے میرا گھر دیکھا ہوگا۔ اِسکے مقابل ایک باغ ہے جس کے دامن میں گنگا بہتی ہے۔ جنوب کی طرف عین خوابگاہ کے نیچے میری بیوی نے اپنے مذاق کے مطابق ایک باغیچہ بنا رکھا تھا۔ اور اس کے اردگرد حنا کی جھاڑیوں کی باڑ لگا رکھی تھی۔ باغ کا ہی ایک سادہ سبز پوش ٹکڑا تھا۔ جس سے وضعداری کی شان کوسوں دُور تھی۔

ایک گھنے درخت کے سایے تلے سنگ سفید کی ایک سل تھی جسے میری بیوی بحالت صحت دن میں دو دفعہ دھویا کرتی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ کام کاج سے فراغت پاکر بیٹھتی اور شام کا آخری حصّہ گزارتی۔ وہاں سے دریا کا منظر دور تک دکھائی دیتا تھا لیکن وہ اس میں چلنے والی دُخانی کشتیوں کے مسافروں کی نگاہوں سے محفوظ اور پنہاں رہتی۔

مدت سے بیماری نے اسے صاحب فراش بنا رکھا تھا۔ اپریل کی ایک چاندنی رات کو اس نے اپنے بند کمرے سے باہر نکل کر پائیں باغ میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مَیں نے اس کی خواہش کی تکمیل کے لئے اسے بحفاظت تمام اُٹھا کر بوکل درخت کے سایے تلے سنگ مرمر کی اس نشستگاہ پر جا بٹھایا، جو اسے نہایت مرغوب تھی۔ بوکل کے ایک یا دو پھول ہلکے سے اس کی گود میں آگرے۔ اور چاند کی نور میں دُھلی ہوئی کرنیں اس کے افسردہ و پژمردہ چہرے پر نور پاشی کرنے لگیں۔ گردو نواح میں ایک وحشت خیز سکوت تھا اس کے پہلو میں بیٹھے ہُوئے اس سایہ دار دھندلکے میں جس کی فضا پھولوں سے معطر ہو رہی تھی میری نگاہیں جو اس کے چہرے پر پڑیں تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بس

سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اور اس کے دُبلے گرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مگر اس کی جانب سے کوئی مدافعانہ کوشش عمل میں نہ آئی۔ کچھ لمحے اس طرح خاموشی میں رہنے کے بعد میرا پیمانہ ضبط لبریز ہو گیا، اور چھلک جانے کو تھا کہ میں نے کہا۔ "میں تمہاری محبت کبھی فراموش نہ کرونگا۔" میری بیوی اس بات کو سُن کر ہنس دی۔ آہ وہ ایسی ہنسی تھی جس میں بدگمانی اور مصنوعی خوشی کے عناصر جُدا جُدا دکھائی دیتے تھے۔ جس میں کسی حد تک خندہ استہزا بھی پایا جاتا تھا۔ اسکی لب بستگی جواب کے طور پر مجھے یہ سمجھانا چاہتی تھی۔ کہ نہ تو اُسے اس بات کا یقین ہے اور نہ وہ اس بات کو پسند کرتی تھی کہ میں اسے یاد رکھوں۔

وہ تمام تقاریر جو میں اس کی عدم موجودگی میں کیا کرتا تھا مجھے اس کے روبرو بالکل معمولی اکھڑے اکھڑے فقرے معلوم ہوتیں۔

ردِ سوال کے وقت تو بولنا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن ہنسی کے آگے کوئی دلیل نہیں چل سکتی۔ اس لئے مجھ سے خاموشی کے سوا کچھ نہ بن پڑا۔

چاندنی زیادہ روشن ہو گئی تھی۔ اور ایک کوئل پے در پے راگنیاں چھیڑے جاتی تھی۔

بہتیرا علاج کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، اور صحت کے کوئی آثار نہ نمودار ہوتے۔ ڈاکٹر نے تبدیل ہوا کی رائے دی۔ اور میں اسے الہ آباد لے گیا۔ اس بات پر پہنچکر دکھن بابو یکایک رُک گیا۔ اور کسی خیال نے اس کے لب سی دیئے۔ اس نے ہمہ تن سوال ہو کر اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ بعدازاں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے خیالات کی رو میں بہ گیا۔ میرے مُنہ پر بھی مہر سکوت ثبت ہو گئی۔

طاق میں مٹی کے تیل کا لیمپ ٹمٹما رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں مچھروں کی بھِن بھِن صاف صاف سُنائی دیتی تھی دفعتاً خاموشی کو توڑتے ہُوئے دکھن بابو نے اپنی کہانی کا سلسلہ شروع کیا۔

میری بیوی ڈاکٹر ہرن کے زیر علاج تھی جس نے مجھے تھوڑے ہی عرصے میں سمجھا دیا کہ بیماری لادوا ہے اور اسے اپنی بقیہ زندگی اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے کاٹنی پڑے گی۔

ایک دن بیوی نے مجھ سے کہا۔ چونکہ بیماری میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ اور ابھی مجھے جلد مرنے کی بھی امید نہیں تم کیوں خواہ مخواہ اپنی نیند مجھ زندہ در گور کے ساتھ حرام کر رہے ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور اپنے دیگر مشاغل میں سرگرمی سے حصّہ لو۔

اب میری باری تھی کہ میں ہنس دوں۔ لیکن مجھ میں

اس کی سی ہنسی کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے اس سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے جو ایک افسانہ کے ہیرو کے شایانِ شان ہو سکتی ہے۔ کہا۔ جب تک میرے تن میں جان باقی ـــــ" میری بیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ بس بس تمہیں اور کچھ نہ کہنا ہوگا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آیا میں اس کی بات واقعی مان گیا۔ لیکن اتنا خوب یاد ہے کہ میں اپنے دِل کی گہرائیوں میں اس وقت اس زندگی سے مایوس مریضہ کی تیمار داری کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔ باوجود میری جانفشاں کوششوں اور خدمتگزاریوں کے وہ میرے روحانی اضطراب کو بھانپ گئی تھی۔ جسے میں اس وقت تو نہ سمجھ سکا لیکن اب میرے دماغ میں شبہات کا ایک شائبہ تک نہیں۔ کہ وہ میرے چہرہ کی بیرونی کیفیات سے میرے باطنی اضطراب کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس طرح جیسے بچے پہلی کتاب فرفر پڑھ جاتے ہیں، جو مرکب الفاظ سے خالی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ہرن اور میں ہم ذات تھے۔ میرا اس کے گھر میں آنا جانا ضروری تھا۔ میری متعدد آمد و رفت کے دوران میں اس نے اپنی لڑکی کے ساتھ میرا تعارف کرا دیا وہ ابھی نا کتخدا تھی۔ اگرچہ اس کی عمر پندرہ سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی نقص نہ تھا۔ وہ اتنی ہی فہمیدہ تھی جتنی حسین تھی۔ اس لئے میں گھر جانے سے پیشتر اس کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ کیا کرتا۔ بعض اوقات میں کافی رات گئے گھر پہنچتا۔ اس وقت سے بہت دیر بعد جبکہ مجھے وہاں جا کر اپنی بیوی کو دوا پلانی ہوتی۔ وہ بخوبی جانتی کہ میں ڈاکٹر کے گھر پر بیٹھا تھا۔ لیکن اُس نے ایک دفعہ بھولے سے بھی میرے دیر لگانے کا سبب نہ پوچھا۔

مریضہ کے کمرے میں ٹھہرنا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اور وہاں میری طبیعت نہ لگتی تھی۔ اب تو میں حد درجہ اپنی مریضہ کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا۔ اور اسے وقت مقررہ پر دوا پلانے سے قاصر رہنا میرے لئے ایک معمولی بات تھی۔

ڈاکٹر کبھی کبھی مجھ سے کہا کرتا۔ ایسے مریضوں کے لئے جو کسی لاعلاج بیماری کے شکار ہوں موت ہی ایک راہ نجات ہو سکتی ہے۔ جب تک وہ زندہ رہتے ہیں ان کے لئے زندگی کی دلچسپیاں عنقا ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کے لئے بھی وہ سوہانِ روح بنجاتے ہیں۔ اور حالات میں ایسی راتے برداشت کیجا سکتی ہے لیکن اس حال میں جبکہ میری اپنی بیوی کی زندہ مثال پیش نظر تھی۔ ایسے معاملے کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ طبیب لوگ حیات و ممات

کے معاملے میں نہایت سنگدلی سے کام لیتے ہیں۔

ایک دن جبکہ میں مریضہ کے کمرہ کے برابر والے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو ڈاکٹر سے یہ کہتے سُنا۔ ڈاکٹر صاحب آپ مجھے کیوں بیفایدہ اتنی دوائیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ میری زندگی ایک مسلسل عارضہ میں مبدّل ہوگئی ہے کیا آپ نہیں خیال کرتے کہ صرف موت ہی میرا علاج ہے؟"

ڈاکٹر نے کمرہ سے باہر قدم رکھا اور میں اندر گیا۔ اور اس کے برابر بیٹھ کر اس کا سر دبانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا یہ کمرہ بہت گرم ہے تم سیر کو ہو آؤ۔ اگر شام کو اتنی بھی ورزش سے محروم رہے، تو تمہیں شام کے کھانے کی اشتہا نہ رہیگی۔

"شام کی ورزش" سے دراصل اس کا مطلب ڈاکٹر کے گھر جانا تھا۔ میں نے آپ ہی واضح کر دیا ہے۔ کہ تھوڑی سی ریاضت آدمی کو تندرست رکھنے اور بُھوک چمکانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ ہر روز میرے اس بہانہ کو میری صداقت پر محمول کرتی رہی لیکن آہ! میں بیوقوف تھا۔ اور میں سچ مچ سمجھے بیٹھا تھا۔ کہ وہ اس فریب سے ناواقف ہے۔"

یہاں دکھن بابو رُک گیا۔ اور سر ہاتھوں پر جھکائے ہوئے کچھ عرصہ تک گم سم بیٹھا رہا۔ آخر بولا۔ "پانی کا گلاس لانا۔"

پانی کا گلاس پی کر پھر شروع ہوگیا۔

ایک دن ڈاکٹر کی لڑکی منورما نے میری بیوی سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کیوں؟ لیکن اس کی یہ تجویز مجھے کسی طرح نہ بھائی۔ تاہم اس کی اس درخواست کا انکار کرنے کے لئے میرے پاس کوئی خاص عذر بھی نہ تھا۔

ایک روز وہ ہمارے گھر آ ہی نکلی۔

اس روز میری بیوی معمول سے زیادہ درد و کرب میں مبتلا تھی۔ ایسی حالت میں وہ بہت صبر سے کام لیتی اور خاموش پڑی رہتی۔ گاہے گاہے درد سے بے چین ہو کر مٹھیاں بھینچ بھینچ لیتی۔

کمرے میں خاموشی برس رہی تھی۔ میں چارپائی کی پائنتی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس روز اس نے مجھے حسب سابق سیر کو جانے کے لئے مجبور نہ کیا۔ یا تو اس میں طاقتِ گویائی ہی نہ تھی یا وہ اس تکلیف کے وقت میرے قُرب سے ایک قسم کا سکون محسوس کر رہی تھی۔ میں نے لیمپ اُٹھا کر دروازے کے قریب رکھ دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں دھوئیں سے محفوظ رہ سکیں۔ خاموش کمرہ میں یکسر تاریکی پھیل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی آواز کان میں آتی۔ وہ میری بیوی کی آہ ہوتی جو اس کے لبوں سے

بے اختیار نکل جاتی۔ جبکہ وہ اس درد و دقت سے ایک لمحہ کے لئے مخلصی پاتی۔

اس وقت منورما دروازہ میں استادہ تھی سمت مخالف سے آنے والی روشنی نے اس کے چہرے کو منور کر رکھا تھا میری بیوی چونک پڑی اور میرے بازو کو اپنے ناتواں ہاتھوں سے تھام کر بولی "ایں وہ کیا ہے؟"

وہ ایک اجنبی کو دروازہ میں دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی۔ اور دو تین بار نقاہت کے لہجے میں بڑبڑائی — دکھی۔ دکھی — دکھی — پہلے تو میں نے ملائمت سے جواب دیا ایسا جواب جس میں میری اپنی کمزوری پنہاں تھی۔ میں نہیں جانتا لیکن دوسری مرتبہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے تازیانہ لگایا ہے۔ اور میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "ہاں یہ ہمارے ڈاکٹر کی صاحبزادی ہیں۔" میری بیوی نے مڑ کر نووارد لڑکی سے بدقت تمام دھیمی آواز میں کہا۔ "بہن اندر آجاؤ۔" اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ لیمپ لے آؤ۔

منورما اندر چلی آئی۔ اور میری بیوی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئی۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گزری ہوگی کہ ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے کی خاطر آپہنچا۔ وہ اپنے ہمراہ شفاخانے سے دوا کی دو شیشیاں لایا۔ مریضہ کو دکھا کر کہنے لگا۔ دیکھو یہ شیشی مالش کے لئے ہے۔ اور یہ دوسری تمہیں پینی ہوگی خبردار ان دونوں کی شناخت میں دھوکا نہ کھانا۔ کیونکہ یہ سم قاتل ہے۔" مجھے بھی اس بات کی تنبیہ کی۔ اور ان دونوں شیشیوں کو بستر کے پاس ایک تپائی پر دھر دیا۔ جاتے وقت اس نے اپنی لڑکی کو ساتھ لے جانے کیلئے بلایا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "اباّ میں یہاں ٹھہرونگی آپ کے ساتھ چلی گئی تو پیچھے کوئی بھی عورت انکی نگرانی کو نہ رہیگی۔"

اتنا سنکر میری بیوی بیقرار سی ہو گئی۔ اور یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔ نہیں نہیں میں آپ کو تکلیف نہ دوں گی۔ میری ایک بڈھی خادمہ ہے وہ میری ماں کی طرح حفاظت کرتی ہے۔

ڈاکٹر اپنی لڑکی کو ہمراہ لے جانے کو تھا کہ میری بیوی نے اس سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ بہت دیر سے اس تنگ و تاریک کمرہ میں بیٹھے ہیں۔ کیا آپ انہیں تازہ ہوا کھلانے ساتھ نہ لے جائینگے"۔ ڈاکٹر نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں تمہیں دریا کے کنارے سیر کا لطف اٹھانے کے لئے لے جاتا ہوں"۔ پہلے تو میں نے نارضامندی ظاہر کی۔ لیکن اس کے اصرار نے مجھے ساتھ ہو لینے پر مجبور کر دیا۔ جانے سے پیشتر ڈاکٹر نے میری بیوی کو دوبارہ ان دوا کی دو شیشیوں کے متعلق ہدایات دیں۔

اس شام کو مَیں نے ڈاکٹر کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اور جب مَیں گھر پہنچا تو مجھے کافی دیر ہوچکی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ میری بیوی درد سے بیتاب ہوکر کروٹیں بدل رہی ہے۔ مجھے اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ اور مَیں نے گھبراکر پُوچھا۔ کیا تمہارا درد بڑھ تو نہیں گیا وہ درد کے باعث جواب دینے سے معذور تھی۔ جب اس نے میری طرف نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ رُک رُک کر بہت دقّت سے سانس لے رہی تھی۔ مَیں نے فوراً ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔

پہلے تو ڈاکٹر معلوم نہ کرسکا کہ کیا ماجرا ہے پھر اُس نے پُوچھا "کیا واقعی درد بڑھ گیا ہے؟ کیا تم نے اس دوائی کا استعمال نہیں کیا؟"

اس نے تپائی سے نیلی شیشی اُٹھائی، دیکھا تو خالی تھی۔

ڈاکٹر کچھ سراسیمہ سا ہوگیا۔ اور اُس کے بدن میں سنسنی پیدا ہوگئی۔ اُس نے میری بیوی سے پُوچھا "کہیں تم نے غلطی سے یہ دوا تو استعمال نہیں کرلی؟"

اس نے جواب میں اثبات کا اظہار سر کی ایک خفیف سی جنبش سے کیا۔

ڈاکٹر معدہ صاف کرنے کی پچکاری لانیکیلئے کمرہ سے لپک کر نکلا۔ اور مَیں قریب کے بستر پر گر پڑا۔ اس انسان کی طرح جس کے ہوش و حواس اس سے رُخصت ہوچکے ہوں۔

پھر جس طرح ماں اپنے علیل اور روتے ہُوئے بچّہ کو چپانا چاہتی ہے۔ اسی طرح میری بیوی اپنے سپید مرمری بازو میری گردن میں حائل کرکے میرے سر کو اپنی چھاتی تک کھینچ لاتی۔ اور ہاتھوں کے اشاروں سے اپنے خیالات سمجھانے لگی۔ اپنے ہاتھوں کے لطیف و نازک مس سے وہ مجھے بار بار یہ کہتی ہُوئی محسوس ہوتی تھی۔ کہ تم کیوں غم کرتے ہو۔ جو کچھ خدا کو منظور ہوگا ہوکر رہیگا۔ تم یہ جان کر بہت خوش ہوگے کہ مَیں نے خوشی خوشی جان دی۔"

دکھن بابو نے پانی کا ایک اور گھونٹ پی کر کہا۔

"اُف کتنی گرمی ہے" اور باہر نکل کر برآمدے میں تیز قدمی سے بیتابانہ ٹہلنے لگا۔ پھر واپس آکر بیٹھ گیا اور اپنی کہانی شروع کردی۔ مَیں تاڑ گیا کہ وہ باقی احوال کے منکشف کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا مَیں کسی مسحور کن قوت کے اثر سے کہانی اسکی زبانی کہلوا رہا ہوں۔

وہ سُناتا گیا۔

"میری شادی منورما سے ہوگئی۔ جب کبھی مَیں اس سے محبت بھرے لہجے میں ہمکلام ہوتا، تو وہ سنجیدگی اختیار کرلیتی۔ مجھے گمان ہوتا کہ اس کے دماغ

میں ضرور میری نسبت کوئی نہ کوئی بدگمانی ہے۔ مگر میں نہ سمجھ سکا۔ کہ وہ کیسی بدگمانی ہو سکتی ہے۔

ہاں مجھے اس وقت شراب نوشی سے بہت رغبت تھی۔

خزاں کی ایک شام کو میں اور منوّرما لبِ دریا اپنے باغ میں سیر کر رہے تھے۔ تاریکی کی طاقتیں ہر سمت سے احاطہ کئے ہُوئے تھیں۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم سیرِ خواب میں مصروف ہیں۔ خوف و ہراس سینکڑوں تصورات پیش کر کے آنکھوں کے سامنے بھُوت پریت کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔

منوّرما نے تھکن سی محسوس کی۔ اس لئے وہ نشستگاہ پر کہنی کے بل لیٹ گئی۔ مَیں اس کے برابر ہو بیٹھا۔ اسجگہ تاریکی اور گہری نظر آتی تھی۔ اور آسمان کا وہ ٹکڑا جو ہمیں نظر آ رہا تھا۔ ستاروں کی تنویر سے معمور تھا۔

اس رات میں نشہ سے کچھ بدمست سا ہو رہا تھا۔ چند لمحے متواتر بیٹھنے سے میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس منوّرما درختوں کے سائے تلے لیٹی ہُوئی تھی۔ اِس ہیئتِ کذائی میں اس کے مضمحل انداز نے میرے دماغ میں آرزوؤں کا ایک دریا موجزن کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ منورما بذاتِ خود خالی از وجود ہے۔ اور اس کا مبہم خاکہ میرے خیالات کی تخلیق۔ جسے آغوش میں لانا کوشش بے سود ہو گا۔ عین اس وقت درختوں کی چوٹیوں میں آگ شعلہ زن ہوتی دکھائی دی۔ رفتہ رفتہ بادلوں کی پشت سے ماہتاب نکل رہا تھا۔ اور اس کی نقرئی شعاعیں اس سفید پوش عورت کے چہرے پر ضوفشانی کر رہی تھیں۔ مَیں اس کی زبردست کشش کی مدافعت نہ کر سکا سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "تو تو نہیں یقین آتے نہ آتے ہیں تمہاری محبت کبھی فراموش نہیں کرونگا"

جونہی میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے مَیں چونک پڑا۔ کیونکہ مجھے یاد آ گیا کہ بعینہٖ یہی کلمات تھے جو مدّت ہُوئی میں نے کسی اور موقعہ پر استعمال کئے تھے۔ معاً درختوں کی چوٹیوں پر سُنہری ہلال کے نیچے ٹھیک دریا کے دوسرے کنارے ہا ہا ہا کی آواز آئی اور نہایت سرعت سے ایک موجِ ہوا کی طرح ہمارے سروں پر سے گزر گئی کیا وہ فلک شگاف قہقہہ تھا یا دلدوز نالہ؟ مَیں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مَیں تو سُنتے ہی بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

جب میرے حواس ٹھکانے ہُوئے تو مَیں نے خود کو اپنے بستر پر پڑا پایا۔ میری بیوی نے پُوچھا "تمہیں کیا

ہوگیا ہے۔" میں نے دہشت سے لرز کر کہا۔ "کیا تم نے
آسمان کو قہقہہ لگاتے نہیں سنا۔ ابھی ابھی تمام آسمان
گونج اٹھا تھا۔ ہا ہا ہا۔
یہ سن کر میری بیوی ہنس پڑی اور کہا۔ "تم
اسے قہقہہ سمجھتے رہے۔
"جو کچھ تم نے سنا دراصل وہ پرندوں کے جھرمٹ
کی آواز تھی جو سرعت کے ساتھ ہمارے سروں پر سے
اڑتا ہوا گزر گیا۔ اوئی۔ تم کتنی جلدی ڈر جاتے ہو!"
دوسرے روز پتہ چلا کہ واقعی وہ مرغابیوں کا
ایک جھرمٹ تھا جو تبدیلِ موسم کیوجہ نقل مکانی کرکے جنوب
کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔
جب شام ہوئی میں پھر شک و تذبذب میں
پڑ گیا۔ اور مجھے یہی گمان ہونے لگا کہ گویا تمام آسمان
قہقہہ لگا رہا ہے۔ اور اس کا قہقہہ شب کی تاریکی میں
تحلیل ہو کر گم ہو جاتا ہے۔ انتہا یہ تھی کہ رات کے
وقت مجھے مونو سے گفتگو تک کرنی دشوار ہو گئی۔
میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ مونو کو اپنے ساتھ
کشتی کی سیر کرانے لے جاتا۔ میرے سارے خدشات
نومبر کی خوشگوار ہوا میں کافور ہو گئے۔ اس طرح کچھ روز
میں دلجمعی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اب میں خوش تھا۔
نہایت خوش۔

گنگا عبور کرکے گھور کے پار ہم پدما پہنچے۔ اس
مہیب دریا کا پاٹ اس اژدھے کی طرح جو موسم سرما
کی میٹھی نیند سویا ہو۔ بل کھاتا ہوا حدِ نگاہ تک پھیل گیا
تھا۔ شمال کی جانب ریگ زار کنارے سورج کی شدید
روشنی میں چمک رہے تھے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر
آم کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے۔
دریائے پدما کی خوابیدہ لہریں کبھی پہلو بدلتیں
تو کنارے پر کی زمینوں پر دراڑیں نمودار ہو جاتیں۔
تڑخی ہوئی زمین کا بھربھرا حصہ دریا میں گرتا تو پرسکون
موجوں میں ایک لمحے کے لئے ایک سیمابی کیفیت پیدا
ہو جاتی۔ موجیں اسے اپنی آغوش میں لے لیتیں۔
ایک مناسب جگہ ڈھونڈ کر میں نے کشتی کنارے
لگا دی۔ ایک دن ہم سیر کرنے کی غرض سے باہر نکلے
اور کشتی کنارے لگا کر جنگل میں بہت دور نکل گئے۔
ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زریں کرنیں بتدریج مدھم
پڑتی جا رہی تھیں۔ اور افق سے ایک ماہتابی چادر
فضا میں پھیل رہی تھی۔ اس کی روشنی اس بسیط ریگستان
پر پڑ کر ایک غیر محدود سمندر کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔
جس کے ہر ذرہ کی جھلک ایک نظر فریب موج تھی۔
یا سراب کا ایک دھوکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم دونوں
خواب کی دنیا میں آوارہ و سرگرداں ہے۔ منورما نے

ایک سرخ شال پہن رکھی تھی۔ اس نے سر اور شانے لپیٹ لئے۔ اس طرح کہ صرف اس کا چہرہ نظر آسکتا تھا۔

خاموشی اور بڑھ گئی اور چار سو سوائے خاموشی کی وسیع فضا کے کچھ نہ تھا۔ وہ مجھے اتنی قریب معلوم ہوئی کہ جب اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ وہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اپنا دل۔ اپنا دماغ، اپنی حیات اپنا شباب سب کے سب قربانگاہِ محبت پر بھینٹ چڑھا دیگی۔ میں اپنے مسرت بھرے دل سے یوں مخاطب ہوا۔ "کیا اس وسیع کھلے آسمان کے نیچے محبت کے دو پرستاروں کے لئے اور بھی ایسی موزوں جگہ ہوسکتی ہے؟" پھر مجھے ایسا محسوس ہوا، کہ ہم دو آوارگانِ بے خانماں ہیں۔ جن کی کوئی منزلِ مقصود نہیں ہم یونہی اس راہ پر آوارہ و سرگرداں رہینگے۔ ہاں چاندنی کی اس بے پایاں راہ پر جس کا سلسلہ لاانتہا ہی تھا۔ تمام افکار سے آزاد اور تمام مزاحمتوں سے مبرّا۔

ہم بیخودی کے عالم میں اسی طرح چلے جارہے تھے کہ ایسی جگہ پہنچے۔ جہاں سے ریت کے چند ٹیلوں کی گود میں پانی کی ایک جھیل دکھائی دیتی تھی۔ صاف اور ساکن پانی کی تہ میں چاند کی ایک شعاع شمشیرِ بے نیام کی طرح جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جھیل کے کنارے پہنچکر ہم چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

مونو کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس عالم از خود رفتگی میں اس کی شال اس کے سر سے سرک کر نیچے آرہی۔ میں جھکا اور جھک کر اسکی پیشانی چوم لی۔ اس خاموش سنسان ویرانہ سے ایک آواز اٹھی۔ صاف اور بلند۔ دکھی — دکھی — دکھی۔ میں کانپ گیا۔ میری بیوی لرز گئی۔ لیکن دوسرے لمحے میں ہمیں معلوم ہوگیا کہ وہ آواز نہ انسانی اور نہ غیبی تھی۔ وہ کسی مرغابی کی آواز تھی۔ جو رات کے اس آخری حصّے میں ہماری اجنبی آواز سنکر چونک پڑی۔ اسکو میٹھی نیند میں ہماری آواز کتنی ناگوار گزری ہوگی۔

اس دہشت سے نجات پاکر ہم اپنی کشتی کیطرف تیز قدموں سے لوٹے۔ مونو پر نیند غالب آنے لگی تھی۔

تاریکی میں مجھے ایسا دکھائی دیا کہ کوئی بستر کے قریب کھڑا اپنی لانبی پتلی انگلی سے خوابیدہ مونو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھی ہوئی آواز میں دکھی — دکھی — دکھی پکار رہا ہے۔

میں جلدی سے اٹھا اور لیمپ روشن کیا۔ سنہری تند ہوائیں اڑنے لگی۔ میری شرائین میں خون منجمد ہونے لگا۔ اور پسینے کے بڑے بڑے قطرے

میرے جسم پر بہ نکلے۔ پھر ایک قہقہہ کی آواز بازگشت اندھیری رات میں سُنائی دی۔ ہا! ہا!! ہا!!!

جب یہ آواز ناقابلِ برداشت ہوگئی تو مَیں نے سوچا۔ کہ جبتک مَیں یہ روشنی بُجھا نہ دُونگا۔ مجھے سونا نصیب نہ ہوگا۔ مَیں نے بتی گل کی تو عین اسی وقت مسہری کے قریب جس کے گرد تاریکی احاطہ کئے ہُوتے تھی۔ مجھے آواز آئی۔ دکھی۔ دُکھی۔ دُکھی — میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور شاید وہ اس دھڑکن میں یہی الفاظ دُہرا رہا تھا۔ دکھی۔ دُکھی۔ دکھی — میری گھڑی کشتی میں بدستور بج رہی تھی۔ اور اس کی گھنٹے والی سُوئی مونو کی طرف اشارہ کرتے ہُوتے اچھی طرح ٹک ٹک کی آواز میں دکھی دکھی دکھی کہہ رہی تھی۔

اُس نے اتنا کہا۔ اور اس کے چہرے پر خوفناک زردی دوڑ گئی۔ آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس کا کاندھا جھنجھوڑتے ہُوتے مَیں نے کہا۔

"ذرا پانی پی لو۔"

اتنے میں لیمپ کی بتی جھلملائی اور گل ہو گئی۔ باہر جو دیکھا تو چاند کی روشنی سپیدہ سحر کی نیم تاریکی میں غائب ہو چکی تھی۔ دن چڑھ آیا تھا۔ کوّے کی کائیں کائیں سُنائی دی۔ اس کے بعد ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک، سامنے بیل گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دینے لگی۔ . . . . . . "

دکھن بابو کی صورت میں نمایاں تبدیلی رونما ہُوئی۔ وہاں پہلے سے تردداَت کے نشان مفقود تھے۔ موہوم خطرات کے زیرِ اثر جو بدمستیوں اور مدہوشیوں کا لازمی نتیجہ ہیں۔ وہ بہت سی ناگفتنی باتیں کہہ گیا تھا۔ اور اپنی اس حماقت کے احساس سے شرمندہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ناراض بھی۔

بغیر کسی الوداعی سلام کے وہ پھلانگ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دِن جب کافی رات جا چکی تھی۔ میری نیند پھر اُچاٹ ہوگئی۔ نیند اُڑانے والے الفاظ یہ تھے۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر!

عبدالرشید ارشد

نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں۔

"مینیجر"

سرودِ بہار

اب پھر بہار آئی

اے عندلیب تجھ کو
اے بدنصیب تجھ کو
وہ یاد ہیں فسانے - لذّت بھرے ترانے
یہ حال ہوگیا کیوں
زخمِ جگر دِکھا دے
پامال ہوگیا کیوں
گلشن ترا بنا دے
صیاد و باغباں کے - بے مہر آسماں کے
جور و ستم جہاں کے - دشمن ہیں تیری جاں کے
تیری زباں نے تجھ کو - تیری فغاں نے تجھ کو
غدّار بن کے مارا - آزار بن کے مارا
کس بات کا الم ہے
کیسی ہیں یہ صدائیں
کیوں وقفِ رنج و غم ہے
کیوں ہیں یہ سردِ آہیں
تو ہے غم و محن میں - لیکن تیرے چمن میں
اب پھر بہار آئی
اب پھر بہار آئی

صدمے یہ بیکسی کے
دُکھڑے یہ زندگی کے
غم بے شمار دیکھے - لیل و نہار دیکھے
آزادیِ وطن کے
نغمے مِری زباں پر
بربادیِ چمن کے
صدمے ہیں تیری جاں پر
کیسی بہار آئی - صدمے ہزار لائی
تو کوئے آرزو میں آوارہ جستجو میں
پھرتی ہے آہ بھرتی - جیتی ہے گاہ مرتی
یہ دن ہیں تجھ کو آفت آفت نہیں قیامت
صیّادِ جانستاں کو
پھر دُھن شکار کی ہے
یارانِ شادماں کو
آمد بہار کی ہے
مِل مِل کے گا رہے ہیں - تانیں اُڑا رہے ہیں
اب پھر بہار آئی
اب پھر بہار آئی

ہُنر

اچھوتی شراب

جس شخص نے کبھی دریائے ہڈسن کا سفر کیا ہوگا کوہستان کیٹ سکل کا نقشہ اس کے ذہن سے نہ اترا ہوگا یہ سلسلہ کوہ اپالاچین کی ایک کٹی پھٹی شاخ ہے جو دریا سے دور جانبِ مغرب بہت بلندی تک چلی گئی ہے۔

موسم کا ہر تغیر بلکہ دن رات کی ہر گھڑی ان پہاڑیوں کے ساحر میں اک تغیر، قرب و جوار کے سیدھے سادے لوگوں نے تو اسے ایک مکمل مقیاس الھوا سمجھ رکھا ہے۔ مطلع صاف ہو تو یہ پہاڑیاں نیلی اور ارغوانی نظر آتی ہیں اور انکا خاکہ واضح طور پر سطح آسمان پر نقش ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب باقی منظر صاف اور اُجلا ہوتا ہے تو قلۂ کوہ کے گرد سفید کہر، ڈوبتے آفتاب کی واپسیں کرنوں میں یوں چمکتی ہے جیسے کسی فاتح کے سر پر تاجِ افتخار چمکتا ہے۔

ان خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں، ایک گاؤں سے ہلکا اور بل کھاتا دھواں اُٹھتا نظر آتا ہے گاؤں کی چوبی چھتیں درختوں کے درمیان جہاں بلند مقامات دامنِ افق پر نیلے نیلے دھبے معلوم ہوتے ہیں، چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ پرانے وقتوں کا ایک ننھا سا گاؤں ہے۔ جس کی بنیاد ہسپانوی باشندوں نے پٹرسٹی دی سنٹ کی ابتدائے حکومت کے قریب رکھی تھی۔ ابھی چند ہی برس کی بات ہے کہ اصلی باشندوں کے بنائے ہوئے گھر موجود تھے۔ ان کی کھڑکیاں جالی دار اور پیشانیاں تکون تھیں۔ اور چھتوں پر مرغِ باد نما تھے۔

کئی سال گزرے یہ ملک ابھی برطانیہ عالیہ ہی کے زیرِ نگیں تھا۔ کہ اسی گاؤں میں اور انہی مکانوں میں سے ایک سالخوردہ اور بوسیدہ مکان میں اک سیدھا سادھا شخص، رپ وین ونکل رہا کرتا تھا۔ وہ ان وین ونکلز کی اولاد میں سے تھا۔ جو پٹرسٹی وی سنٹ کے ایام شجاعت میں بہادری کی تصویر اور قلعہ کرسٹیانا کے محاصرے میں اس کے رفیق تھے۔ مگر اُسے اپنے آباو اجداد کی سپاہیانہ صفات سے بہت کم حصّہ ملا تھا۔

وہ سادہ مزاج اور بھولا بھالا تو تھا ہی، مگر ساتھ ہی ہمدرد ہمسایہ اور زن مرید خاوند بھی تھا۔ اسکی وجہ، اس کی طبیعت کی وہ مسکینی تھی۔ جس کے سبب اُسے اس قدر ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ جو شخص اپنی زبان دراز بیوی کے تابع فرمان ہوتے ہیں انہیں خوشامد میں ایک خلص

ملکہ حاصل ہوجاتا ہے - بیوی کی ایک ملامت آمیز تقریر دُنیا بھر کے پند و نصائح سے صبر و برداشت کی کہیں بہتر معلّم ہے - اس لئے بعض پہلوؤں سے لڑاکا بیوی ایک رحمت سمجھی جاسکتی ہے - اور اگر یہ درست ہو تو رپ پر تین رحمتوں کا نزول تھا

وہ دیہاتی عورتوں سے تو ملتا ہی تھا بھلا صنفِ لطیف کی مانند خانگی جھگڑوں میں وہ اس کی طرفداری کیوں نہ کرتیں - جب کبھی وہ رات کو گپیں ہانکنے بیٹھتیں تو تمام الزام رپ کی بیوی کے سر تھوپنے سے کبھی نہ چوکتیں - گاؤں کے لڑکے اسے دیکھتے تو خوشی سے چلّا اُٹھتے - جہاں وہ کھیل میں ان کا شریک تھا، وہاں ان کے لئے کھلونے بھی بنایا کرتا تھا - انہیں پتنگ اُڑانا اور پتھر سے نشانہ لگانا سکھاتا - اور کبھی کبھی بھوت پریت اور اصلی باشندوں کی طویل حکایات بھی سنادیا کرتا تھا - جب وہ گاؤں میں چکّر کاٹتا پھرتا تو اکثر لونڈے اسے گھیر لیتے، اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے اور اسکی آزادی پسند طبیعت کے لئے دِل بہلاؤ کا کافی سامان بہم پہنچاتے اور تو اور، پڑوس میں کوئی کتا تک تو اس پر نہ بھونکتا تھا -

رپ میں نقص تھا تو یہ کہ اُسے منفعت بخش کاروبار سے بعید نفرت تھی - اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ محنت اور استقلال کا عادی نہ تھا - بلکہ محض اسقدر کہ اُسکی طبیعت مشاغل بیکاری کی طرف بہت زیادہ راغب تھی! دن بھر اس کا کام یہ تھا کہ ٹیلے پر بیٹھا تاتاری نیزے کا لمبا دستہ تھامے، تھکے ہارے بغیر دن بھر ماہی گیری کیا کرتا تھا - یا چند پہاڑی کبوتروں اور گلہریوں کے شکار کی خاطر بندوق کاندھے پہ دھرے جنگل، دلدل، نشیب فراز، سب ایک کر دیتا تھا - کوئی پڑوسی مدد مانگے تو اپنے ہزار کام چھوڑ کر اُس کی مدد کرنا اُس کا فرضِ اولین تھا اور اُس کی فرمائش کی تعمیل نہ کرنا مروّت سے بعید - مکی کا چھلکا اتارنے، پتھروں کی فصیل بنانے میں وہ گاؤں بھر میں پیش پیش تھا - اور اُس کا تفوّق سب کے نزدیک مسلّم تھا - جو کام دیہاتی عورتوں کے شوہر خود انجام نہ دے سکتے وہ رپ سے کروالیتیں - قصّہ مختصر، کاروبار اگر غیر کا ہو تو رپ بسر و چشم تیار - لیکن اگر اپنے گھر کا کام کاج اور کھیت کا انتظام ہو تو یہ اس کے لئے وبالِ جان تھا -

سچ تو یوں ہے کہ اس کے نزدیک کھیت میں کام کرنا لاحاصل تھا - اور گاؤں بھر میں یہی ایک چھوٹا سا قطعہ زمین ناقابلِ زراعت و انتظام تھا - کوشش کرتا مگر ہر تدبیر الٹی ہی پڑتی - احاطہ کی دیوار تھی تو وہ برابر گرتی ہی رہتی - گائیں تھیں تو اِدھر اُدھر پھر آکر نیں یا غلّے میں گھس جاتیں - اور نکّمی گھاس تو یقیناً اس کے کھیت میں

سب سے پہلے آگ کھڑی ہوتی تھی۔ بارش ہوتی بھی، تو اُس وقت جب اُسے گھر سے باہر کہیں مصروفیت ہوتی اس کی آبائی جاگیر آہستہ آہستہ اس سے چھن رہی تھی اور اب مکی اور آلوؤں کے ایک قطعہ کے سوا رکھا ہی کیا تھا اس پر بھی اس کا کھیت قرب و جوار میں سب سے زیادہ غیر مزروعہ اور غیر منتظم تھا۔

اس کے بچے تھے تو وہ غیر مہذب اور وحشی گویا ان کا کوئی وارث ہی نہیں۔ بیٹا تھا تو باپ کی شکل و شباہت اور وضع و قطع کے ساتھ ہی ساتھ اس کی عادات کا بھی وارث بنا جاتا تھا۔ وہی باپ کی پرانی دقیانوسی برجس پہن لیتا۔ اور اُسے ایک ہاتھ سے احمقانہ طور پر تھامے، والدہ کے قدم بقدم یوں چلتا نظر آتا۔ گویا کوئی امیر کبیر خاتون خراب موسم میں دامن اُٹھاتے جا رہی ہو اور اس کے جلو میں ایک سردار باادب و تعظیم چلا آرہا ہو۔

رپ وین ونکل ان تن آسان مجہول العقس فارغ البال انسانوں میں سے تھا۔ جو بُرے بھلے کھانے ہی پر قناعت کر لیتے ہیں بشرطیکہ کد و کاوش کے بغیر مل جائے۔ غربت میں فاقہ منظور، حصول دولت کے لئے محنت ناممکن۔ خود اُس کے اختیار میں ہوتا تو کامل اطمینان سے یونہی زندگی گزار دیتا۔ مگر بیوی اس کی غفلت، کاہلی اور اس کی وجہ سے خاندان کی تباہی کے ذکر سے اسکے کان کی تواضع کرتی رہتی تھی۔ اس کی زبان صبح و شام، دن رات ہر وقت رواں تھی۔ اور رپ کے ہر قول و فعل پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کرنے کے لئے تیار۔

رپ کے ہاں ان سب تقاریر کا جواب صرف ایک تھا۔ شانوں اور سر کی مستحکم جنبش، آنکھیں نیچی کر لینا اور مُنہ سے کچھ نہ کہنا۔ مگر بیوی کی طرف سے ایک اور تازہ بوچھاڑ ہوتی۔ آخرکار اسے گھر سے نکلتے ہی بنتی۔ بھلا زن مرید خاوند کے لئے سوائے اس کے چارہ ہی کیا ہے۔

گھر میں رپ کا کوئی رفیق تھا تو اس کا کُتا وولف جو اطاعت اور فرمانبرداری میں اپنے مالک سے کم نہ تھا بیگم رپ اسے بھی کاہلی میں خاوند کا حصہ دار ہی سمجھتی تھی۔ اور اُسے اپنے مالک کی آوارہ گردی کا باعث خیال کر کے آنکھیں بھی دکھایا کرتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ جنگل کے تمام جانوروں سے کہیں زیادہ منچلا تھا۔ اور یہ ہے بھی شریف جانوروں کے شایان شان۔ مگر منچلے پن اور عورت کی بے پناہ زبان کا مقابلہ ہی کیا! گھر میں داخل ہوتا تو دُم زمین سے جا لگتی یا ٹانگوں میں دب کے رہ جاتی بھیگی ہوئی بلی کی طرح کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا۔ اور خائف نظروں سے بیگم رپ کی طرف

دیکھتا رہتا۔ جہاں ذرا بھی جھاڑو یا چنگیر پڑی اور اُس نے دم دبا کر دروازے کا رُخ کیا اور بھاگ نکلا۔

جوں جوں حیاتِ ازدواجی کے ماہ و سال گزرتے جاتے تھے۔ رِپ کی مصیبت بھی بڑھتی ہی جاتی تھی ترش مزاجی ضعیف العمری سے تو کم ہوتا نہیں کرتی اور زبان درازی ایسا اوزار ہے جس کی دھار کثرتِ استعمال سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ رِپ گھر سے نکلتا تو عرصے تک داناؤں، فلسفیوں اور گاؤں کے دیگر کاہل لوگوں کے دائمی کلب میں شامل ہو کر دل بہلا لیا کرتا۔ وہ اپنے اجلاس اس ننھی سی سرائے کے سامنے ایک بنچ پر منعقد کیا کرتے تھے۔ جو شاہ جارج ثالث کی تصویر سے منسوب تھی۔ موسم گرما کے طویل دن ہوتے اور وہ چھاؤں میں بیٹھے گپیں ہانکا کرتے، یا بے معنی، غیر منتہی، خواب آور کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

ان کے وہ فاضلانہ مباحثے جو اس وقت وقوع پذیر ہوتے تھے۔ جب کسی راہرو سے اتفاقاً کوئی پرانا اخبار ان کے ہاتھ لگ جاتا تھا اُن کا سُننا کسی سیاست دان کے مال و منال سے کہیں بہتر تھا۔ کس سنجیدگی سے وہ ان مضامین کو سُنا کرتے تھے۔ جو ایک شائستہ اور تعلیم یافتہ مدرس، ڈیرک وین بمل، جو لغت کے عظیم ترین لفظ سے بھی ہراساں نہ تھا۔ چبا چبا کر سُنایا کرتا تھا۔ اور کس دانائی سے وہ ان امور پر غور و خوض کیا کرتے تھے۔ جو مہینوں پہلے وقوع پذیر ہو چکے ہوتے تھے۔

اس کونسل کی رائے مکمل طور پر نکولس ویڈر کے قبضۂ اختیار میں تھی۔ وہ گاؤں کا رئیس اور سرائے کا مالک تھا۔ سرائے کے دروازے میں صبح و شام بیٹھا رہتا اور دُھوپ سے بچنے اور ایک تناور درخت کی چھاؤں تلے رہنے کے لئے اپنی جگہ سے وقتاً فوقتاً نقل و حرکت کرتا رہتا تھا۔ پڑوسی اس کی نقل و حرکت سے دُھوپ گھڑی کی مانند صحیح صحیح وقت بتا سکتے تھے وہ بولتا کم مگر حقّہ برابر پئے جایا کرتا تھا۔ ہر جلیل القدر ہستی کی مانند اس کے بھی مصاحب تھے۔ جو اس کی باتیں خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے خیالات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتے تھے۔

جب کوئی خبر شاق گزرتی تو وہ حقّہ کے بڑے بڑے کش لینے لگتا اور غصّے میں لگاتار دُھوئیں کے ننھے ننھے بادل اُڑایا کرتا۔ مسرور ہوتا تو آہستگی اور اطمینان سے پیتا اور ہلکے ہلکے بادل اُڑاتا۔ کبھی کبھی حقّہ مُنہ سے ہٹا کر معطر دُھوئیں کو سر کے گرد گھومنے دیتا، اور سر کی جنبش سے کامل اطمینان کا اظہار کیا کرتا تھا۔

اس گوشۂ عافیت میں بھی بدنصیب رِپ کو لڑاکا بیوی کے ہاتھوں آرام سے بیٹھنا نصیب ہوتا

وہ ارکان کی موجودگی سے بے پروا، یکایک مجلس کے سکون کو خاک میں ملا دیتی تھی۔ اس جلیل القدر ہستی نکولس ویڈر کو بھی اس زنِ مرد نما کی بیباک زبان سے چھٹکارا نہ تھا۔ وہ اس پر اپنے خاوند کو سست عادتوں کی جرأت دلانے کا الزام دھرتی تھی۔

بالآخر غریب رپ سخت مایوس ہوگیا۔ اب اسکے لئے چارۂ کار رہ گیا۔ یہی کہ کھیت کے کام اور بیوی کے شور و شر سے بچنے کی خاطر بندوق ہاتھ میں لئے جنگل کو نکل جانا۔ یہاں بعض اوقات ایک درخت تلے بیٹھ جاتا۔ اور تھیلی میں جو ہوتا ولف کے ساتھ بانٹ کھاتا چونکہ وہ دونوں جور و ستم کا نشانہ تھے۔ اسی لئے اُسے ولف سے بیحد ہمدردی تھی۔

"پیارے وُلف، تمہیں مالکہ کے ہاتھوں کُتّے کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ مگر میرے بچے جب تک میری جان میں جان ہے میں تمہارا مددگار ہوں"

ولف دم ہلاتا پوری توجہ سے مالک کا چہرہ تکتا اور اگر کتّوں کو بھی احساس دردمندی ہے تو مجھے یقین ہے، اُسے مالک کے خیالات سے پُورا اتفاق تھا۔

موسم خزاں کے ایک فرحت افزا دن کا ذکر ہے۔ کہ اس نوع کی ایک طویل گشت میں رپ غیر ارادی طور پر کوہستان کیٹ سکل کے ایک بلند ترین مقام پر جا نکلا۔

بس اُسے اپنے اُسی چاہیتے کھیل گلہری کے شکار کی دھن تھی۔ اور پہاڑ کی خاموش تنہا جگہیں اُس کی بندوق کی آواز سے گونج رہی تھیں۔ دوپہر کو وہ ہانپتا کانپتا ایک ہری بھری پہاڑی بوٹیوں سے پُر ایک کھوہ کے عین اُوپر کی چوٹی پر پہنچا۔ اور زمین پر دراز ہوگیا۔

میلوں تک درختوں کے درمیان وہ زرخیز جنگل کا نظارہ کر سکتا تھا۔ اس سے بہت ہی نیچے فاصلہ پر گہرا اور وسیع دریا ہڈسن اپنے خاموش شاہراہ پر گامزن تھا۔ اس کے بلوریں سینے پر کہیں کہیں ایک سست رفتار کشتی کا بادبان یا ارغوانی بادل کا عکس نظر آتا تھا۔ لیکن بالآخر وہ نیلے ٹیلوں میں غائب ہوجاتا۔

دوسری طرف ایک پہاڑ کی وحشتناک سنسان اور ناہموار گھاٹی پیش نظر تھی۔ جس کی قریبی شگافوں کے ریزوں سے پٹی ہوئی تھی۔ اور ڈوبتے آفتاب کی واپسیں کرنوں سے بمشکل روشن تھی۔ رپ پہروں اس نظارے میں محو رہا۔ شام ہو رہی تھی۔ پہاڑیوں کے طویل سایے وادیوں کو تاریک کر رہے تھے۔ گاؤں پہنچنے سے پہلے گھُپ اندھیرا ہونے کا احتمال تھا۔ جب بیوی سے سامنا ہونے کا خوفناک خیال آیا، تو ایک آہ سرد بھری۔

اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دُور سے کسی نے

پکارا۔

"رپ وین ونکل۔ رپ وین ونکل۔"

اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، پہاڑیوں کے درمیان ایک کوّے کی تنہا پرواز کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ سمجھا فریب تخیّل ہے۔ اُترنے کو لوٹا ہی تھا کہ پھر وہی آواز شام کی خاموش فضا میں گونج اٹھی۔

"رپ وین ونکل۔ رپ وین ونکل۔"

ساتھ ہی ولف کی پیٹھ کے روئیں کھڑے ہو گئے اور وہ آہستہ بھونک کر خوفزدہ نظروں سے گھاٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مالک کے قریب دبک کر بیٹھ گیا۔

اب ایک مبہم خوف رپ کو دامنگیر ہوا۔ اور وہ متردد نگاہوں سے اس جانب دیکھنے لگا۔ اُسے ایک اجنبی شخص نظر آیا جس کی کمر بوجھ سے جھکی جاتی تھی۔ اور چٹانوں پر چڑھ رہا تھا۔ سخت حیرت ہوئی کہ یہ سنسان غیر آباد جگہ اور انسان! سمجھا، قرب و جوار کا باشندہ ہے۔ میری امداد کا طالب ہے۔ اور وہ اُس کی امداد کے لئے نیچے اُتر گیا۔

قریب پہنچا اور اجنبی کی انوکھی صورت دیکھ کر اور بھی حیران ہوا۔ وہ پستہ قد چوڑا چکلا تھا۔ بال گھنے گچھے دار۔ بھوری ڈاڑھی تھی۔ لباس ہالینڈ کے قدیم باشندوں کا سا تھا۔ کمر کے گرد انگرکھا، بر جس کے کئی جوڑے وسیع العرض بٹن کی قطاروں سے مزین اور

گھٹنوں پر طرے تھے۔ شانوں پر شراب سے بھرا ہوا کنستر تھا۔ اجنبی نے اشارے سے رپ کو بلایا اور امداد چاہی گو رپ اس نئے دوست سے بدگمان تھا۔ مگر اس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کی فرمائش کی تعمیل کی۔ اور باہمی سعی و کوشش سے وہ ایک تنگ نالی میں چڑھنے گئے۔ جو بظاہر کوہستانی ندی کی ایک خشک گھاٹی معلوم ہوتی تھی۔ چڑھائی کے دوران میں رپ کے کانوں میں کسی بعید گرج کی طویل آواز آتی تھی۔ یہ گرج اسی جانب سے گہری گھاٹی یا چٹانوں کے درمیانی شگاف سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ جس جانب ان کا ناہموار راستہ انہیں لے جا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ٹھٹکا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ شاید بادل کی گرج ہے یا موسلا دھار بارش کی گڑگڑاہٹ ہے۔ کوہستان کی بلندی پر بسا اوقات ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر پھر چل دیا۔ گھاٹی سے گزرے تو ایک تنگ غار کے قریب پہنچے۔ وہ عمودی سواروں سے گھرا ہوا تھا۔ جس کے کناروں میں سے قریبی درختوں کی شاخیں اس انداز سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں کہ کبھی کبھی صرف نیلگوں آسمان اور شام کے رنگین بادلوں کی جھلک ہی نظر آ سکتی تھی۔ اس دوران میں رپ اور اس کا ہمراہی خاموشی سے مصروف کار رہے۔ کیونکہ جہاں اول الذکر اس بات سے سخت متحیّر تھا کہ اس

وحشتناک پہاڑی پر شراب کا کنستر لے جانے سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ وہاں موخر الذکر کے متعلق کوئی بات انوکھی اور بعید الفہم تھی۔ جوڑا اونی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بے تکلفانہ گفتگو کی مزاحم بھی تھی۔ غار میں پہنچتے ہی جدید نادر اشیا پیش نظر ہوئیں۔ ایک ہموار جگہ، چند انوکھی وضع قطع کے آدمی کچھ کھیل کھیل رہے تھے۔ ان کا لباس عجیب و غریب تھا۔ کسی نے انگرکھا پہن رکھا تھا۔ تو کسی نے مرزائی اور پیٹی میں لمبے چاقو آویزاں تھے اکثر نے رپ کے رہبر کی سی جیبیں پہن رکھی تھیں۔ ان کی شکل و صورت بھی انوکھی تھی۔ ایک کا سر بڑا چہرہ چوڑا اور آنکھیں چھوٹی، سور کی مانند چہرہ تو دوسرے کا چہرہ صرف ناک ہی پر مشتمل اور مرغ کی دم سے مزین۔ اس نے ٹوپی بھی عجیب قسم کی پہن رکھی تھی۔ ان لوگوں کی ڈاڑھیاں بھی مختلف قطع کی تھیں۔

ان میں ایک تنومند و مضبوط شخص جس کے بشرہ سے عمر رسیدگی کے آثار ٹپکتے تھے۔ سردار معلوم ہوتا تھا اس نے لبس دار چوڑی پیٹی، چھوٹی سی تلوار بلند کلاہ، اس پر طرۂ سرخ جرابیں اور اونچی ایڑی والے لبس کے پھولدار جوتے پہن رکھے تھے۔ یہ گروہ رپ کو ہالینڈ کے ایک مصوّر کی قدیم تصویروں کی یاد دلاتا تھا۔ یہ تصویر دیہاتی پادری وان شبک کی نشست گاہ میں رکھی تھی۔ اور

یہاں بود و باش اختیار کرتے وقت، ہالینڈ سے لائی گئی تھی۔

رپ کی نگاہ میں سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ جہاں یہ اشخاص بظاہر محو تفریح و تفنن تھے۔ وہاں انکے چہرے سنجیدہ بھی تھے۔ اور اک رازدارانہ خاموشی بھی طاری تھی۔ اور یہ جماعت افسردگی اور مسرت کا ان دیکھا مجموعہ تھی۔ جب گیندیں لڑھکائی جاتیں تو پہاڑیوں سے ٹکرا کر ایک گونج سی پیدا کرتیں۔ لیکن منظر پر بدستور گہری خاموشی طاری رہتی تھی۔

رپ اور اجنبی ان کے قریب پہنچے تو وہ یکایک کھیل سے دست بردار ہو گئے۔ اور اس کی جانب بتوں کی طرح ٹکٹکی باندھے ایسے طور پر دیکھنے لگے کہ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور گھٹنے آپس میں جڑ کر رہ گئے۔ اجنبی نے کنستر ایک بڑے مٹکے میں خالی کر دیا اور اشارے سے اُس سے ساقی گری کی فرمائش کی۔ رپ نے لرزتے لرزتے اطاعت کی اور وہ کامل خاموشی میں شراب کے جام لنڈھا گئے اور پھر کھیلنے لگے۔

رفتہ رفتہ رپ کا خوف و تردد جاتا رہا۔ اس نے نظر بچا کر شراب کا ذائقہ بھی چکھ لیا۔ اس شراب کی بو باس اُسے بہت کچھ ہالینڈ کی نفیس شراب کی سی معلوم ہوئی۔ وہ بہت پیاسا تھا۔ بدیں وجہ دوبارہ شراب کا ذائقہ

چکھنے کی تحریص ہوئی۔ ایک گھونٹ نے دوسرے کا اشتیاق دلایا۔ اور اس نے اتنی دفعہ اس عمل کی تکرار کی کہ آخرکار ہوش و حواس جاتے رہے۔ پلکیں مستی کے بوجھ سے جھپکنے لگیں۔ اور گہری نیند میں غرق ہوگیا۔

اُٹھا تو خود کو اس سرسبز چوٹی پر پایا۔ جہاں اُس بڈھے کو دیکھا تھا۔ آنکھیں ملیں تو صبح کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے جھاڑیوں پر پھدک رہے تھے۔ چہچہا رہے تھے۔ اور عقاب بلندی پر، شفاف بادِ صبا کی رو کے خلاف چکر لگا رہے تھے۔ رپ نے جی میں کہا۔

" یقیناً میں یہاں رات بھر تو نہیں سویا۔"

اس نے نیند سے قبل کے تمام واقعات دُہرائے۔ وہ عجیب الخلقت آدمی جس نے شراب کا کنستر اٹھا رکھا تھا۔ وہ گھاٹی، وہ وحشتناک غار، اجنبیوں کا وہ گروہ اور وہ شراب کا سب کی نظر بچا بچا کر پینا۔

" ارے وہ کمبخت شراب کا مٹکا۔ اب میں بیوی سے کیا بہانہ بناؤنگا؟"

بندوق ڈھونڈھی تو اپنی نئی اور چمکتی ہوئی بندوق کی بجائے ایک دقیانوسی بندوق رکھی تھی۔ جس کی نالی زنگ آلود تھی۔ گھوڑا ٹوٹا ہوا اور دستہ کرم خوردہ تھا

اُسے اب احتمال ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ اُنہی رندانِ میخوار کی کارستانی ہے۔ شراب سے مدہوش کرکے بندوق اُڑا لی ہے۔ ولف بھی تو غائب تھا۔ مگر ممکن ہے وہ کسی گلہری یا تیتر کا شکار کر رہا ہو۔ سیٹی بجائی، نام لیکر پکارا، لاحاصل۔ اس کی اپنی آواز اور سیٹی کی آواز گونجی، مگر کتّا ندارد۔

ارادہ کیا کہ رات کے منظرِ تفریح و تفنن تک پھر پہنچوں۔ اور ان میں سے کسی سے دوچار ہو جاؤں۔ تو بندوق اور کتّے کا مطالبہ بھی کروں۔ اُٹھ کر چلنے لگا تو جوڑ جوڑ میں درد محسوس کیا۔ اور جی میں کہا۔

" یہ کوہستانی گھاٹیاں میرے حسب حال نہیں اور اگر کہیں اس مستی نے مجھے وجع المفاصل کی شکایت پیدا کر دی۔ تو پھر بیوی سے کیسے نبھے گی۔"

گھاٹی سے بدقت اُترا اور جس نالی کے راستے رات کو وہ اور اجنبی چڑھے تھے، تلاش کرتے کرتے اُس تک پہنچا۔ مگر اُسے حیرت ہوئی کہ اب وہاں ایک کوہستانی ندی بہ رہی تھی جو ایک چٹان سے دوسری چٹان پر اچھلتی جاتی تھی۔ اور جس نے اپنی گنگناہٹ سے گھاٹی کو معمور کر رکھا تھا۔ بہرحال کناروں پر چڑھنے کے لئے جست کی۔ صنوبر اور مختلف درختوں کے جھنڈ میں سے بڑی مشکل سے راستہ بنایا۔ کبھی ٹھوکر

کھائی، کبھی انگور کی بیلوں میں الجھ گیا۔ جنہوں نے
اپنے ریشے اور گچھے درختوں میں الجھا رکھے تھے۔ اور
راستہ میں اِک جال سا بچھا رکھا تھا۔

آخر وہاں پہنچا۔ جہاں لیٹ کر اُس نے شگاف
میں سے پہاڑیوں کا منظر دیکھا تھا۔ مگر وہاں اب
شگاف کے آثار تک باقی نہ تھے۔ اور چٹانوں نے
ایک دیوار بنا رکھی تھی۔ جس پر سے ندی لڑھکتی ہوئی
سفید جھاگ کی چادر بُن رہی تھی۔ اور اس وسیع گہری
وادی میں گرتی تھی۔ جو درختوں کا سایہ پڑنے سے
تاریک ہو رہی تھی۔ بیچارے رپ کو یہاں رُکنا پڑا۔
پھر اپنے کُتّے کو پکارا سیٹی بجائی، مگر اس کے جواب
میں صرف بے پرواکووں کے ایک گروہ کی کائیں کائیں
سُنائی دی۔ وہ ڈھلوان چٹانوں کے اُوپر ایک خشک
درخت کے قریب بلندی پر ہوا میں کلیلیں کر رہے
تھے۔ چونکہ بلندی پر محفوظ تھے۔ اس لئے ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ کہ اُسے بنظرِ حقارت دیکھ رہے ہیں۔ اور اسکے
مصائب کا مضحکہ اُڑا رہے ہیں۔

اب کیا ہو سکتا تھا —— صبح ہوتے کافی
دیر ہو چکی تھی۔ وہ بیچارا رات بھر کا بھوکا تھا۔ کُتّے اور
بندوق کے ہاتھ سے جانے کا جو غم تھا وہ تو خیر لیکن
بیوی کا خوف تو قیامت ڈھا رہا تھا۔ پہاڑیوں میں
رہکر فاقہ کشی کب تک ممکن تھی۔ آخر گھر جانا پڑے گا۔
قہر درویش بر جان درویش، اُٹھا پُرانی زنگ آلود
بندوق کاندھے پر دھری۔ اور خوف سے معمور دِل
لئے، گھر کی راہ لی۔

گاؤں کے قریب پہنچا تو لوگوں کا ایک گروہ
مِلا۔ مگر سب اجنبی تھے۔ بہت حیرت ہوئی۔ وہ تو
گرد و نواح کے ہر فرد بشر سے واقف تھا جس لباس
کی اسے عادت تھی، اس سے ان کے لباس مختلف
تھے۔ وہ بھی اسی قدر حیرت سے اسے تک رہے تھے۔
جس جس کی نظر رپ پر پڑتی وہ ایک طنز آمیز تبسم
کے ساتھ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتا۔ اس حرکت کے
متواتر سرزد ہونے سے رپ نے بھی اضطراراً
ایسا ہی کیا —— جب اپنی ڈاڑھی فٹ بھر لمبی
پائی، تو سخت حیرت ہوئی۔ اب وہ گاؤں کے
متصل پہنچ گیا تھا۔ اجنبی بچّوں کا ایک گروہ اس کے
پیچھے ہو لیا۔ وہ شور مچا رہے تھے۔ اور اس کی سفید
ڈاڑھی ان کی انگشت نمائی کا نشانہ بن رہی تھی۔ جب
وہ کُتّوں کے قریب سے گزرتا، جن میں کا ایک بھی
اس سے واقف نہ تھا۔ تو وہ بھونکتے تھے۔ گاؤں بالکل
بدل چکا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ وسیع اور آباد تھا
وہاں اب ایسے مکانوں کی قطاریں تھیں جو اس نے

کبھی پہلے نہ دیکھے تھے۔ اور جن جانی پہچانی ہوئی جگہوں میں اس کی آمد و رفت تھی وہ غائب تھیں۔

دروازوں پر اجنبی نام لکھے تھے اور کھڑکیوں میں اجنبی صورتیں نظر آتی تھیں۔ سب کچھ نیا تھا۔ وہ بھونچکا سا ہوگیا۔ خیال آیا کہ مجھ پر اور گرد و نواح کی دُنیا پر ضرور کوئی افسوں پھونک دیا گیا ہے۔ یقیناً یہی میرا گاؤں ہے۔ ابھی کل مَیں یہاں سے گیا تھا، وہ سامنے کیٹ سکل کی پہاڑیاں ہیں۔ اور فاصلہ پر، ہڈسن بہ رہا ہے۔ نشیب و فراز بھی ویسے ہی موجود ہیں وہ سخت پریشان ہوگیا۔ جی میں کہا۔

"ارے رات کے اس مٹکے نے میرا دماغ ناکارہ کر دیا ہے۔"

گھر کا راستہ بھی ذرا مشکل سے ملا۔ وہ خاموش، دہشت زدہ گھر تک پہنچا۔ ہر لمحہ بیوی کی ترش آواز کا دھڑکا لگا تھا۔ مکان مسمار ہو رہا تھا۔ چھت گر پڑی تھی، کھڑکیاں چور چور تھیں۔ اور کواڑ قبضوں سے خالی ہو رہے تھے۔ ایک نیم فاقہ زدہ ولف کا ہم شکل کُتّا قریب ہی دبکتا پھرتا تھا۔ رپ نے اُسے نام لیکر پُکارا۔ کُتّا غرّایا۔ دانت دکھلائے اور چلتا بنا۔ آہ، یہ ایک رنجیدہ صدمہ تھا۔ رپ نے دردبھری آواز میں کہا۔

"آہ، میرا کتا بھی مجھے بھول گیا"

گھر میں داخل ہوا جسے رپ کی بیوی ہمیشہ صاف ستھرا رکھا کرتی تھی۔ مگر اب وہ خالی اور بظاہر اُجڑا ہوا تھا۔ بیوی کے خوف پر یہ ویرانی غالب آگئی بیوی بچوں کو پُکارا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی آواز سونے کے کمروں میں گونجی اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ اب وہ تیزی سے بڑھا اور اپنے قدیم مرجع دیہاتی سرائے کی راہ لی — آہ وہ بھی نہ تھی —— ایک وسیع چوبی عمارت اس کی جگہ کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیاں فراخ تھیں، ان میں سے کچھ ٹوٹی پھوٹی بھی تھیں۔ دروازے پر لکھا تھا۔

"جوناتھن ڈولٹل کا اتحادی ہوٹل"

اس بڑے پیڑ کی بجائے جو سنین ماضیہ میں ننھی، خاموش، ڈچ سرائے پر اپنا سایہ ڈالتا تھا اب وہاں ایک طویل، عریاں بانس کھڑا تھا اسکے دوسرے سرے پر کچھ سُرخ ٹوپی کی طرح چیز تھی۔ جس پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور جھنڈے پر دھاریوں، اور ستاروں کا لاثانی اجتماع تھا —— یہ سب کچھ عجیب اور بعید از فہم تھا۔

اس نے شاہ جارج کا سُرخ چہرہ اپنی جگہ پر دیکھا۔ اس کے تلے اس نے کئی اطمینان بھری چلمیں

پی تھیں۔ مگر یہ تصویر بھی بالکل بدل چکی تھی۔ سُرخ کوٹ نیلے اور پیلے زرد رنگ کے کوٹ میں تبدیل ہو گیا تھا ہاتھ میں عصائے شاہی کی بجائے تلوار تھی۔ سر جرنیلی ٹوپی سے مزیّن تھا۔ اور نیچے جلی حروف میں لکھا تھا

"جرنیل واشنگٹن"

حسبِ دستور دروازے کے قریب لوگوں کا ایک گروہ منڈلا رہا تھا۔ رپ ان میں سے کسی کو بھی تو نہ پہچانتا تھا لوگوں کی ہیئت تک بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سرد مہری اور خاموشی کی بجائے مناظرانہ لہجہ رائج تھا۔ اس نے ناحق تدبیر یعنی اپنے پرانے رفیق نکولس ویڈر کی تلاش کی۔ جس کا چہرہ چوڑا، ٹھوڑی دوہری اور حقہ مناسب طول کا تھا۔ اور وہ بے معنی تقاریر کی بجائے [illegible] کے بادل اڑایا کرتا تھا۔ اور مدرس وین بمل جو اخبار کے مضامین کا تھوڑا تھوڑا حصّہ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ ان کی جگہ ایک کمزور، تلخ مزاج شخص جیبیں اشتہارات سے بھرے شدومد کے ساتھ شہریوں کے حقوق، انتخاب، پارلیمنٹ کے ارکان، آزادی، بنکر کی پہاڑیاں، چھینبر کے بہادر وغیرہم کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ یہ الفاظ حیرت زدہ رپ کے لئے بالکل ناقابل فہم تھے۔

رپ کی ہیئت عجیب، لانبی سفید ڈاڑھی زنگ آلود شکاری بندوق، بھدّا لباس، اس کے پیچھے بچّوں اور عورتوں کا گروہ یہ سب چیزیں سیاست دانوں کے لئے جاذبِ توجہ ثابت ہوئیں۔ اور وہ اُسے سرتاپا گھورتے ہوئے، شوقِ تحقیق سے مجبور ہو کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ مقرر اس کی جانب دوڑا اور ایک طرف لیجا کر پوچھا۔ کس طرف ووٹ دو گے؟ کچھ رپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اُس کا مُنہ تکتا رہا۔ ایک اور پستہ قد شخص نے بازو کھینچا، اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر، کان میں کہا۔

"تم مرکزی جمہوریت کے حامی ہو کہ صوبوں کی فردی حکومت کے؟"

رپ کی عقل سے یہ سوال بالا تھا۔ اتنے میں ایک واقف کار بڈّھا جرنیلی ٹوپی پہنے، لوگوں کو اپنی کہنیوں سے دائیں بائیں ہٹاتا مجمع میں گھس گیا، اور ایک ہاتھ کولے پر دوسرا بید پر دھرے، وین ونکل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آڑی ٹوپی، تیز نگاہیں تیروں کی طرح رپ کے سینے کے پار ہوئی جاتی تھیں اس نے رپ سے پُوچھا۔

"یہ تم کاندھے پر بندوق دھرے لوگوں کو جمع کئے کیا کر رہے ہو۔ کہیں تم گاؤں میں بلوہ تو نہیں کرانا چاہتے؟"

رپ نے کچھ پریشان ہو کر کہا۔

" بھلے مانسو! مَیں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ یہیں کا رہنے والا ہوں۔ اور خدا بادشاہ کو سلامت رکھے۔ اس کی وفادار رعایا ہوں۔"

لوگوں نے شور مچا دیا۔

" شاہ پرست، شاہ پرست، جاسوس، جاسوس، دھکے دیکر نکال دو۔"

شخص جس نے اس سے پُوچھا تھا کہ کہیں تم بلوہ تو نہیں کرانا چاہتے؟" اُس نے انہیں خاموش کرایا۔ پھر دس گنا سخت اور تُرش رو ہو کر گمنام ملزم سے پُوچھا۔

" یہاں کیوں آئے ہو اور کسے ڈھونڈھتے ہو؟"

بیچارے نے یقین دلایا۔ کہ مَیں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ پڑوسیوں کو ڈھونڈھنے آیا ہوں جو سرائے کے قریب رہتے تھے۔"

" درست۔ تو پھر وہ کون ہیں، نام لو۔"

رپ نے لحہ بھر کچھ سوچا، پھر بولا۔

" اچھا تو نکولس ویڈر کہاں ہے؟"

" نکولس ویڈر؟ اُسے وفات پائے تو اٹھارہ برس ہونے آئے۔ گورستان میں ایک چوبی تختہ ہوا کرتا تھا، جس سے اس کے حالات معلوم ہو سکتے تھے۔ مگر اب وہ بھی نہیں رہا۔"

" تو پھر برام ڈچر کہاں ہے؟"

وہ ابتدائے جنگ ہی میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں۔ سٹونی پوائنٹ کے دھاوے میں مارا گیا۔ بعض کا خیال ہے۔ انٹونی نوز کے دامن میں طوفان کا شکار ہو گیا۔ مَیں نہیں جانتا — بہرحال وُہ واپس نہیں آیا۔"

" اور وین بل مدرس؟"

" وہ بھی جنگ میں شامل ہو گیا تھا۔ بڑا فوجی جرنیل تھا۔ اب تو وہ پارلیمنٹ میں ہے۔"

گھر بار عزیز و اقربا میں یہ تغیرّ! رپ کا دل بیٹھ گیا۔ ہر جواب اس کے لئے باعث پریشانی تھا۔ یہاں ان امور کا تذکرہ تھا جو اس کے لئے ناقابلِ فہم تھے۔ جنگ، پارلیمنٹ، سٹونی پوائنٹ۔ اُس کی جانے بلا یہ کیا تھے؟

کسی اور دوست کو پُوچھنے کی تاب نہ رہی، اور مایوسی کے لہجے میں پُوچھا۔

" اور یہاں رپ وین ونکل کو کوئی بھی نہیں پہچانتا؟"

دو تین بول اُٹھے۔

" اوہ، رپ وین ونکل، واہ، جانتے کیوں نہیں

وہ درخت سے پیٹھ لگائے رپ وین ونکل ہی تو کھڑا ہے۔"

رپ نے دیکھا تو جیسی پہاڑیوں پر جاتے وقت اس کی اپنی شکل تھی ویسی ہی صورت اپنے سامنے دیکھی بظاہر ویسا ہی کاہل اور بھدا بھی ویسا ہی تھا۔ غریب رپ بالکل پریشان ہو گیا۔ اپنے آپ پر اُسے شک ہونے لگا۔ کہ وہ خود، خود ہی تھا یا کوئی اور۔ وہ اس کشمکش و پیچ میں تھا کہ جرنیلی ٹوپی والے شخص نے دریافت کیا۔

"تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس نے حواس باختہ ہو کر جواب دیا۔

"خدا جانے۔ مَیں، مَیں تو نہیں ہوں۔ ہو نہ ہو مَیں کوئی اور ہوں۔ وہ دیکھو وہ سامنے مَیں ہی تو ہوں۔ نہیں وہ تو میرے بھیس میں کوئی اور ہے۔ رات تو مَیں مَیں ہی تھا، مگر مَیں پہاڑیوں پر سو گیا۔ اُنھوں نے میری بندوق بدل دی۔ بندوق کیا بدلی، سبھی کچھ بدل گیا۔ مَیں خود بدل گیا۔ مَیں نہیں بتا سکتا، مَیں کون ہوں یا میرا نام کیا ہے؟

تماشائی ایک دوسرے کا مُنہ تکنے اور آنکھوں میں معنی خیز اشارے کرنے لگے۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کہ بندوق چھین لی جائے۔ اور بُڈھے کو ضرر پہنچانے سے روکا جائے۔ یہ اشارہ پاتے ہی جرنیلی ٹوپی والا شخص تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نازک وقت میں ایک تازہ وارد خوشرو عورت، سفید ڈاڑھی والے بُڈھے کو دیکھنے کے لئے مجمع میں گھس آئی۔

اس کی گود میں ایک بھولا بھالا بچّہ رپ کی آنکھوں سے خوفزدہ ہو کر چلانے لگا۔ عورت بول اُٹھی۔

خاموش رپ، خاموش، بُڈھا تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

بچّہ کے نام، ماں کی شکل و شباہت اور اس کے لہجہ نے رپ کے دماغ میں خیالات کا ایک سلسلہ پیدا کر دیا۔

"کیوں بیٹی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"جوڈتھ گارڈینر"

"اور تمہارے باپ کا نام؟"

"آہ اُس بیچارے کا نام رپ وین ونکل تھا۔ بیس برس ہونے آئے، جب وہ گھر سے بندوق لیکر گیا تھا۔ اب تک اس کی خبر نہیں آئی۔ کُتّا تنہا گھر آگیا مگر کسے معلوم، اس نے خودکشی کر لی یا کوئی اُسے اُٹھا لے گیا۔ اس وقت مَیں ابھی بچّی ہی تھی۔"

رپ کو بس ایک سوال کرنا تھا۔ اُس نے تھرتھراتی آواز میں پُوچھا۔

"اور تمہاری والدہ کہاں ہے؟"

"آہ اُسے وفات پاتے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا اُس نے ایک خوردہ فروش کے ساتھ لڑتے ہُوئے اپنی شریان کاٹ ڈالی تھی۔

چلو یہ خبر تو مسرت کا ایک پہلو لیے تھی۔ بڈھا زیادہ صبر نہ کر سکا۔ بیٹی اور نواسے کو چھاتی سے لگا لیا۔ اور بولا۔

"مَیں ہی تمہارا باپ ہوں۔ کبھی نوجوان رپ وین ونکل تھا۔ اب بڈھا رپ وین ونکل ہوں۔ ایسے غریب رپ وین ونکل کو کوئی نہیں جانتا؟"

رپ ششدر کھڑے تھے۔ اتنے میں ایک بڑھیا مجمع سے لڑکھڑاتی نکلی۔ پیشانی پر ہاتھ دھرا، ایک لمحہ تک اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ پھر بولی۔

"یقیناً یہ رپ وین ونکل ہی ہے۔ رپ وین ونکل ہی ہے۔ میرے پُرانے پڑوسی! خوش آمدید۔ یہ بیس برس تم نے کہاں گزارے؟"

رپ کو مخمصہ سے جلد نجات مل گئی۔ پُورے بیس برس اس کے لئے بمنزلہ ایک رات کے تھے۔ پڑوسیوں نے سُنا تو گھورنے لگے۔ بعض اشارے کرنے لگے۔ جز تیلی ٹوپی والے شخص نے جو خطرہ گزر جانے پر پھر میدان میں آگیا تھا۔ سر کو ایک متکبرانہ جنبش دی۔ جس پر مجمع میں ہر شخص نے سر کو جنبش دی۔

بہرحال بڈھے پیٹر وانڈر ڈانک کی رائے لینا مناسب سمجھا گیا۔ وہ اسی نام کے مشہور مورخ کی اولاد تھا۔ جس نے مُلک کے قدیم ترین حالات لکھے تھے۔ پیٹر اسی گاؤں کا قدیم ترین مکین تھا۔ اور پڑوس کے تمام عجیب و غریب امور اور روایات سے واقف، وُہ فوراً رپ کو پہچان گیا۔ اور تسکین بخش طریقے سے اس کی روایت کی تصدیق بھی کر دی۔ اس نے مجمع کو یقین دلایا کہ اس کے مورثِ اعلےٰ مورخ سے یہ حقیقت سینہ بہ سینہ اس تک پہنچی ہے کہ کوہستان کیٹ سکل پر ہمیشہ انوکھی شخصیتوں کی آمد و رفت رہی ہے۔ اور یہ امر مصدقہ ہے کہ دریا اور صوبہ کا مکتشف اول ہنڈرک ہڈسن اعظم اپنی سیاحتی جماعت کی معیت میں ہر بیس برس کے بعد اس کی سیر کے لئے آتا ہے۔ اس کے والد نے بھی ایک دفعہ کوہستانی غار میں انہیں ڈچ لباس میں ملبوس، نائن پنز کھیلتے دیکھا تھا۔ اور اُس نے خود بھی موسم گرما کی ایک دوپہر کو گرج کی مانند اُن کی گیندوں کی آواز سُنی تھی۔

قصّہ مختصر مجمع منتشر ہو کر انتخاب کے اہم ترین متعلقات میں مصروف ہوگیا۔ رپ کو بیٹی اپنے ہاں رہائش کیلئے لے گئی۔ اُس کا مکان آرام دہ آراستہ و پیراستہ تھا۔ اور اس کا خاوند ایک مضبوط خوش مزاج

کسان۔ رپ نے دیکھا تو اسے ان لونڈوں میں سے
پایا جو اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا کرتے تھے۔ رہا رپ کا بیٹا
اور وارث، جو اس کا نعم البدل تھا اور جسے اس نے
درخت کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ اسے ایک کھیت
میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ مگر وہ باپ کا فرزند رشید ثابت
ہوا تھا۔ اور اس نے سب عادتیں ورثے میں پائی تھیں۔
یعنی غیر کا کام کر سکتا تھا۔ اپنا نہیں۔

رپ نے اپنی قدیم عادات پھر اختیار کر لیں۔
جلدی ہی قدیم دوست بھی مل گئے۔ جو گردش زمانہ سے
خستہ ہو رہے تھے۔ مگر اس نے جدید نسل پر ان کو ترجیح
دی اور جلدی ہی ان میں رل مل گیا۔

گھر میں کام کاج تھا نہیں، اور وہ پہنچ بھی اس عمر
کو گیا تھا۔ جب بغیر تکلیف کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے
ایک دفعہ پھر وہ سرائے کے دروازے میں بنچ پر جا بیٹھا
اس کی قدر و منزلت بھی گاؤں کے ایک جلیل القدر بزرگ
اور زمانہ قبل جنگ کے تاریخ دان کی سی ہونے لگی کچھ
عرصہ بعد وہ صحیح معنوں میں گپ شپ بھی ہانکنے لگا۔
اور ایک عرصے کے بعد اس میں ان انوکھے امور کے
سمجھنے کی اہلیت بھی پیدا ہوئی۔ جو اسکے ایام خواب میں
وقوع پذیر ہو چکے تھے یعنی انقلابی جنگ کیسے ہوئی
انگلستان کی غلامی کا جوا ملک نے کیسے اتار پھینکا اور
ہز میجسٹی جارج ثالث کی رعایا ہونے کی بجائے وہ اب
اضلاع متحدہ کا آزاد باشندہ کیسے تھا۔

درحقیقت رپ کوئی سیاست دان تو تھا نہیں، ریاستوں
اور سلطنتوں کے تغیر و تبدل اس پر کیا اثر کرتے مگر ایک قسم کی
غیر آئینی حکومت ضرور تھی۔ جسکے ہاتھوں وہ مدتوں نالاں رہا
اور وہ حکومت تھی بیوی کی۔ خوش قسمتی سے وہ اب ختم ہو چکی
تھی۔ ازدواج کے جوئے سے گردن اب آزاد تھی۔ جب
چاہتا بغیر بیوی کے خوف کے اندر باہر آجا سکتا تھا۔ جب
کبھی بیوی کا نام لیا جاتا، تو سر ہلا دیتا۔ شانوں کو جنبش دیتا
اور نگاہ آسمان کی طرف اٹھ جاتی ـــ ان اشاروں سے قسمت پر
رضامندی اور آزادی کی مسرت، دونوں باتیں مفہوم ہو سکتی تھیں۔
جو شخص مسٹر ڈولٹل کے ہوٹل میں آتا اسے رپ اپنی سرگزشت سنایا
کرتا تھا۔ چونکہ ابھی بیدار ہوتے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اسلئے شروع
شروع میں ہر دفعہ وہ کئی امور میں اختلاف بیانی کرتا رہا۔ بالآخر میری
بیان کردہ روایت پر اتفاق عام ہو گیا۔ پڑوس میں ہر عورت، مرد
بچے کو یہ کہانی ازبر ہو گئی بعض ہمیشہ اسکی واقفیت پر شک کرتے تھے
انہیں اصرار تھا کہ رپ مخبوط الحواس ہو گیا ہے۔ بہرحال ڈچ باشندے
تمام و کمال اس کے قائل تھے۔ اب بھی جب کبھی موسم گرما میں دوپہر کے
وقت کیٹ سکل کے قریب رعد کی آواز سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ
ہنڈرک ہڈسن اور اسکے رفیق نائن پنز کھیل رہے ہیں۔ پڑوس
میں جب کبھی زن مرید شوہروں کو زندگی دشوار معلوم ہوتی ہے تو انہیں خواہش ہوتی
ہے کہ کسی طرح رپ وین ونکل کے مٹکے سے اک گھونٹ جرعہ مل جائے۔

وجدانیات

آشیاں سے ہم تماشائے خزاں دیکھا کئے ۔ دیکھتی آنکھوں سے نیرنگِ جہاں دیکھا کئے

آپ کے سحرِ تبسّم کا سماں دیکھا کئے ۔ خرمنِ ایماں پہ گرتی بجلیاں دیکھا کئے

رات ان رنگیں لبوں کو خونفشاں دیکھا کئے ۔ موجزن دل میں شرابِ ارغواں دیکھا کئے

دردِ فرقت پر کیا کچھ غور بھی یا تم یُونہی ۔ گل طرازی ہائے چشمِ خونچکاں دیکھا کئے

تجھ کو اک دِن بھی نہ دیکھا مائل خوئے کرم ۔ بدگماں دیکھا کئے نامہرباں دیکھا کئے

ان کا آنا تھا کہ دِل پر چھا گئیں شادابیاں ۔ ہر طرف ہم گلستاں ہی گلستاں دیکھا کئے

کوہِ ایمن سے کوئی پُوچھے تیرے جلوؤں کے رنگ ۔ یہ ہمیں تھے جو تجھے دِل میں نہاں دیکھا کئے

ان سے مِل کر بھی جدائی کا خیال آتا رہا ۔ ہم بہارِ شوق میں رنگِ خزاں دیکھا کئے

تیری رنگینی سے تھا لبریز دامانِ خیال ۔ اپنے پہلو میں تجھے ہم گلفشاں دیکھا کئے

اضطرابِ ہجر میں تو نے بھی آنکھیں پھیر لیں ۔ رات بھر ہم راہ مرگِ ناگہاں دیکھا کئے

ضبط کی مجبوریاں عابد قیامت ہو گئیں
جل گیا پروانہ ہم آتش بجاں دیکھا کئے

عابد

ایک خط

(۱)

غالباً تم اس وقت دہلی ہوگی۔ مَیں اپنے حافظے کی مدد سے پُرانی دہلی کے اُن کھنڈرات کا تصوّر کرسکتا ہوں جہاں کی سیر تمہارا محبوب مشغلہ ہے۔ کل اتفاقاً تمہارے خاوند سے ملاقات ہوگئی۔ جن کی زبانی معلوم ہُوا کہ تم اپریل کے وسط میں واپس آؤ گی۔ گھر پہنچنے پر مجھے ایک چٹھی ملی۔ جس کے متعلق دوران تحریر میں تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ لیکن مَیں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم اس وقت اس تحریر کے انجام کو پڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ مَیں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اور فوراً بتا دیتا اگر کسی غیر متوقع چیز کا فوراً بتا دینا آسان ہوتا۔ ہاں اگر تم اس تحریر کو تمام و کمال پڑھ گئیں، تو انداز بیان اداے مطالب اور طرز خیال سے سمجھ جاؤ گی کہ مَیں کوئی انکشاف کیا چاہتا ہوں۔

بیشک یہ انکشاف ہے۔

مختصراً یہ وہی چٹھی تھی جس کا مَیں پہلے ذکر کرچکا ہوں جس کی وجہ سے میرا تخیّل دہلی کے کھنڈرات میں جا پہنچا تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ مَیں اپنی عمر کی کسی بہار فرصت کے دن تمہارے ساتھ دہلی جاؤں۔ لیکن اس چٹھی کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ اب مَیں دہلی کو صرف تخیّل کے آئینے میں جھلکتا ہُوا دیکھ سکونگا۔ اور اُن بیداغ حیرت انگیز چاندنی راتوں کا صرف تصوّر ہی کرسکونگا۔ جن میں تم اکثر مصروف سیر رہی ہو۔ اور مجھے معلوم ہُوا کہ مَیں "تمہیں" بھی کبھی نہیں دیکھ سکونگا۔ "تمہیں" سے مراد تمہاری وہ شخصیت ہے جسے عام لوگ ظاہری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

تم اپنی ذہانت کی وجہ سے اس راز کے انکشاف کی حقیقت کو سمجھ گئی ہوگی۔

یہ کہنا کہ مَیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی انکشاف راز نہیں۔ جوانی عزّت کے قابل ہے۔ اور مرحوم اشخاص کے گناہ عفو کے سزاوار ہیں۔ یہ اس لئے لکھا گیا ہے کہ مَیں مرچکا ہوں۔ اس تحریر کے سوا میری تمہاری کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور اپریل کے وسط سے پیشتر لوگ مجھے مدفن کہینگے۔ مَیں ایک رُوح بن چکا ہوں۔ دُنیا سے میرے تعلقات منقطع ہوچکے ہیں۔ مَیں اپنی حساب کی کتابوں کو ٹھیک ٹھاک کرچکا ہوں وصیّت لکھ چکا ہوں۔ ہاں دُنیا میں چھوڑنے کے لئے میرے

پاس کچھ نہیں۔ تمہارے لئے مَیں ایک چھوڑے جاتا ہوں
اپنی یاد۔

دُنیا میرے لئے یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ کل
مجھے عبدالحی صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی ملے۔ اُنہوں نے
کہا کہ میرا بل جون میں اسمبلی کے سامنے پیش ہوگا۔ مجھے
تعجب ہُوا کہ جون کیا چیز ہے۔ اور پھر مَیں یہ سوچ کر
ہنس دیا۔ کہ جون تو کبھی آئیگا ہی نہیں۔ جون کبھی نہیں
آئیگا۔ ذرا ایک لمحے کے لئے اس بات کا تصوّر
کرو۔ ہم خودکشی کے اخلاقیات پر بحث کر چکے ہیں۔
اب تم سمجھ جاؤ گی کہ جون کیوں نہیں آئیگا۔

تمہیں وہ انگشتری یاد ہوگی جو مَیں ہر وقت
پہنے رہتا ہوں۔ تم نے ایک دو دفعہ مجھ سے پُوچھا کہ
اس میں یہ سبز نگینہ کس پتّھر کا ہے۔ تم نے اس کے
متعلق میری بدذوقی کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر مَیں نے
جواب دیا کہ مَیں اسے یادگار کے طور پر پہنتا ہوں تمہارا
خیال تھا کہ یہ کسی عورت کی نشانی ہے۔ لیکن یقین کرو
کہ تمہارے سوا کسی عورت کو میری زندگی میں دخل نہیں
یہ انگشتری کسی گزرے ہُوئے عشق یا نفرت یا کسی اور
ایسے احساس کی یادگار نہیں۔ جو انسان کی زندگی میں
واقعات کی طرح پیش آتا ہے۔ بلکہ اس انگشتری کو
لا اتنا ہی اذیت سے تعلق تھا۔ اور یہ خُدا جانتا ہے
کہ اس اذیّت میں اطمینان نصیب ہے کہ نہیں۔ اگر
یہاں ثقیل الفاظ کا استعمال جائز ہے تو مَیں کہہ سکتا
ہوں کہ اذیت اُس انگشتری میں پنہاں تھی وہ اذیت
جو زندگی کی تکالیف اور نقصانات کے عدم وجود سے
مُراد ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ صرف یہی انگشتری تھی۔
کہ جس کے متعلق ہم دونوں مختلف الرائے تھے۔ یہ میری
فطرت میں داخل تھا کہ میرے دِل میں خودکشی کا خیال
آئے کیونکہ تقدیر کا آہنی ہاتھ لکھ چکا تھا۔ کہ مجھ پر تکالیف
کا ہجوم ہوگا۔ جن کا جواب میرے پاس صرف ایک ہے
ترکی بہ ترکی جواب۔ یہ انگشتری میرا وسیلہ ہے۔ اس میں
زہر ہے۔ مَیں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔ پیاری مجھے
تم سے ہمیشہ ہی سے پیار رہا ہے۔ دُنیا کے انتہائی بُعد
سے چلکر ہم تشکک کی ایک عام حالت پر پہنچے۔ مَیں
یہ نہیں جانتا کہ ہم میں سے پہلے یہ کس نے کہا۔ کسی
بات پر اعتماد نہ کرو۔ اور کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ ہم دونوں
نے شاہراہِ حیات میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں
لوگوں نے تمہارے حسن، تمہاری دولت، تمہارے
رُتبے کو حسد کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ سلوک میری
لیاقت، میری ذہانت، میرے خطابات، میرے
ذوق سلیم اور میرے مساعد واقعات سے ہوا ہے!
عظیم الشان مجرم اور نہایت دانا آدمی۔ ایک

سبق سیکھتے ہی کسی چیز پر یقین نہ کرو۔ کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔

تم تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔ کہ میں اپنے آپ کو کسقدر مطمئن اور فارغ البال محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہوگا۔ صبح گیارہ بجے سے پہلے میری گرفتاری عمل میں نہیں آسکتی۔ اس لئے میرے پاس دس کامل گھنٹے موجود ہیں۔ جن میں تم سے بات چیت کر سکوں۔ میں اپنے خیالات کو اطمینان سے قلبند کر سکتا ہوں۔ یہ ہر ایک پنہاں جذبے کی خصوصیت ہے۔ کہ آخر کار اس میں صداقت پیدا ہو جاتی ہے خاموشی ایک بند کی طرح ہے جب پانی میں سیلاب مثال قوت پیدا ہو جاتی ہے تو بند ٹوٹ جاتا ہے۔ میں اس خود ستائی میں مبتلا نہیں کہ میں تمہیں اپنی محبت کے سیلاب میں بہا کر لیجاؤنگا۔ مجھ میں یہ فطرتی طاقت موجود نہیں۔

شاید تمام عمر مجھ میں اسی طاقت کی کمی رہی ہے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت کی اس کیفیت میں جو تہذیب کے ان معمولی مظاہر کی پابند نہیں رہ سکتی۔ جو ہماری روزمرّہ زندگی کو جذبات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ کوئی ہمہ گیر اثر ہونا ضرری نہیں۔ انسان محبت کے لئے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے اور ہر ایک عظیم احساس کا آخری نتیجہ جرم ہوتا ہے۔

لیکن تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی۔ اور میری محبّت نے اس رسمی تہذیب میں کمی پیدا کر دی تھی جو اکثر و بیشتر حقیقی ہوتی ہے۔ لیکن جو کبھی کبھی کائنات کی فرسودگیٔ خیال کو چھپانے کے لئے پردہ پوشی کا کام ادا کرتی ہے۔

مَیں بھی رسمیات عہد کا پابند ہوں۔ اور کسی بہت بڑی اخلاقی جُرأت کے ناقابل۔

مَیں تم سے اظہار محبّت کرنے سے اسی طرح ڈرتا ہوں جس طرح ایک پرندہ آدمی کی مصنوعی نقل سے ڈر کر کھیتوں کے قریب نہیں آتا۔

یاد رہے کہ مَیں اپنے آپکو رسمیات عہد کا پابند کہتا ہوں تمہیں نہیں۔

تم مکان و زمان سے بے نیاز ہو۔ تم کائنات کی بہترین تخلیق ہو۔ ایک محبوب عورت۔ تم وہ شیریں نغمہ ہو، جس نے اوّل اوّل عدم کے پردے کو چاک کر کے وجود کی فضا میں اپنے تاثرات کو ثبت کیا۔ تم وہ رسیلا گیت ہو۔ جو اس دُنیا کے اختتام پر جس کو تکالیف سے لبریز پیدا کیا گیا۔ اور جس نے دورانِ عمر میں تمام نیک و بد کو اپنے اندر مجتمع کر لیا۔ گایا جائیگا۔

لیکن ازبسکہ میں اپنی رسمیات عہد کا پابند ہوں میں اپنے رنج اور عشق کا بیان اسی طرح کرونگا جس طرح عام لوگ کرتے ہیں۔

یہ کام بہت مشکل ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو کہ میں ابتدا کس طرح کروں۔ کیا تم باور کروگی کہ مجھے جب تمہارا خیال آیا تو ساتھ ہی تمہیں بھول جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کیا تم باور کروگی؟

یہی میرا راز ہے۔ یہی میرے اعتراف کی رُوح ہے۔

دوری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ تنہائی بھی تمہاری یاد کو محو نہیں کر سکتی۔ اور ازبسکہ مجھے ازلیت کی تسکین پر اعتماد نہ تھا۔ مجھے تمہاری جُدائی اور بھی شاق گزرتی تھی۔

کاش تمہارے عشق کے حصول کے لئے ممالک کی فتح ایک شرط ہوتی۔ مگر نہیں۔ میں کچھ بھی نہ کر سکتا۔ میں تمہاری آواز سے دُور رہ کر جی ہی نہیں سکتا۔ خُدا جانے تُم مجھے کس وقت یاد کرتیں۔ لیکن تم نے مجھے کبھی یاد نہ کیا! کبھی نہیں! اور اب وقت ہاتھ سے گزر گیا!

اس کے علاوہ میں رسمیاتِ عہد کا پابند ہوں اور یہ دور کام کرنے کا نہیں۔ بلکہ عظیم الشان تخیّل کی جولانی دکھانے کے لئے مخصوص ہے۔ وہ لمحے جو تمہاری جدائی کے تھے۔ گزارنے کے لئے کچھ مشغلہ ضروری تھا۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ بصورتِ دیگر میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔

کام کاج! بھلا کونسا کام کاج ایسا ہے جو تمہاری یاد کو میرے دِل سے محو کر سکتا۔ وہ دل جس کی ہر ضرب تمہارے عشق کی گرمی سے تحرک میں آتی تھی۔

تم میرے لئے صداقت اور سنجیدگی مجسم تھیں اور اسی لئے میں نے تمہیں جھوٹ اور جذبات کے ہجوم میں گم کر دینا چاہا۔

اس بے پناہ عشق سے جو میری رُوح پر طاری تھا۔ بچنے کے لئے میں نے کمینہ پن اختیار کیا تا کہ میں تمہیں فراموش کر دوں۔ شاید میں دیوانہ ہو چکا تھا۔

میں نے جُوا کھیلنا شروع کیا۔ پہلے اپنے روپے سے۔ پھر دوسروں کی دولت سے تم اقبال بہادر کی جائداد سے میرا تعلق جانتی ہو نا! میں ان کی تمام دولت کا سرپرست ہوں۔ میں نے اسی دولت سے آنکھیں موند کر اور مستقل بے نیازی سے کھیلنا شروع کیا۔ یہ کھیل اسی طرح کا تھا جس طرح کوئی شخص ایک عنان شکستہ گھوڑے پر سواری کرے۔

اب اس کا نتیجہ نکلا۔ حسب توقع میں گر پڑا۔ یوں تو میں زندہ ہوں۔ لیکن میری کمر ٹوٹ گئی ہے۔ اقبال بہادر کی

شادی ہونے والی ہے۔ اور تھوڑے سے عرصے میں مجھے سب حساب و کتاب دینا ہے۔ مَیں باقاعدہ حساب نہیں دے سکتا۔ اس لئے مَیں مر گیا ہوں۔

ابھی ابھی ایک چوہا کسی کونے میں سر نکالے میری طرف تاک رہا ہے۔ میرے لئے یہ حقیر جانور ایاس معبود جیسی ہے۔ یہ اس تقدیر کا پیغامبر ہے۔ جس کے وجود سے مجھے انکار ہے۔ تم وجدانی طور پر خدا کے وجود سے منکر ہو۔ تم کہتی ہو کہ عقل خدا کا ادراک نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے عقل خدا کا ادراک کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن مَیں خُدا کو نہ ماننے پر مجبور ہوں۔ پیاری! ہم اور تم بذات خود نظام کائنات میں ایک خاص قسم کے تناسب کے وجود کی شہادت ہیں۔ کیونکہ تم تناسب اور تخلیق کا انتہائی کمال ہیں۔ اسی طرح جسمانی طور پر ہم ایک دوسرے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ کیا ہم بالکل ایک ہی طرح کی طبیعت لیکر پیدا نہیں ہوئے کیا ہم ایک ہی طرح کی آزمائش کئے آگے سر بسجود نہیں ہو جاتے۔

مَیں نے اس وقت اقرار کیا ہے کہ اگر وہ چوہا جس کا مَیں ذکر کر چکا ہوں۔ پھر باہر نکلا تو معلوم ہو گا کہ تقدیر کوئی شے ہے۔ اگر وہ پنہاں رہا تو مَیں مان لونگا کہ تقدیر کا وجود اٹل اور ناگزیر ہے۔

مَیں ڈرتے ڈرتے اس کونے کی طرف دیکھتا ہوں، جہاں چوہا موجود تھا۔ اب وہ جگہ خالی ہے۔

کل تکان کی وجہ سے مَیں نے خط کو ادھورا چھوڑ دیا۔ آج صبح اخبارات کے ذریعے معلوم ہُوا کہ اُردو کے مشہور مُصنّف محمد علی طبیب گاڑیوں کی تعداد گن کر اپنا وقت گزارا کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کے دماغ میں کچھ فتور تھا۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ بیکاری کے مشاغل محض اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں تاکہ دردناک احساسات سے عارضی رہائی میسر ہو۔ مَیں محمد علی طبیب کا نسخہ اکثر استعمال کرتا ہوں۔ اور اُسے مجرب پاتا ہوں۔ اسی طرح کا ایک نسخہ اقبال بہادر کی جائداد کو جوئے میں اڑا دینے کا میرے ہاتھ آگیا۔ تم سمجھیں۔ یعنی مَیں تمہیں اور تمہاری یاد کو دل سے فراموش کر دینا چاہتا ہوں۔ اس لئے مَیں اقبال بہادر کی جائداد کو برباد کرتا رہا۔ میرا ذہن اُس طرف منعطف ہو گیا۔

معمولی کام کاج میری توجہ کو تمہاری طرف سے نہ ہٹا سکتے۔

اس وقت کہ میری بربادی کا دن قریب ہے۔ اور وکیل میرے حساب کتاب کو دیکھنے کے لئے دن مقرر کر چکا ہے۔ یہ بات تمہاری طاقت میں ہے کہ

تم مجھے زندہ رہنے کی ترغیب دلاسکو۔ مجھے یقین ہے۔ کہ تم مجھے ایسی ترغیب نہیں دلاؤ گی۔

غیر محسوس طور پر تم اس بات سے واقف ہو کہ میں اپنی زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اب میرا پیمانۂ صبط لبریز ہو چکا ہے۔ اور اگر اسکے بعد میں زندہ رہوں تو میری خواہش ہو گی کہ تم میرے پاس رہو اگر ایسا ہو گیا، تو مَیں اپنے اندر اتنی ذہانت رکھتا ہوں کہ تمام عمر اقبال بہادر اور اس کے وکیلوں کو فریب میں مبتلا رکھ سکوں۔

کاش کہ مَیں عام لوگوں کی طرح تم سے اظہارِ تعشق کر سکتا۔ اور شادکام عشق ہو سکتا۔ لیکن مَیں اسے بداخلاقی خیال کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مَیں تم سے احساسات کے ایک عظیم سیلاب سے مجبور ہو کر اظہارِ محبت کروں، تو قابل عفو ہوں۔ لیکن اس حالت میں کہ مجھے تم سے اظہارِ تعشق میں ایک خاص قسم کی مسرت محسوس ہو گی۔ جو جذبات سے معرّا ہے۔ ایسا کرنا بداخلاقی کے انتہائی قعر میں جا گرنا ہے۔

شاید تمہیں یاد ہو کہ جب ہم اخلاقیاتِ خودکشی پر بحث کر رہے تھے۔ تو تم نے کہا تھا کہ جن لوگوں پر تخیّل اور شعریت کا اثر غالب ہوتا ہے۔ انکے لئے موت کبھی باعثِ اطمینان نہیں بن سکتی۔ ہاں جو لوگ غیر شاعرانہ دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اور دُنیوی کام کاج میں غرق رہتے ہیں۔ ان کے لئے موت وقوف اور شعور کے عدم وجود سے مراد ہوتی ہے۔ اور اسی لئے لازمی طور پر باعثِ اطمینان بن جاتی ہے۔

اس کی دلیل تم نے یہ دی تھی کہ غیر شاعرانہ دل و دماغ کا شخص حرکت کا بہترین مظہر ہوتا ہے۔ اور موت انقطاعِ حرکت کا دوسرا نام ہے۔ حرکت کے فنا ہونے کے ساتھ ہی اس کے لئے کائنات فنا ہو جاتی ہے لیکن جن اشخاص کا متخیّلہ زبردست ہوتا ہے۔ ان کے لئے موت انقطاعِ احساس و خیال کا نام نہیں۔ صرف انقطاعِ حرکت کا نام ہے۔

اگر وہ مر جائیں تو ان کا تسلسل خیال کبھی فنا نہ ہو گا۔

مَیں موت میں اطمینانِ قلب تلاش کروں گا۔ کیونکہ میرا دماغ بالکل غیر شاعرانہ ہے۔

مجھے توقع ہے کہ موت وقوف کی قاتل ہے۔ ورنہ میں کبھی موت کی طرف رجوع نہ کرتا۔ کیونکہ اگر موت ہماری تکالیف کو مسرت میں تبدیل نہیں کر سکتی، تو کم از کم تکالیف کے احساس کو تو فنا کر سکتی ہے۔

(باقی دارد)

ماخوذ از جوزف کانراڈ

عابد

(گزشتہ سے پیوستہ)

۲۵ - مئی

پچھلے دنوں ایک انوکھی تدبیر میرے ذہن میں آئی جسے میں تم پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ تاوقتیکہ اسکا عملی نتیجہ نہ معلوم ہو جاتے۔ مگر اب جبکہ اُس کا نتیجہ اچھا یا بُرا جیسا بھی ہے۔ برآمد ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم سے اُس کا ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ مدت سے یہ شوق میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ اور یہی باعث تھا کہ میں شہزادے کیساتھ یہاں آیا۔ وہ فوج میں اچھے عہدے پر سرفراز ہے۔ اور مجھے اس سے مدد کی بہت امید تھی۔ ایک دن میں نے سیر کرتے ہوتے باتوں باتوں میں اپنا ارادہ اُس پر ظاہر کیا۔ اُسنے اسکی مخالفت کی۔ اور جو دلائل اُس نے پیش کئے وہ ایسے صحیح اور معقول تھے کہ اُن کو نہ سُننا عقلمندی کے خلاف ہوتا۔

---

۱۱ - جون

تم اچھا کہو تو، اور بُرا کہو تو، میں اب یہاں کسی صورت نہیں رہ سکتا۔ اور میں رہوں تو کیوں رہوں؟ میرا جی اس جگہ سے بیزار ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شہزادہ مجھ پر اتنا ہی مہربان ہے جتنا کوئی خلیق میزبان ہو سکتا ہے۔ تاہم جسے راحت و آرام کہتے ہیں وہ مجھے نصیب نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی طبیعتیں بہت کم میل کھاتی ہیں۔ وہ ایک ذی فہم اور معقول آدمی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو ایک اوسط درجے کی ذہنیت کا آدمی۔ اُس کی باتوں میں مجھے اس سے زیادہ لطف نہیں آتا۔ جتنا میں ایک اچھی کتاب پڑھ کر اُٹھا سکتا ہوں۔

زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے تک میں یہاں ہوں۔ اُسکے بعد وہی میں ہونگا اور وہی میری پُرانی ہرزہ گردی۔ کیونکہ پانی بہتا اچھا اور سیاح چلتا اچھا۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ اُسوقت سے لیکر اب تک میں نے اگر کوئی کام کیا ہے تو یہی چند ایک تصویریں بنائی ہیں۔ شہزادے کو فنون لطیفہ سے بہت مس ہے۔ اور اُس کا مذاق اور بھی صحیح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ بمعنی

قواعد و ضوابط اور غیر ضروری اصطلاحوں کی بھرمار سے اپنے
کو خالی الذہن کر سکے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ میں انتہائی
زورِ تکلّم سے کام لے کر صنعت و فطرت کے حسن کو بے نقاب
کر رہا ہوں۔ اور وہ یکایک اپنے کسی عالمانہ قول سے
قطع کلام کر دیتا ہے۔ ایسے میں میرے صبر کی عنان ہاتھ سے
کیونکر نہ چھوٹ جاتے؟

۱۶۔ جولائی

اب پھر میں ایک خانماں بدوش مسافر ہوں، دُنیا
کا ایک زائر ہوں۔ اور تم بھی اسکے سوا کیا ہو؟

۱۸۔ جولائی

نہیں کیا معلوم کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ یہ
ایک بھید ہے! مگر تم سے میں نے پہلے کوئی بھید چھپا رکھا
ہے جو یہ چھپاؤں؟ میں کسی ضرورت کے باعث یہاں
اور دس پندرہ دن تک رہنے پر مجبور ہوں۔ اس کے
بعد میرا خیال ہے۔ کہ میں ...... میں لوہے کی کانیں
دیکھنے جاؤنگا۔ نہیں بھائی میں تم کو اور اپنے آپ کو،
دھوکا دے رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں پھر شارلوت کے
قریب رہنا چاہتا ہوں۔ سمجھے؟ میں پھر شارلوت کے
قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے دل کی حیلہ جوئیوں

پر مسکراتا ہوں، اور خاموشی سے اُس کا کہنا بجالاتا ہوں۔

۲۹۔ جولائی

مجھے لاکھ لاکھ شکر کرنا چاہئے۔ میں جس حال میں ہوں
اچھا ہوں۔ میرا کیا مُنہ ہے۔ کہ اُس کو چاہوں، اُس کے
حصول کی آرزو کروں! مگر اے میرے اللہ، اگر تو نے
یہ خوشی میری قسمت میں لکھدی ہوتی تو میری ساری عمر
ایک مسلسل شکر گزاری ہوتی۔ بہرحال میں اب بھی تجھ
سے گلہ نہیں کرتا ــــ میرے ان آنسوؤں کو معاف کر،
میری ان خام خیالیوں سے درگزر۔ وہ، اور میری ہو
جائے! اُف یہ خیال، خُدا کی اُس جمیل ترین مخلوق
کو اپنے آغوش میں لینے کا خیال کس قدر مسرّت خیز ہے!
میرے عزیز دوست، میں جب البرٹ کو اُس کی نازک کمر
میں ہاتھ ڈالتے دیکھتا ہوں تو میرے تمام جسم پر رعشہ
طاری ہو جاتا ہے۔

اور میں صاف صاف کیوں نہ کہدوں؟ مجھے یقین
ہے کہ وہ میری رفیقِ زندگی ہوتی تو جتنی اب خوش ہے۔
اس سے بدرجہا خوش رہتی۔ البرٹ ایسا شخص نہیں، کہ
ایک ایسے سینے کا خلا پُر کر سکے۔ اُس میں وہ لطیف حسّ
نہیں، اُس کے سینے میں وہ دل نہیں۔ آہ، پیارے ولیم
کتنی مرتبہ کسی دلچسپ کتاب میں سے کوئی عبارت،

پڑھتے وقت، جبکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کے دل مل گئے ہیں۔ اور ایسے ایسے کئی اور موقعوں پر جب عشق و محبت کا کوئی افسانہ ہمارے جذبات کو گدگدا دیتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ خدا نے ہم کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا۔ لیکن البرٹ اُسے جی جان سے چاہتا ہے۔ اور ایسی چاہت کا بدلہ چاہت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

لو، یکایک ایک ناخواندہ مہمان نے نازل ہو کر میرے خیالات درہم برہم کر دئے ہیں۔ میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں۔ اور اپنے جذبات کی شورش کو دل میں دبا کر بیٹھ گیا ہوں۔ لو اب خدا حافظ۔

۴۔ اگست

اس دنیا میں کچھ میں ہی بدقسمت نہیں۔ ہر بشر کو اپنی ناکامیوں کا رونا رہتا ہے ایسا کوئی نہ ہوگا۔ جسکے دل کی سب مرادیں بر آئی ہوں، جس کی امیدوں کا کبھی خون نہ ہوا ہو۔ وہ غریب بڑھیا جو لیموں کے درختوں کے نیچے جھونپڑی میں رہتی ہے۔ اور جس کا میں نے تم سے کئی بار ذکر کیا ہے، کل میں اس سے ملنے گیا۔ اُس کے بڑے لڑکے نے دور سے مجھے آتے دیکھا۔ تو دوڑتا ہوا میرے استقبال کو آیا۔ اُس کی خوشی کے نعرے سنکر بڑھیا بھی باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ مغموم تھا۔ سب سے پہلا کلمہ جو اُس کے مُنہ سے نکلا یہ تھا۔ "آپ کو معلوم ہوگا میرا جان اللہ کے گھر پہنچ گیا" یہ اُس کا سب سے چھوٹا بچہ تھا" اور وہ سوئٹزرلینڈ سے آگئے ہیں۔ مگر کس حال میں؟ کہ نہ پیٹ میں روٹی، نہ تن پر کپڑا۔ وہ تو خدا بھلا کرے، چند لوگوں نے مل ملا کر سفر کے لئے کچھ جمع کر دیا۔ نہیں تو مانگتے کھاتے آنا پڑتا۔ بیچارے سارا رستہ بخار سے ہلکان رہے ہیں۔"

۲۱۔ اگست

میرے احساسات لحظہ بلحظہ بدلتے رہتے ہیں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عیش خیالی کا ایک دھندلا سا منظر مایوسی کے تاریک پردوں میں سے مجھے دور کی ایک جھلک دکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ جھلک صرف ایک لمحے کے لئے ہوتی ہے۔ اور پھر میں آرزوؤں کے خوابوں میں غرق، پڑا سوچتا ہوں "کاش البرٹ مرجاتے۔ پھر وہ ضرور میری ہو جاتیگی۔ اور میں اُس کا — کاش البرٹ مرجاتے۔" اور اس طرح میرا گمراہ کن تصور مجھے امیدوں اور آرزوؤں کی سرسبز و شاداب وادیوں میں پھراتا ہوا خیالی کامیابی کی انتہائی بلندیوں پر لیجاتا ہے۔ تاآنکہ میں اپنے کو ایک ایسی خوفناک کھوہ

کے کنارے پاتا ہوں، جس کی گہرائی دیکھ کر میری رُوح لرز جاتی ہے۔

جب کبھی مجھے اُس سڑک پر چلنے کا اتفاق ہوتا ہے جس نے اوّل اوّل مجھے شارلوٹ کے حضور میں پہنچایا تھا۔ تو اُس کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ سڑک جو پہلے تھی اب بھی وہی ہے لیکن میری نظر وہ نہیں رہی۔ وہ نشاط انگیز اُمیدیں کہ زمین پر پاؤں نہ رکھنے دیتی تھیں۔ وہ شوق کی بیتابیاں کہ ہوا میں اُڑائے لئے جاتی تھیں۔ وہ قدم قدم پر نئی نئی کیفیتیں۔ آہ، اب وہ باتیں ہی نہیں رہیں۔ دل کی حالت میں کچھ ایسا انقلاب آیا۔ کہ کوئی جذبہ کوئی احساس وہ نہیں، جو پہلے تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی بادشاہ کی بھولی بھٹکی رُوح ہوں کہ عالم ارواح سے اپنی گزشتہ عظمت کی یادگاریں دیکھنے آتی ہوں۔ لیکن کیا دیکھتی ہوں کہ وہ فلک وقار عمارتیں جن کی شان و شوکت کی بنیاد میں نے اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی۔ اب خاک کا ڈھیر ہیں۔ اور اُن کے شکستہ در و دیوار انقلاب روزگار کی صدیوں پرانی داستان دُہرا رہے ہیں۔

۳۔ ستمبر

بعض اوقات میں یہ سوچ سوچ کر بہت متعجب ہوتا ہوں، کہ . . . وہ کس طرح میرے سوا کسی سے محبّت کر سکتی ہے؟ جب میں اُسے دل و جان سے عزیز رکھتا ہوں، اور اُس کے سوا دُنیا میں کسی کو اپنا نہیں جانتا، تو کیا وجہ ہے کہ وہ مجھے غیر سمجھے؟

۴۔ ستمبر

قدرت کا قانون ہی ایسا ہے جب دُنیا کے باغ میں افسردگی و پژمردگی کا موسم آتا ہے، تو دلوں کی کلیاں بھی مُرجھا جاتی ہیں۔ میرے اور میرے سب پاس پڑوس والوں کے لئے خزاں یکساں اپنا غم انگیز پیغام لاتی ہے تمہیں یاد ہوگا کہ جب میں یہاں آیا ہوں، اُس کے چند دن بعد میں نے اپنے ایک خط میں ایک دیہاتی لڑکے کا ذکر کیا تھا۔ اُس کے بعد پھر کبھی اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بیچارا نوکری سے برخاست ہو گیا ہے۔ اور لوگ اُسکی صحبت سے گریز کرنے لگے ہیں۔ جس کی وجہ کسی نے مجھے نہیں بتائی۔ کل وہ ہمسایہ کے کسی گاؤں کو جا رہا تھا۔ کہ راہ میں مجھ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں اُسے روک کر باتیں کرنے لگا۔ اور میرے اصرار پر اُس نے اپنی سرگزشت کہہ سُنائی۔ میں بڑی توجہ سے اُس کا بیان سُنتا رہا۔ اور جس طریقے سے میں اُسے تمہارے سامنے دُہراؤں گا۔ اُس سے تم اندازہ کر سکو گے کہ میرے لئے اُس میں کس قدر دلچسپی

کا سامان پنہاں تھا۔ مگر میں کیوں تمہاری خوشی میں بیٹھے بٹھائے
مخل ہوں۔ میں کیوں اپنا پرایا رونا رو کر تمہیں رلاؤں! آہ'
کیا کروں یہ بھی میری قسمت میں لکھا ہے۔ اور مجھے بہر حال
ایسا کرنا ہوگا۔

شروع شروع میں وہ اپنی کہانی ایسے انداز میں
بیان کرتا رہا جس سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے جذبات کو ضبط
کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور مجھے اپنا حال سناتے
ہوئے جھجکتا ہے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اجنبیت کا پردہ درمیان
سے اٹھ گیا اور اس نے مجھ میں ہمدردی کے آثار دیکھے، تو
اس کی جھجک دور ہوگئی۔ چنانچہ اس نے کھلے دل سے
اپنے کئے کا اعتراف کیا۔ اور اپنی بدقسمتی پر بہت رویا۔ میرا
جی چاہتا ہے کہ کاش اس کے الفاظ بلاکم وکاست تمہارے
سامنے پیش کرسکوں۔ میں کیا بتاؤں کس طرح مزے
لے لے کر اور کس ذوق وشوق سے اس نے اپنا حال
سنایا۔ مختصر طور پر واقعہ یوں ہے کہ اسے اپنی مالکہ سے
روز بروز زیادہ محبت ہوتی گئی۔ اور آخرکار یہاں تک نوبت
پہنچی۔ کہ اسے اپنے قول وفعل کا شعور نہ رہا۔ اور نہ اپنے
انجام کی خبر رہی۔ اس کی ہر اشتہا اس طرح ایک ہمہ گیر
جذبے سے مغلوب ہوگئی تھی۔ کہ اسے خورد خواب کی
حاجت تک نہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے تمام حواس
پر ایک جمود کا عالم طاری ہوگیا تھا۔ وہ کسی حکم کی تعمیل
نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس میں کسی حکم کے سمجھنے کی صلاحیت
ہی باقی نہ تھی۔ یہ حالت ہوگئی تھی، کہ گویا کوئی خبیث روح
اس کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ اسی عالم میں ایک دن
ایسا ہوا کہ اس کی مالکہ اوپر کی منزل کے کسی کمرے میں
گئی، اور وہ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ بلکہ یوں کہنا
چاہیے۔ کہ کوئی مخفی قوت اسے کشاں کشاں وہاں لے گئی
چونکہ اس کی مالکہ نے اس کی التجاؤں اور منتوں کا کچھ
خیال نہ کیا۔ اس لئے اسے بالآخر زور زبردستی کے اوچھے
ہتیاروں پر اترنا پڑا۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے بعد
کیا ہوا۔ لیکن وہ خدا کو شاہد و احد قرار دیکر کہتا تھا۔ کہ
"میری نیت میں فساد نہ تھا۔ میں صرف اتنا چاہتا
تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرلے۔ اور دونوں ملکر آرام و
عزت کی زندگی بسر کریں۔" جب وہ یہاں تک پہنچا تو
اس کی زبان میں لکنت شروع ہوگئی۔ گویا وہ کوئی ایسی
بات چھپا رکھنا چاہتا تھا جس کے اظہار کی اس میں
جرات نہ تھی۔ آخرکار اس نے بہزار پس وپیش اعتراف
کیا۔ کہ اسے اپنی مالکہ کی بعض بعض باتوں میں ہمت افزائی
کا ایما نظر آتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے دو تین بار قطع کلام
کرکے مجھے یقین دلایا۔ کہ "میں اس کی نیکنامی پر دھبہ
نہیں لگانا چاہتا۔ کیونکہ میری محبت اب بھی ویسی
ہی ہے۔" اخیر میں اس نے بالتاکید مجھے بتایا کہ "میں

نے آجتک یہ بھید کسی پر نہیں کھولا۔ آپ ہی پہلے شخص ہیں جن کو بتا رہا ہوں۔ اور وہ صرف اس لئے کہ کہیں آپ مجھے بالکل ہی گیا گزرا نہ سمجھ لیں۔"

مجھے یقین ہے کہ اگر میں اُسے ہوبہو اُسی طرح تمہارے سامنے پیش کرسکوں جس طرح وہ اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا اور اب بھی مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آرہا ہے یا کم از کم اُس کے الفاظ ہی کمی و بیشی کے بغیر تمہیں سُنا سکوں۔ تو تم بھی میری طرح اُس سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تم میرے حالات اور میری طبیعت سے واقف ہو۔ اور بآسانی اندازہ کرسکتے ہو کہ مجھے کیوں ہر بدقسمت ہستی سے اور خصوصاً اس شخص سے اتنی ہمدردی ہے۔

خط کو دوبارہ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ میں تمہیں اس داستان کا انجام سُنانا تو بھول ہی گیا۔ وہ کچھ ایسا غیر معمولی اور دُور از کار نہیں۔ آئے دن ایسی داستانیں سُننے میں آتی ہیں۔ اور جو انجام اُن کا ہوتا ہے وُہی اس کا ہے۔ مختصر یہ کہ مالکہ کے بھائی کو معاملے کی خبر ہوگئی۔ وُہ ہمیشہ سے اس کا بہت مخالف تھا۔ اور اس پر مالکہ کی ضرورت سے زیادہ مہربانیاں دیکھ کر اس کا گھر میں رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے خوف تھا کہ کہیں بہن نکاح ثانی نہ کرلے۔ اس میں اُس کا نقصان یہ تھا کہ اُس کی اولاد جو اپنی پھوپھی کے لاولد ہونے کے باعث اُس کی وارث تھی۔ ایک معقول جائداد سے محروم رہ جاتی چنانچہ اُس نے بہن کو سکھایا پڑھایا اور بیچارے کو نوکری سے علیحدہ کرادیا۔ یہ تمام واقعہ گردونواح میں اتنا مشہور ہوگیا کہ اگر مالکہ اُسے دوبارہ ملازمت میں لینے کی خواہشمند بھی ہوتی تو معذور تھی۔ مجبوراً اُس نے کوئی دوسرا ملازم رکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُس سے بھی بھائی کو بڑی دُشمنی ہے لیکن ساتھ ہی یہ خبر گرم ہے کہ اُس کی شادی اپنی مالکہ سے ہونے والی ہے۔ اگر خدانکردہ یہ نامبارک حادثہ ظہور میں آگیا، تو میرے دوست کا ارادہ اس کے بعد زندہ رہنے کا نہیں۔

مندرجہ بالا واقعے میں مبالغہ آمیزی یا حاشیہ آرائی کو مطلق دخل نہیں۔ اس کے برخلاف مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے شائستہ الفاظ کے استعمال کی ضرورت سے مجبور ہوکر اس کا اصلی زور نہ کم کر دیا ہو۔

محبّت اور وفاداری کو لوگ افسانہ کہتے ہیں۔ لیکن اس شخص نے جو اس معتوب و مقہور طبقے کا ایک فرد ہے۔ جسے ہم جاہلوں اور رذیلوں کا طبقہ کہتے ہیں، میرے نزدیک ان کی حقیقت مسلم کردی ہے۔ ہاں یہ بے لوث جذبات جو فطرت کا بہترین عطیہ ہیں اُنہی لوگوں میں

پائے جاتے ہیں جن پر تہذیب اور تمدّن کا ملمع نہیں چڑھا۔ ہم جو اپنے کو شائستہ اور تعلیم یافتہ کہتے ہیں ان سے کوسوں دُور ہیں۔ میری التجا ہے کہ ذرا توجہ اور دلدہی سے اس واقعے کو پڑھنا، اور غور کرنا کہ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ کہاں تک صحیح ہے۔ میں آج خلاف معمول سکون اور اطمینان کی حالت میں ہوں۔ کیونکہ اس کہانی نے میرے لئے طبیعت کو مشغول رکھنے کا سامان مہیّا کر دیا ہے۔ میرے اندازِ تحریر ہی سے تم پر یہ ظاہر ہو گیا ہوگا۔ میں پھر تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کہانی کو بار بار پڑھنا۔ کیونکہ یہ تمہارے عزیز دوست کی سرگزشت ہے۔ اوّل روز سے مجھ پر یہی گزرتی آئی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ مجھ پر یہی گزرتی رہیگی اگرچہ میں اس بدنصیب شخص سے اپنے آپ کو تشبیہ دیتے ہُوئے ہچکچاتا ہوں۔ کیونکہ مجھ میں نہ اسکی سی رندانہ جراءت ہے نہ اُس کا سا عزم بالجزم۔

---

۵ ستمبر

شارلوت نے اپنے خاوند کے نام جو کاروبار کی کثرت کی وجہ سے مدّت سے کسی گاؤں میں رُکا ہُوا تھا۔ ایک خط لکھا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح ہوتا تھا کہ "میرے پیارے جسقدر جلد ہو سکے اپنے گھر آؤ۔ میں ہزار تمنّاؤں اور مُرادوں کے ساتھ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔" البرٹ کا ایک دوست جو اسی گاؤں سے آیا تھا یہ پیغام لایا کہ بعض وجوہ کی بنا پر وہ فی الحال واپس آنے سے معذور ہے۔ شارلوت کا خط البرٹ تک نہ پہنچا تھا چنانچہ اسی دن کی شام کو میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے پڑھا، اور مُسکرانے لگا۔ شارلوت نے مجھ سے مسکرانے کی وجہ پوچھی میں نے جواب دیا۔ "تصوّر بھی خُدا نے کیا بے بدل نعمت بنائی ہے! میں نے ایک لمحے کیلئے یہ تصوّر کر لیا تھا کہ یہ خط میرے نام ہے۔" وُہ خاموش رہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری اس ناسزا جراءت پر مجھسے ناخوش ہوگئی ہے۔ خوف اور ندامت کے مارے میرے مُنہ سے معذرت کا ایک کلمہ بھی نہ نکل سکا۔

---

۶ ستمبر

جس دن میں نے پہلی مرتبہ شارلوت کے ساتھ رقص کیا ہے میں نے ایک نیلا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اب تک وہ میرا حرزِ جان رہا ہے اور اُس کو اپنے سے جُدا کرنا میرے لئے بلا کا سانحہ تھا۔ مگر مجبوری امر و زمانہ کا اثر آخر اُسے مجھ سے جُدا کر کے ہی رہا۔ اب اسکے سوا اور کیا چارہ تھا کہ میں اسی وضع قطع کا ایک نیا کوٹ سلواتا۔ چنانچہ میں نے ایک کوٹ سینے کے لئے دے رکھا ہے جو پُرانے کوٹ سے اس قدر مشابہ ہوگا کہ اسکو چھپا دو اسکو نکالو۔ اسکے علاوہ ایک نئی واسکٹ اور پتلون بھی سلوانے کا ارادہ ہے۔

یہ نیا کوٹ ہزار اُس جیسا ہو پھر بھی اس میں وہ بات کہاں؟ خیر مجھے امید ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے پر میں اسی کو غنیمت جاننے لگونگا گو میں فی الحال اسکی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکتا۔ گو شتے

ابتدائے آرزو - از جناب شمیم بلہوری

ہمارے کرمفرمائے خصوصی جناب شمیم بلہوری کچھ عرصے سے آرسین لوپن کے حیرت خیز کارناموں کی ترجمانی میں متواتر کوشش صرف کر رہے ہیں۔ یہانتک کہ آپ کے نام کو اس مشہور عالم شخصیت کے ساتھ ایک تعلق خاص ہوگیا ہے جسنے عیاری میں بحیثیت ایک فن لطیف کے مشق بہم پہنچائی تھی۔ اور تمام دُنیا کو اس کا تختۂ مشق بنانا اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتا تھا

ہزار داستان میں اس کے کئی کارنامے آپ نے پیش کئے ہیں۔ جو ہمارے قارئین نے دلچسپی سے پڑھے ہونگے کیونکہ ان میں ایک ایسے شخص کی سیرت بے نقاب کی گئی ہے۔ جس نے اگرچہ دُنیا کی نگاہ میں اپنے کو سیاہ کار اور جرائم پیشہ ظاہر کرنا پسند کیا تھا۔ تاہم فی الاصل ایک شریف الطبع اور نیکدل شخص تھا۔ وہ عام پسند اخلاقی گناہ جسے ریاکاری کہتے ہیں۔ اور جو کروڑوں سینوں کی تاریکیوں کا پردہ پوش ہوتا ہے۔ اُس کی فطرت میں اس کا شائبہ تک نہ مانا جاتا تھا بلکہ وہ ہمہ تن اس کی ضد تھا۔ اور وہ سب سے بڑا فریب جس میں اُس نے دُنیا کو مبتلا کر رکھا تھا' خود اس کی ذات تھی۔ جس کی حقیقت وہ کسی پر منکشف نہ ہونے دیتا تھا۔

اس بہیم فریب کے لئے جو صفات لازمی تھیں' وہ سب اس میں موجود تھیں۔ مثلاً بیدار مغزی' چالاکی' پُرفنی' دُور رسی' ارادے کی پختگی وغیرہ۔ اُس کا دماغ ان صفات کا ایک نادر مجموعہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر خارقِ عادت واقعات جو ان افسانوں کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں' اُس سے منسوب ہوکر بالکل معمولی معلوم ہونے لگتے ہیں۔

"ابتدائے آرزو" بھی اسی قسم کا ایک افسانہ ہے اور اس کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ اس میں آرسین لوپن کا اوّل اوّل تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی گوارا ہے لیکن کتابت کا ایک عجب نہایت مضحکہ خیز ہے۔ تمام اوقاف کو متعدد نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

"...... کچھ عقل کام نہ کرتی تھی...... مجھے اپنی آنکھوں کا یقین نہ آتا تھا...... آخر وہ آوازیں...... جو یقیناً میز و کرسی کے سرکانے سے پیدا ہوتی تھیں...... کیا معنی رکھتی تھیں...... میں نے تمام کمرہ کا چکر لگایا...... دیواروں کو دیکھا......"

گوتم بدھ۔ مصنفہ منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔

یہ مختصر سا رسالہ ایک تاریخی مضمون ہے جو الناظر لکھنؤ

میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ اور اس کے مُصنّف منشی امیر احمد صاحب علوی سے کُہنہ مشق انشا پرداز ہیں جنکا نام خاصان ادب میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے منشی صاحب کی ادبی سرگرمیوں کا دائرۂ عمل متفرق اصنافِ علم وادب پر حاوی رہا ہے۔ لیکن کچھ عرصے سے تاریخی مضامین آپ کی خصوصیّت ہوگئے ہیں۔ یہ مضامین بحث کی نوعیت سے قطع نظر کرکے اسلوب بیان کی بعض ایسی خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جو انہیں خالص ادبی اعتبار سے بھی قابلِ قدر بنا دیتی ہیں سلیس، رواں، اور خوش ترکیب فقرے جن کے الفاظ میں سادگی و بیساختگی کے ساتھ رنگینی اور محاورے کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر کی رعایت اور اُن کا مسلسل و منضبط بیان، اور ضمنی مباحث کا برمحل تذکرہ و تبصرہ ——— یہ آپ کے اسلوب بیان کی دائمی خصوصیات ہیں۔ اور زیر بحث مضمون میں یہ خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

موضوع نیا نہیں، کیونکہ مہاتما بدھ کی تاریخی حیثیت اور مذہبی شخصیت کے متعلق اور زبانوں کا تو ذکر ہی کیا، خود ہماری زبان میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم طریق بیان نیا ہے۔ اُردو میں اس سے پیشتر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی۔ جس میں گوتم بُدھ کی مادی زندگی کے سوانح کے ساتھ ساتھ اُن کی روحانی زندگی کے مدارج بھی اِس طرح بیان کئے گئے ہوں کہ تاریخی اور فلسفیانہ نقطہ ہائے نگاہ باہم دست و گریبان ہو جائیں۔ الناظر بک ایجنسی، قیمت ۶ر

آئینہ جذبات مُصنّفہ میاں سلطان احمد صاحب وجودی۔ ایڈیٹر رسالہ اُستانی۔ یہ کتاب ادب کی اُس نو ایجاد صنف کا ایک نمونہ ہے جسے "نثرِ شاعری" کی ترکیب غریب سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ اُن عیوب سے پاک ہے جن کو اس صنف سے خاص طور پر مناسبت ہوگئی ہے۔ یعنی نامانوس اور بیگانۂ معنی ترکیبیں، بے سروپا، مغلق، اور بلحاظِ قواعد غلط فقرے اور غیر ضروری نقطے اور علامتیں۔

وجودی صاحب کے اندازِ تحریر کی نسبت یہی کہنا کافی ہوگا کہ وہ اپنے اُستاد خواجہ حسن نظامی کے انداز کا تتبع کرتے ہیں۔ اور اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ٹکڑے میں سے جس کا عنوان "لوہے کا گھوڑا" ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"لوہے کی رگ۔ لوہے کا ریشہ۔ لوہے کا جنا، اور لوہے کا بنا ہے۔ لوہے کی سیخ، لوہے کی سلاخ۔ لوہے کو موڑا اور لوہے کو جوڑا، تو بن گیا لوہے کا گھوڑا۔

چلنے میں تیز و طرار مگر مُردار۔ خود نہیں چلتا۔ خود نہیں اُٹھتا خود نہیں دوڑتا۔ کوئی دوڑاتے تو دوڑے۔ مڑے اگر کوئی موڑے ...." قیمت ۵ر حجم ۳۲ صفحے

ملنے کا پتہ :۔ نظامیہ بک ڈپو بٹالہ (پنجاب) ہادی

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی سہ فی پرچہ ۸ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹرز:

سید عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل — حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

محمد اسمٰعیل — محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)

جلد ۷ — اشاعت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۵ء — نمبر ۴

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	شعر	کارلائل	۲
۲	وجدانیات	جناب عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل	۳
۳	غم نصیب	محمد ہادی حسین بی اے آنرز	۴
۴	افکار رنگین	جناب اثر صہبائی بی اے ایل ایل بی وکیل	۱۲
۵	جذبات	جناب ہادی مچھلی شہری بی اے ایل ایل بی وکیل	۱۳
۶	تاروں بھری رات	جناب اثر صہبائی	۱۴
۷	بلبل اسیر اور عاشق مہجور	جناب ابوالفضل راز چاندپوری	۱۶
۸	منشی نظیر حسین خاں نسیم	جناب عابد علی عابد	۱۷
۹	افکار شامی	جناب محمد معراج الدین شامی	۲۴
۱۰	سرسید احمد ایک ادیب کی حیثیت میں	جناب "ہ"	۲۵
۱۱	ماتم عیش	حضرت آزاد انصاری	۳۹
۱۲	جذبات اکبر	جناب جلال الدین اکبر	۴۰
۱۳	غزل . . .	حضرت آزاد انصاری	۴۱
۱۴	میری داستان حیات	جناب خادم محی الدین بی اے بی ٹی	۴۲
۱۵	علم ہیئت تاریخی زمانہ سے قبل	جناب غلام ربانی	۵۷
۱۶	میری داستان حیات کا مقدمہ	جناب ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی	۶۳
۱۷	افکار خلیل	جناب خلیل	۶۸
۱۸	حیات عابد	جناب عابد علی عابد	۶۹
۱۹	تنقید و تبصرہ	محمد ہادی حسین	۷۰
۲۰	نوائے راز	جناب راز چاندپوری	۷۶

([illegible] پریس میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے محمد اسمٰعیل لکھپتی پبلشر و پروپرائیٹر نے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

شعر

شعر کلام کی ایک قسم ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کلام کے وسیع معنوں میں اور شعر میں جو کلام کی ایک خاص قسم ہے، کوئی مابہ الامتیاز بھی ہے؟ اور اگر ہے تو کیا ہے۔ مختلف ارباب رائے نے اس سوال کے مختلف جواب دئے ہیں جن میں سے اکثر بعید از فہم ہیں۔ مثلاً جرمنی کے بعض نقادوں نے کہا ہے کہ شعر دوسری اقسام کلام سے یوں ممتاز ہے کہ جہاں دوسری اقسام کلام اپنی نوعیت میں محدود ہیں۔ وہاں شعر غیر محدود ہے۔ شاعر جو مفہوم ادا کرتا ہے اسے مکان و زمان کی قیود سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ جواب بادی النظر میں کسی قدر دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ تاہم چونکہ اس سے زیادہ شافی جواب کوئی نہیں دیا گیا۔ اس لئے یہی غنیمت ہے اور اگر غور و خوض کیا جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

بہر حال میرے نزدیک شعر کی یہ عامیانہ تعریف کہ وہ کلامِ موزوں ہے بہت کچھ معنی رکھتی ہے۔ شعر اور دوسرے اصنافِ کلام میں وہی فرق ہے۔ جو موسیقی اور دوسری انواع صوت میں ہے۔ مجھے اگر کوئی شعر کی تعریف کرنے پر مجبور کرے تو میں یہی کہونگا کہ شعر وہ کلام ہے جس میں موسیقیت ہو۔ اگر کوئی بیان موسیقیت سے لبریز ہو تو وہ شاعری ہے۔ موسیقیت سے میری مراد محض وزن یا لفظی ترنم نہیں، بلکہ معنوی و باطنی ہم آہنگی۔ خیال اور اس کا اظہار دونو موسیقیت سے لبریز ہونے چاہئیں۔ موسیقیت سے لبریز خیال وہ خیال ہے جو ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہو، جس کی نگاہیں اشیا کی کنہِ حقیقت سے آشنا ہوں۔ جس نے اشیاء کے چہرے سے نقاب صورت ہٹا کر ان کے معنوی خط و خال کو دیکھا ہو جس کے کان نواہائے راز کے محرم ہوں —— دوسرے الفاظ میں ایک ایسا شخص جو اس باطنی ہم آہنگی سے واقف ہو، جو ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اور جس کی بنا پر ہر چیز اس دُنیا میں قائم ہے۔ ہر چیز کی حقیقت ہم آہنگی ہے۔ اس دُنیا میں جو "حجاب" ہے "ساز کا پردہ" ہے۔ اس لئے کسی چیز کی حقیقت کا اظہار موسیقی کی تخلیق ہے۔ موسیقی ایک ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ جو کسی منطقی تعریف کی حدود میں نہیں سما سکتا۔ کون ایسا شخص ہے۔ جو وہ اثر بیان کر سکے جو موسیقی سے اس کے دل پر مترتب ہوتا ہے؟

(کارلائل) "ہ"

وجدانیات

خود مسکرا اٹے خود ہی وہ شرما کے رہ گئے
کچھ پھول اہلِ شوق پہ برسا کے رہ گئے

برہم اگرچہ انجمنِ عشق ہو گئی
جلوے نظر میں انجمن آرا کے رہ گئے

آغوش سے وہ آہ تڑپ کر نکل گئے
ہم ہاتھ اپنے خواب میں پھیلا کے رہ گئے

دامن سے اپنے غش میں وہ دیتے رہے ہوا
کچھ اور دل کی آگ کو بھڑکا کے رہ گئے

لو آنسوؤں میں آپ کی تصویر کھنچ گئی
آنکھوں کے آئینے بھی جلا پا کے رہ گئے

غمہائے روزگار کو آنے دیا نہ پاس
ہم کوئے عاشقی میں گئے جا کے رہ گئے

عرضِ کرم کی تاب نہ تھی عجزِ شوق میں
ہم داستانِ ہجر کو دہرا کے رہ گئے

میرے لئے ہیں باعثِ رنگینیِ خیال
وہ پھول آرزو کے جو مرجھا کے رہ گئے

ہر چند سامنے سے وہ گزرے مثالِ برق
کچھ نقش دل پہ صورتِ زیبا کے رہ گئے

آغازِ آرزو کی ہنسی یاد آ گئی
آنسو ہماری آنکھ میں آ کے رہ گئے

عابد اگرچہ کوئی تمنا نہیں رہی
چرچے زباں پہ دورِ تمنا کے رہ گئے

عابد

غم نصیب

مصنفہ گوئٹے مترجمہ محمد ہادی حسین

(گزشتہ سے پیوستہ)

۱۲- ستمبر

ولیم، مجھے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔ جنہیں اُن گنتی کی چیزوں کی بھی شناخت نہیں، جو ہماری زندگی میں ایک حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہیں تمہیں وہ اخروٹ کے درخت یاد ہونگے جو س .... کے پادری کے گھر میں اُگے ہُوتے تھے۔ مَیں اور شارلوت جب کبھی وہاں گتے ہیں تو پہروں اُن کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے رہتے تھے۔ عجب خوبصورت درخت تھے۔ جن کو ایک نظر دیکھ لینے سے طبیعت شاداب ہو جاتی تھی۔ اُن کی ہری بھری اور گنجان شاخیں پادری کے گھر کا سنگار تھیں۔ اور اُن کو دیکھ کر ہمارے دل میں اُس آنجہانی پادری کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ جس نے اُنھیں نہ جانے کتنے برسوں پہلے اپنے ہاتھ سے لگایا ہوگا۔ گاؤں کے مدرس نے اکثر اُس کا تذکرہ مجھ سے کیا ہے۔ خوب آدمی تھا۔ اُس کی یاد ان درختوں کی چھاؤں میں میرے لئے ایک فرحت بخش مشغلہ تھی۔ کل مدرس نے آبدیدہ ہوکر مجھے یہ خبر سُنائی کہ وہ درخت کاٹ دِتے گئے ہیں۔

جس شقی القلب شخص نے اُن پر کلہاڑے کی پہلی ضرب لگائی ہے۔ اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتا، تو واللہ مَیں اُس کی جان لینے سے دریغ نہ کرتا، اور وہ ہے بھی اسی کا مستحق۔ کسی مرے ہُوئے شخص کی نشانی کو، خصوصاً جب وہ ایسی حسین اور فایدہ بخش چیز ہو، اس بیدردی سے مٹا دینا! یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ اگر ایسے دو درخت میرے مکان کے احاطے میں ہوتے اور اُن میں سے ایک سالخوردہ ہوکر مرجھا جاتا تو مَیں حقیقت میں قسمت کی شکایت کئے بغیر نہ رہ سکتا لیکن اب انسانوں کے دستِ ستم کی یہ قطع و برید اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور چُپ ہوں۔ تاہم چپ کی داد مجھے اتنی ضرور مل گئی ہے۔ کہ گاؤں والے میرے غم و افسوس میں شریک ہیں۔ ہر کوئی اس بیدردانہ فعل کا شاکی ہے اور مجھے امید ہے کہ جب پادری کی بیوی کو گاؤں کے لوگ نذر نذرانے دینا بند کر دینگے تو اُسے قدر عافیت معلوم

ہو جائیگی۔ یہ یقیناً اسی کی کارستانی ہے۔ ہمارے ملاقاتی بوڑھے پادری صاحب بیچارے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اُن کی جگہ کوئی نیا پادری آگیا ہے۔ یہ اسی نئے پادری کی بیوی نے اپنی نیکدلی کا اظہار کیا ہے۔ کہ لوگوں کو بیٹھے بٹھائے ایک آرام کی چیز سے محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک سڑیل مریل سی عورت ہے، اور اپنے ہمسایوں کی پروانہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ کیونکہ اُس کے ہمسایے بھی اُس کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتے۔ اُس کو علمیت و فضلیت کا بڑا دعوے ہے جب دیکھو دینیات کی ضخیم ۔۔ کتابیں لئے بیٹھی ہے۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ وہ اپنے تئیں اصلاحِ دین کی نہایت سرگرم ممد و معاون تصوّر کرتی ہے۔ اور اخلاقِ عامہ کے معلموں میں اپنا بڑا درجہ سمجھتی ہے۔ اگر اُس کے سامنے کسی مصلح و رہبر کی کارگزاری کا ذکر کیا جائے۔ تو نفرت اور حقارت سے یہ ذکر رد کر دیتی ہے گویا اسی کی ذات لے دے کر ایک مرجعِ ہدایت رہ گئی ہے!

اُس کی صحت پر ایسی خدائی مار ہے کہ اس دنیا کی ہر نعمت اس کے لئے ممنوع ہے۔ یہی ایک ہستی ایسی ہو سکتی ہے جس نے اخروٹ کے درخت کٹوائے ہوں۔ میں اُس کی اس غلطی سے کبھی درگزر نہیں کر سکتا۔ گناہ تو ایسا ناقابلِ معافی ہے، اور ذرا عذرِ گناہ بھی دیکھنا!

کہتی کیا ہے کہ پتّوں کے جھڑنے سے احاطے میں گندگی اور سڑاہند پھیل جاتی تھی۔ شاخیں روشنی کی راہ میں حائل ہوتی تھیں۔ اور جب اخروٹ لگتے تھے، تو لڑکے اُن پر پتھروں کی بارش کرتے تھے۔ پتھروں کے شور سے اُس کے اعصاب کو صدمہ پہنچتا تھا، اور جب وہ علماء و حکما کے مطالب و معانی کے جانچنے تولنے میں مصروف ہوتی تھی۔ تو اُس کے دماغی ۔۔ توازن میں فرق آجاتا تھا! چہ خوش!

جب میں نے دیکھا کہ گاؤں کے سب لوگ خصوصاً بڑے بوڑھے اس امر کی شکایت میں ہمزبان ہیں تو اُن سے پوچھا کہ "تم لوگوں نے ایسا ہونے کیوں دیا؟" اُن کے جواب سے کسقدر بے بسی ٹپکتی تھی۔ کہ "جب اسٹیورڈ کا حکم ہو جائے تو ہم لوگوں کو انکار کرنیکی کیا مجال ہے!"

خیر ایک بات سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ پادری نے سوچا تھا کہ بیوی کی فرمائش بھی پوری ہو جائیگی اور کچھ مالی منفعت کی صورت بھی نکل آئیگی۔ چنانچہ وہ اور اسٹیورڈ دونوں درختوں کو آپس میں تقسیم کر لینے کا ارادہ رکھتے تھے کسی نے جا کر مال افسر سے لگا دی۔ اُس نے اس زمین پر جس میں یہ درخت لگے ہوئے تھے۔ ملکیّت کا دعوے کر دیا۔ اور درختوں کو نیلام کر کے قضیہ فیصل کر دیا۔ درخت ابتک وہیں پڑے ہیں۔ اگر میں صاحب اختیار ہوتا تو

ان لوگوں سے خوب سمجھتا۔ مگر واہ، اُس حالت میں مجھے اس غیر اہم معاملے کی خبر ہی کیا ہوتی ؛

---

۱۶ ستمبر

وہ چند روز کے لئے البرٹ کے پاس گئی ہوئی تھی آج اُس کی واپسی کی خبر سُنکر میں اُس سے ملنے گیا۔ اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اپنے ہاتھ پر ایک طویل بوسہ دینے کی اجازت دی۔

اتنے میں ایک چڑیا جو ایک آئینے پر بیٹھی ہوئی تھی پُھدک کر اُس کے شانے پر آ بیٹھی۔ اُس نے اسے اپنے ہاتھ پر بٹھا لیا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”لو، ایک نئے مہمان کی آمد ہوئی۔ یہ بچوں کی بڑی چہیتی ہے۔ کیا ننھی سی چڑیا ہے! میں جب اُسے دانہ دیتی ہوں تو وہ اپنے نازک پر پھڑپھڑاتی ہے۔ اور اپنی چونچ سے ہلکے ہلکے ٹھونگے مارتی ہے۔ ذرا دیکھنا میرا مُنہ کس طرح چومتی ہے“

وہ چڑیا کو اپنے مُنہ کے نزدیک لے گئی، اور چڑیا نے اُس کے لبوں پر ایک ایسا بوسہ دیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا اُسے اس عشرت لمس کا احساس ہے۔ اور وہ اس سے سچ مچ کی لذّت حاصل کر رہی ہے۔

پھر شارلوٹ نے چڑیا کو میرے مُنہ کے نزدیک لا کر کہا۔ ”لو اب ان کا بھی مُنہ چومو“ چڑیا نے اپنی ننھی چونچ اُس کے مُنہ سے نکال کر میرے مُنہ میں ڈال دی۔ اور یہ بوسہ مجھے اتنا شیریں محسوس ہوا۔ جتنا جنّت والوں کو آبِ کوثر کا پہلا گھونٹ بھی نہ محسوس ہوتا ہوگا۔

میں نے مُسکرا کر کہا۔ ”اس کو تو دانہ چاہئے۔ اس سوکھے پیار سے اس کی کیا تسلّی ہوگی۔“

اُس نے جواب دیا ”مگر وہ دانہ میرے مُنہ سے چگتی ہے۔“ یہ کہکر اس نے اپنے مُنہ میں دانے بھر لئے۔ اور چڑیا کو مُنہ کے نزدیک لے گئی۔ اُس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک ایسا حسین تبسّم تھا، جیسے کوئی بچہ جب کسی ہمجولی کو اپنی معصوم خوشی میں شریک کرلے۔ تو اُس کا چہرہ پھول سا کھل جاتا ہے۔

مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اور میں۔ نے مُنہ پھیر لیا۔ آہ یہ سراسر ستم ناروا تھا۔ اُسے واجب نہ تھا کہ اپنی فرشتہ صفت معصومی کے یہ منظر دکھا کر مجھے اپنی حرماں نصیبی کی یاد دلائی۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے؟

۱۰۔ اکتوبر

صرف اس کی سیاہ آنکھوں کو دیکھتے رہنا میرے لئے ہزار عشرتوں کی ایک عشرت ہے! لیکن مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے۔ کہ البرٹ ایسا خوش نہیں جیسی اُسے امید تھی، یا جیسا میں خوش رہتا، اگر یہ بے بہا دولت میری

قسمت ہیں ہوتی۔

۱۹۔اکتوبر

اُف یہ خلا، یہ وحشت انگیز خلا جو میں اپنے سینے میں محسوس کرتا ہوں! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک بار صرف ایک بار، اُسے اپنے سینے سے لگا لوں تو یہ خلا ہمیشہ کے لئے پُر ہو جائیگا۔

۲۶۔اکتوبر

ولیم، مجھے یقین ہے اور یہ یقین روز بروز پختہ تر ہوتا ہوتا جاتا ہے۔ کہ کسی ایک شخص کی زندگی اس بھری دُنیا میں چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی، کہ شارلوت کی ایک سہیلی اُس سے ملنے آئی۔ میں اُٹھ کر برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ اور ایک کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا لیکن میرا جی اس سے بہت جلد اُکتا گیا۔ اور میں تمہیں خط لکھنے لگا۔ ان کی گفت گو مجھے صاف سُنائی دیتی تھی۔ وُہ دُور و نزدیک کی تازہ خبریں ایک دوسری کو سُنا رہی تھیں۔ اور اپنی واقفکاروں اور سہیلیوں کا ذکر اذکار کر رہی تھیں۔ ایک کا تو بیاہ ہونے والا تھا۔ اور دوسری بیمار تھی۔ ایسی بیمار کہ اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ بیچاری کھانسی کے مارے سوکھ کر کانٹا ہوئی جاتی تھی۔ لیکن یہ نامراد مرض اُس کا پیچھا چھوڑنے کا نام نہ لیتا تھا۔ شارلوت نے کہا۔ "ن کی حالت بھی تو غیر ہے۔" اُس کی سہیلی نے جواب دیا۔ "بس آج کل کا مہمان ہے۔ اُس کا جسم ابھی سے پھولنا شروع ہو گیا ہے۔" یہ باتیں ایسی نہ تھیں کہ مجھ پر اثر کئے بغیر رہتیں۔ میرا تصوّر مجھے فوراً جاں بلب مریضوں کے سرہانے لے گیا۔ اُدھر اُن کی یہ حالت ہے۔ کہ جانکنی کے عذابِ الیم میں مبتلا درد و کرب اور خوف و ہراس کی تکلیفیں سہ رہے ہیں اور ادھر یہ عورتیں ہیں کہ اس لاپروائی سے اُن کا ذکر کر رہی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اُن کا عدم و وجود برابر ہے۔ پھر جب میں آنکھ اُٹھا کر اس کمرے کے در و دیوار کو دیکھتا ہوں جس میں میں اس وقت بیٹھا ہوں جب میں شارلوت کے کپڑے اپنے سامنے پڑے دیکھتا ہوں، جب میری نظر البرٹ کے کاغذات پر، اس ساز و سامان پر جس کی ایک ایک جُز سے میں واقف ہوں۔ یہانتک کہ اس قلمدان پر جسے میں اس وقت استعمال کر رہا ہوں، پڑتی ہے، تو میرے دل میں معاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو مجھ سے اتنی اُلفت کرتے ہیں، آخر میرا ان سے کیا رشتہ ہے؟ یوں کہنے کو ہر ایک رشتہ ہے، دوست کی حیثیت سے ہو، یا کسی حیثیت سے، بہرحال وہ میری عزّت کرتے

ہیں۔ اور میرے دل میں اُن کی عزت ہے۔ اُن کو میری خوشی منظور ہے اور مَیں اُن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں حتّٰے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے لئے ایکدوسرے سے جدا ہونا محال ہے یہ سب صحیح، لیکن فرض کرو۔ اگر آج مجھے موت کا بلاوا آجائے، اور مجھے اُن سے رخصت ہونا پڑے۔ تو انہیں میری جُدائی کا قلق ہوگا؟ بیشک ہوگا لیکن کب تک؟ تھوڑی دیر کے لئے اُنہیں میرے بغیر اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس ہوگا۔ لیکن یہ خلا خود بخود پُر ہو جائیگا۔ اور پھر وہ میرا نام بھی لینگے۔ تو اس طرح کہ جیسے مَیں کبھی اس دُنیا میں آیا ہی نہ تھا۔ اور میری ہستی محض ایک افسانہ ہے۔ آہ، ضعیف البنیان انسان، تیری قسمت میں فنا اس طرح لکھی ہے کہ جہاں تو اپنی ہستی کا سب سے گہرا، سب سے پائدار نقش ثبت کرتا ہے۔ یعنی اپنے محبت کرنے والوں کے دلوں پر، وہاں سے بھی تجھے آخرکار حرفِ غلط کی طرح مٹ جانا ہے۔

۲۷۔ اکتوبر

مجھے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں ایکدوسرے کے دِل پر اثر کرنے کی کتنی کم قدرت ہے۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا سینہ شق ہو جائیگا۔ دِل کو دِل سے کسقدر اجتناب ہے کہ کوئی شخص میرے سینے میں وہ عشق و محبت یا خوشی و مسرت کے جذبات نہیں داخل کرسکتا جن کے قبول کرنے کی مجھ میں فطرتاً استعداد نہیں۔ اور چاہے میرے دِل میں محبت کا آتشکدہ ہزار روشن ہو۔ مَیں کسی شخص کو سوز و گداز سے آشنا نہیں کرسکتا۔ تاوقتیکہ اُس کی فطرت میں کوئی آتشگیر مادہ موجود نہ ہو۔

۲۸۔ اکتوبر

میرے پاس کیا نہیں؟ لیکن سچ پوچھو تو اُس کی محبت کے سوا کیا ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

۳۰۔ اکتوبر

سینکڑوں مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ قریب تھا مَیں اُسے اپنے آغوش میں لے لوں۔ الٰہی، یہ کس قدر رُوح فرسا عذاب ہے کہ حُسن مجسم ہوکر آنکھوں کے سامنے پھرے۔ اور اُسے مس کرنے کی بھی اجازت نہ ہو! حالانکہ مس کرنا نفسِ انسانی کے تمام جبلّی رجحانات میں اول درجے پر ہے! کیا بچّے ہر چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کرتے؟

۳۔ نومبر

خداگواہ ہے کہ میں کتنی مرتبہ رات کو بستر پہ لیٹے لیٹے دُعا مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی جاگنا نصیب نہ ہو، اب سوؤں تو ایسا سوؤں کہ قیامت کے دن اُٹھوں۔ لیکن جب رات گزر جاتی ہے، اور میں آنکھیں کھولتا ہوں، تو صبح محشر کے آفتاب کی بجائے وہی ہر روز کا آفتاب مجھے اپنی جانکاہ زندگی کے تسلسل کا پیغام دیتا ہے۔ اگر میں مزاج کا وہمی ہوتا تو موسم کی خرابی کو اپنی پژمردہ دلی کا باعث کہتا، یا کسی دوست کی شکایت کرتا۔ یا کسی ناکامی کا رونا روتا۔ اُس حالت میں مصیبتوں کا یہ بارِ گراں بٹ جاتا۔ اور تمام کا تمام میرے کاندھوں پر نہ رہتا۔ مگر آہ اس تکلیف دہ احساس کو کیا کروں۔ کہ میں خود اپنے رنج و الم کا واحد موجب ہوں۔ جس طرح پہلے میرا سینہ میری تمام خوشیوں کا سرچشمہ تھا۔ اسی طرح اب میرے تمام غموں کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔ میں وہی انسان تو ہوں جس کی خوشی ایک طرف ہوتی تھی اور ساری دُنیا کی خوشی ایک طرف، جس کے سامنے قدم قدم پر جنّت کے دروازے کُھلتے تھے۔ جس کے دِل کی وسعت کائنات کی وسعت پر حاوی تھی۔ اب وہ زمانہ ہی بدل گیا۔ اور اس کے ساتھ میں بھی کچھ کا کچھ ہو گیا ہوں۔ میرا دِل مُردہ ہو چکا ہے اور اب کسی طرح زندہ نہیں ہو سکتا۔ جذبات کا افسوں اب اس پر کبھی نہ چلے گا۔ آنسوؤں کی وہ جوئے رواں جو میرے حواس کو ہر وقت تازہ و شاداب رکھتی تھی۔ اُس کے سوتے خُشک ہو گئے ہیں۔ اور اُس کا رکاؤ میرے دماغ میں بوئے فساد پھیلا رہا ہے۔ میرے رنج محرومی کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ واحد نعمت مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ جس کے ساتھ میرا تمام لطف زندگی وابستہ تھا۔ وہ زندہ دلی، وہ بیتابی کی رُوح جس نے اس دُنیا کے عناصر سفلی سے میرے لئے ایک نئی دُنیا تعمیر کر رکھی تھی، اب مجھ سے رخصت ہو چکی ہے۔ جب میں اپنی کھڑکی میں کھڑا ہوتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ پہاڑیوں کے خوشنما سلسلے دُور دور تک پھیلے ہوتے ہیں صبح کا آفتاب دھندلکے کے پردے میں سے نکلکر دُنیا کو نورانی کر رہا ہے۔ جس پر ابھی تک رات کا سنّاٹا طاری ہے۔ اور ندی بید کے درختوں کے درمیان، جن کے پتّے جھڑ چکے ہیں، آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی بہ رہی ہے۔ جب میں فطرت کے یہ حسین مناظر دیکھتا ہوں اور دِلی مسرّت کا ایک آنسو بھی میری آنکھ سے نہیں ٹپکتا، تو ایسے لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک راندۂ درگاہ ہوں۔ جس پر فیضِ باری کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

پھر میں اکثر مایوسی کے عالم میں زمین پر گر پڑتا ہوں اور گڑگڑا گڑگڑا کر دُعا مانگتا ہوں۔ کہ الٰہی مجھے

آنسوؤں کی برکت عطا کر، جس طرح کوئی محنت ومشقت کا ستم زدہ دہقان گرمی کی شدت میں بارانِ رحمت کیلئے دست بدعا ہوتا ہے۔

مگر افسوس مَیں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ہماری نارسا دُعائیں مشیت ایزدی کو نہیں بدل سکتیں۔ وُہ گزرے ہوئے دِن جن کی یاد آ کر مجھے تڑپا جاتی ہے آہ، وہ کیسے اچھے دِن تھے! لیکن وہ کیوں ایسے اچھے تھے؟ اس لئے کہ مَیں اُن دنوں میں صبر وسکون کیساتھ برکاتِ آسمانی کے نزول کا منتظر رہتا تھا۔ اور نہ دِل سے خدا کی بخششوں کا شکر ادا کرتا تھا۔

۸۔ نومبر

شارلوٹ نے بکمال شفقت مجھے اپنی بے اعتدالیوں سے باز آنے کی نصیحت کی ہے۔ پچھلے دنوں میں نے شراب کے استعمال میں حد سے تجاوز کیا ہے۔ شارلوٹ نے بہ حالِ مُنکر مجھے سمجھایا کہ "ایسا کبھی نہ کرنا چاہتے۔ تمہیں میرا خیال نہیں آتا؟" مَیں نے جواب دِیا" تمہارا یہ سوال کس قدر غیر ضروری ہے؟ مَیں کب تمہارے خیال سے غافل رہا۔ جو تم یہ کہتی ہو! تمہارا خیال کیا معنی، تم ہر وقت میری رُوح میں بستی ہو۔ آج صبح میں اُس جگہ بیٹھا تھا، جہاں تم اگلے روز گاڑی سے اُتری تھیں، اور ــــ" اُس نے فوراً قطع کلام کر کے بات کا پہلو بدل دیا۔ میرے عزیز دوست، میری تمام قوتیں درماندہ ہو چکی ہیں۔ مجھے اپنے پر اتنا بھی تو اختیار نہیں رہا۔ کہ اُس کے خلافِ مرضی ایک لفظ کہہ سکوں۔

۱۵۔ نومبر

بھائی مَیں تمہاری سچی ہمدردی اور تمہاری خیر خواہانہ نصیحتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر میری التجا ہے کہ تم مجھے اپنے حال پر رہنے دو۔ میری حالت بیشک خراب و خستہ ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھ میں ابھی قوتِ برداشت باقی ہے۔ تم مجھے مذہب سے مُنکر خیال کرتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو، کہ مَیں اُس کا واجب احترام کرتا ہوں۔ مَیں مانتا ہوں کہ وُہ ضعیفوں کی پشت پناہ اور غمزدہ دلوں کی تسکین ہے مگر ذرا سوچو تو، کیا اُس کا اثر سب پر یکساں ہوتا ہے؟ تمہیں ہزاروں ایسے لوگ ملیں گے جن کے نزدیک "مذہب" ایک بے معنی لفظ ہے، اور ہزاروں ایسے دیکھنے میں آئیں گے کہ چاہے تم اُن کو قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لاؤ۔ اُن کے نزدیک مذہب کی ہستی کبھی مسلّم نہ ہو گی۔ کیا خود مالک القلوب نے بعض دِلوں پر قفل نہیں لگا دِتے؟ تعجب نہیں کہ میرا بھی دِل

انہی میں ہو!

دیکھو، میرے جذبات کے اس بے تکلف اظہار کو غلط معنی نہ پہنانا، میرے ان بے ضرر جملوں سے کوئی ذم کا پہلو نہ نکالنا۔ یقین جاننا میں اُن الفاظ میں اپنی رُوح تم پر منکشف کئے دیتا ہوں۔ اگر مجھے ایسا کرنا مقصود نہ ہوتا۔ تو مَیں خاموشی کو ترجیح دیتا۔ تم جانتے ہو۔ کہ اگر سبب مجھے کسی امر میں شک ہو۔ تو مَیں اُس کی نسبت کچھ نہیں کہتا۔ لیکن جب مجھے یقین ہو جائے کہ کسی کو میرے برابر اس سے واقفیت نہ ہوگی، تو مَیں اپنے خیالات کے اظہار میں پس و پیش نہیں کیا کرتا۔

تم مجھے قسمت کو بُرا کہنے سے منع کرتے ہو، لیکن مجھے بتاؤ، انسان کی قسمت اس کے سوا کیا ہے۔ کہ اُس تلخ جام کو پئے۔ جو ازل کے دن اُس کے لئے بھرا گیا ہے۔ اور اگر یہ جام بڑے بڑوں کو تلخ معلوم ہُوا، تو مَیں کیوں عالی حوصلگی کا جھوٹا ادعا کروں اور اُس کی تلخی سے مُنکر ہوں۔

تم مجھے سمجھاتے ہو کہ انسان کو مایوس نہ ہونا چاہئے اور امید رکھنا چاہئے کہ ہر کام کا انجام بخیر ہوگا۔ لیکن للہ مجھے اتنا بتاؤ کیا انسان کی زندگی کا موت کے سوا کچھ انجام ہے؟ پھر مَیں کیوں اُس خوفناک لمحے کے خیال سے ترساں ہونے کو اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھوں۔ جب میری ہستی بقا و فنا کے درمیان متزلزل ہوگی، جب ماضی کی یاد بجلی کی چمک کی طرح مستقبل کی تاریکیوں کو ایک لمحے کے لئے منوّر کر کے فراموشی کے پردے میں پنہاں ہو جائیگی۔ جب موجودات کا نظام میری آنکھوں کے سامنے درہم برہم ہو رہا ہوگا؟ — ولیم، یہی ہوتی ہے اُس مجبور انسان کی صدا، جو قضا کے آہنی پنجے میں گرفتار، اپنی ناکافی قوت سے اُس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی بیدست و پائی دیکھ کر چیختا اور پکارتا ہے کہ "میرے خدا تو کہاں ہے؟ تو نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟" پھر اپنی فریاد کی ناشنوائی اور اپنی بیکسی و ناتوانی کے احساس سے اُس کی آس ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اس کے سوا اُس سے توقع بھی کس بات کی رکھی جا سکتی ہے؟ جب ہر انسان کا یہ حال ہے تو مَیں جو اپنا انجام روز روشن کی طرح دیکھ رہا ہوں۔ کیوں ناامیدی کے کلمات مُنہ سے نکالنا اپنے لئے شرم کا باعث خیال کروں!

۲۱۔ نومبر

اُسے کچھ احساس نہیں، کچھ خبر نہیں، کہ وہ ایک ایسا زہر تیار کر رہی ہے۔ جو ہم دونوں کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ اور مَیں اس زہرِ قاتل کو اپنی آنکھوں دیکھ کر

پتے جا رہا ہوں۔ وہ لطف و عنایت کی نگاہیں جو وہ اکثر — اکثر نہیں تو کبھی کبھی ضرور — مجھ پر ڈالتی ہے، وہ توجہ اور دلدہی جس کے ساتھ وہ میرے جذبات کو جو اکثر میری زبان سے اضطراری طور پر ادا ہو جاتے ہیں سُنتی ہے۔ اور وہ ہمدردی اور دلسوزی جس کے آثار اُس کے چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں — یہ باتیں کیا معنی رکھتی ہیں؟

کل جب مَیں اُس سے رخصت ہونے لگا، تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا۔" پیارے، ویرٹر، خدا حافظ۔" پیارے ویرٹر! یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے مجھ سے یہ کہکر خطاب کیا ہو۔ ان الفاظ نے مجھ پر تیر و نشتر کا کام کیا۔ مَیں نے اُن کو ہزار بار دُہرایا ہے اور کل رات تو ایسا ہُوا کہ مَیں بستر پر لیٹا اپنے جی میں اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہا تھا۔ کہ یکایک بآواز بلند کہتا ہوں۔" پیارے ویرٹر! خدا حافظ!" بعد میں اپنی اس بدحواسی پر مجھے بہت ہنسی آئی۔

(باقی آیندہ)

محمد ہادی حسین

افکارِ رنگیں

(۱)

حسن مطرب ہے، اور نغمۂ چنگ — تختۂ گل ہے اور مئے گلرنگ
الفراق! اے خیالِ جلوۂ حور — والسّلام! اے ہوائے عزّت و ننگ

(۲)

عقل حیرانیٔ نگاہ سے تنگ — عشق آماجگاہِ بارشِ سنگ
رُوح فرسا ہے عقل و عشق کی جنگ — ساقیا! ساغرِ مئے گلرنگ

(۳)

دلِ عالم میں ہے خوشی کی ترنگ — ساقیٔ خوبرو و خوش آہنگ
دورِ ساغر ہو اور نغمۂ چنگ — ہیں فریبِ نظر بہار کے رنگ

اثر صہبائی

جذبات

جبتک دلِ محزوں میں تری یاد رہیگی
دُنیائے تمنّا مری آباد رہے گی

اِک قطرہ ہوں میں بحرِ حوادث کا جہاں میں
گرداب کی آفت مجھے کیا یاد رہیگی

خنجر کا ترے شوق بڑھاؤنگا دمِ ذبح
فریاد کے پردے میں مری داد رہیگی

اِک حیلہ بھی جبتک ہے فلک کے لئے باقی
دُنیائے تمنا ستم آباد رہے گی

کچھ اور خدا عمرِ محبّت کی بڑھا دے
دو دن کی مصیبت مجھے کیا یاد رہیگی

حیران ہوں کچھ رنگِ اثر ہی نہیں کھلتا
دھوکے میں کہاں تک مری فریاد رہیگی

اِک تیر خدا کے لئے پہلو میں چبھو دے
اُجڑی ہُوئی بستی مری آباد رہے گی

ویران نہ ہوگی کبھی دُنیائے مصیبت
ہر بات مری محشرِ فریاد رہیگی

امید ہے دنیا مرے مرنے پہ اُجڑ کر
خاکِ دلِ برباد سے آباد رہے گی

بے مہری تاثیر کہیں توڑ نہ دے دل
کب تک لبِ فریاد پہ فریاد رہے گی

مٹ جائے دلِ زار مگر غم نہ مٹے گا
پیکانِ محبّت کی کھٹک یاد رہیگی

کھو جائیگی جلووں میں ترے ساری مصیبت
صورت شبِ فرقت کی کسے یاد رہیگی

تقدیر مری گردشِ دوراں سے بنی ہے
مٹی دلِ ناکام کی برباد رہے گی

خوگر دلِ محزوں کو بنا لوں گا بلا کا
امیدِ غم آسودۂ بیداد رہے گی

اجزا عناصر میں تو افق کا یقیں ہے
کب تک یہی دلگرمیِ اضداد رہیگی

جس روح کو حاصل ہوں پروبالِ تصوّر
صیاد قفس میں بھی وہ آزاد رہیگی

رویا ہوں بہت قافلہ والوں سے بچھڑ کر
آوازِ جرس شاہدِ فریاد رہے گی

مل جائیگی آغوشِ سکونِ غم دِل میں
وہ عمرِ محبّت میں جو برباد رہے گی

وہ جلوۂ بے مہر وہ مایوسی امید
مشکل دِلِ محزوں کی مجھے یاد رہیگی

پابند ہوں اجزاءِ عناصر کا میں ہادی
اس قید میں کیا رُوح بھی آزاد رہیگی

ہادی مچھلی شہری

تاروں بھری رات

(۱)

وقفِ سکوں ہُوا ہے ہر اک شے کا اضطراب — ہر نقش زندگی کا بنا نقشِ سطحِ آب
تاریکیوں میں ڈوب گیا جام آفتاب — پھونکا شبِ سیاہ نے ایسا فسونِ خواب

سب شورشیں حیات کی خاموش ہوگئیں
آنکھیں شرابِ خواب سے مدہوش ہوگئیں

(۲)

جلوہ فشاں ہے وادیٔ اخضر میں بوستاں! — پیشِ نظر ہے منظرِ فردوس کا سماں
دامانِ گلفروش ہے دامانِ کہکشاں — کیا دلفریب چرخ کی ہیں زرنگاریاں!

افشاں جبینِ شب پہ نمودار ہوگئی
سطحِ فلک تمام سمن زار ہوگئی

۳

تارے فضائے عرش میں ہیں جگمگا رہے — آویزے یا ہیں ماہ جبینانِ خُلد کے
روشن ہُوئے ہیں محفلِ بالا کے قمقمے! — یا ڈل میں پھول ہیں یہ کنول کے کھلے ہوئے

حورانِ خلد شب کے لئے بے نقاب ہیں
یا بحرِ نیلگوں کے طلائی حباب ہیں

(۴)

گلشن میں طائروں کے ہُوئے آشیاں خموش　　صحرا میں ہو گئے جرسِ کارواں خموش

کوہِ گراں خموش ہے بحرِ رواں خموش　　بزمِ جہاں خموش ہے کون و مکاں خموش

شاعر کا ساز زمزمہ پرداز ہے مگر

اس کا خیال مائلِ پرواز ہے مگر

(۵)

گو چشمۂ حیات نمودِ سراب ہے　　گو زندگی ہماری مثالِ حباب ہے

گو نقش ہر امید کا اِک نقشِ آب ہے　　گو ذکرِ ہست و بود فسانہ ہے خواب ہے

لیکن یہ بزم گلکدۂ رنگِ حسن ہے

عالم تمام جلوۂ ارژنگِ حسن ہے

(۶)

تاروں سے چرخ ہے ورقِ زرنگارِ حسن　　گویا کھلی ہُوئی ہے فلک پر بہارِ حسن

ہے بادہ ریز جلوۂ رنگیں عذارِ حسن　　جامِ جہاں ہے جامِ مئے خوشگوارِ حسن

پی اور بے ثباتیِ عالم کو بھول جا

ناکامیوں کی سوزشِ پیہم کو بھول جا

آثر صہبائی

بُلبلِ اسیر اور عاشقِ مہجور

اے نوا سنجِ فغاں! منّت کشِ قیدِ قفس! ایک مشتِ پَر ہے تو لیکن سراپا سوز ہے
دل ترا سوزِ محبت سے ہے اِک آتشکدہ تیری ہر ہر آہ میں پنہاں بلا کا سوز ہے

ہے بجا یہ آہ و زاری، ہے بجا یہ اضطراب حیف یہ فصلِ بہاراں! اور تو محبوس ہے
خوبیٔ تقدیر سے صیّاد کے پالے پڑی نغمہ سنجی کے عوض فریاد سے مانوس ہے

مانعِ پرواز ہیں ظالم قفس کی تیلیاں پر شکستہ بھی ہے تو، دل بھی شکستہ ہے ترا
پھر بھی یہ پر تولنا رہ رہ کے تیرا بار بار کہہ رہا ہے، شوق دل میں ہے ابھی پرواز کا

مرحبا صد مرحبا! یہ حوصلہ مندی تری ایک مشتِ پر کی یہ ہمّت خدا کی شان ہے
دل ہے سوز آباد، لب پر آہ، صدمے رُوح پر اللہ اللہ! زندگی کا بھی مگر ارمان ہے

دیکھ مجھ کو میں بھی ہوں تیری طرح پابندِ غم تو چمن سے دُور ہے، مَیں اپنے گل سے دُور ہوں
آگ ہے دِل میں ترے، ہے سوز میرے قلب میں تو بھی اِک غمگین ہے اور میں بھی اِک رنجور ہوں

مضطرب پہلو میں دِل ہے صورتِ برقِ تپاں دُور بھی اُس سے ہوں میں اور موردِ بیداد بھی
مستزاد اس پر ہیں چشمِ خونفشاں کی شورشیں گل بداماں بھی ہوں میں، آمادۂ فریاد بھی

تو بھی ہے واماندۂ مقصود، میں بھی نامراد تو اُدھر فریاد کش ہے، مَیں ادھر نالہ سرا
آ بہم مِل کر کریں ہم دونوں نالے اس طرح شق ہو تیرا سینہ، میری رُوح ہو تن سے جُدا

یعنی دھو لیں ہاتھ دونوں اپنی اپنی زیست سے قیدِ غم سے اس طرح ہو جائینگے فوراً رہا
زندگی دو دن کی ہے مرنا ہے آخر ایکدن کیوں ڈریں مرنے سے ہم مرنا ہے تو ڈرنا ہے کیا

رازؔ چاندپوری

منشی نظیر حسین خاں نسیم لکھنوی

منشی صاحب قبلہ "مجلس ادبا" میں ایک مختصر سی میز کے قریب بیٹھے ہیں۔ اور اگر اتفاقاً میری نظر اُن کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ تو وہ اس ادا سے دیکھتے ہیں، گویا رحم کی درخواست کر رہے ہیں۔ اور اس ادا میں شبہے کا ایک عنصر بھی شامل معلوم ہوتا ہے۔

خدا اس کے شبہے کو غارت کرے! اگر میں اس کے راز کو افشا کرنا چاہتا تو کئی سال پیشتر کر چکا ہوتا۔ اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب تو اُسے مطمئن ہو جانا چاہئے اگر کوئی ایسا موٹا شخص مطمئن ہو سکتا ہے!

میں اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں وہ کیک کے بے شمار ٹکڑے نگلتا جا رہا ہے۔ اور میری طرف دیکھ رہا ہے۔ خدا اسے غارت کرے۔

بس اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا منشی صاحب قبلہ۔ اگر آپ مجھ سے اس طرح کا سلوک کرتے ہیں گویا میں شریف نہیں ہوں۔ تو لیجئے پھر میں بھی آپ کے متعلق آج سب پوست کندہ حالات کا اظہار کئے دیتا ہوں۔

منشی صاحب وہی شخص ہیں جس کی مدد کرنے میں میں نے اپنے دماغ کی تمام عدیم المثال ذہانت کو خرچ کر دیا اور اب وہ اپنی مسترحمانہ نگاہوں اور اپنی آنکھوں کے اندازِ بدگمانی سے میری زندگی کو تلخ بنا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا اسے حق ہے کہ وہ ہر وقت کھاتا ہی رہے۔ کمبخت کہیں کا خدا اسے غارت کرے۔

اچھا تو لیجئے، میں اس کا افسانہ تمام و کمال بیان کئے دیتا ہوں!

میں منشی صاحب سے اسی کمرے میں متعارف ہوا تھا۔ میں حال ہی میں "مجلس ادبا" کا ممبر بنا تھا۔ اور میرے انداز سے سراسیمگی سی پائی جاتی تھی۔ منشی صاحب اس بات کو تاڑ کر میرے قریب آ بیٹھے۔ آ کیا بیٹھے دھم سے ایک کرسی پر گر پڑے۔ اور میں نے اسکی متعدد ٹھوڑیوں اور توند کے مجموعے کی طرف تعجب سے دیکھنا شروع کیا۔ اتنا موٹا آدمی میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ اُنہوں نے خود ہی مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ اور اپنی شاعری کی خوب چٹخارے لیکر تعریف کی۔ اور تین گھنٹہ میرا دماغ پریشان کرتے رہے پھر یکایک موضوع گفتگو کو بدل کر بولے۔ "غالباً آپ مجھ

سے زیادہ ہی کھلاتے ہونگے۔ اور پھر بھی ہم دونوں میں کتنا فرق ہے۔ آپ تو بالکل دُبلے پتلے ہیں۔" اور توند یلے آدمیوں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا۔ کہ خود وہ بہت کم کھانا کھاتے ہیں۔

اور پھر موٹاپے کے متعلق گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ توبہ! باتیں جو شروع ہُوئیں تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتیں۔" مَیں نے اپنے موٹاپے کے متعلق وہ دوا خریدی تھی۔ اور یہ دوا خریدی ہے۔ اور وہ دوا خریدوں گا۔" لوگوں نے مجھے وہ مشورہ دیا تھا۔ اور یہ مشورہ دیا ہے۔ اور وہ مشورہ دینگے" اس قسم کے موٹاپے کے متعلق اور لوگوں کی کیا راتے تھی۔ کیا رائے ہے اور کیا رائے ہوگی۔"

آخر کار میری طبیعت بیزار ہو گئی۔ اور منشی صاحب قبلہ کی گفتگو سے نفرت ہونے لگی۔ اور ان کی یہ حالت کہ مَیں مجلس ادبا میں گھسا نہیں اور اُنھوں نے مجھے دبوچا نہیں۔ اور پھر وہی موٹاپے اور شاعری کے متعلق لایعنی خرافات کا ایک طومار چھڑ گیا لیکن اس گفتگو کے دوران میں بھی مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ آخر کار ایک دن راز کھُل گیا۔ باتوں باتوں میں وہ بولے۔" مغرب میں طب اور عمل جراحی ارتقا کے تمام منازل طے کر کے اب عروج کے نقطۂ کمال پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن سُنتا ہوں کہ مشرق میں بعض لوگوں کے پاس چند ایک ....."

مَیں نے انہیں ٹوک کر پوچھا۔" منشی صاحب سچ بتایئے۔ آپ کو کس نے بتایا تھا۔ کہ میرے دادا ایک حکیم تھے اور ان کے ٹوٹکے بہت مجرب ہُوا کرتے تھے؟"

"یونہی مجھے معلوم ہو گیا!"

مَیں بولا۔" یونہی تو نہیں۔ کیا جلال الدین نے کہا؟"

اُنھوں نے جواب دیا۔" ہاں"

مَیں نے دل ہی دِل میں جلال الدین صاحب کو ہزار ہزار گالیاں دیں۔ اور ارادہ کر لیا کہ وہ ملیں تو اُن سے سمجھونگا۔

آخر مَیں نے کہا۔" جلال الدین صاحب نے اس نسخہ کو استعمال کیا ہے۔ جو میرے دادا صاحب مغفور نے موٹاپے کے لئے تجویز کیا تھا۔ لیکن نسخہ خطرناک ہے اور یہ جلال الدین صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا۔"

منشی صاحب نے کہا۔" خیر! مَیں خطرے سے نہیں ڈرتا۔ بشرطیکہ کسی طرح میرا موٹاپا دُور ہو جائے۔"

مَیں انکار کر دیتا لیکن مجھے خوف تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو منشی صاحب مجھ پر حملہ کر کے مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ ہاں بھئی۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ موٹاپا بھی تو ایک قسم کا جنون ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اگر منشی صاحب سے کچھ بری بھلی ہو گئی تو مجھے

اسقدر رنج بھی نہ ہوگا۔ جلال الدین صاحب نے جسوقت وہ نسخہ استعمال کیا ہے اُس وقت اس میں خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن بعض ایک باتوں سے مجھے یقین ہوچکا تھا کہ اگر اب یہ نسخہ استعمال کیا گیا تو ضرور کوئی نہ کوئی آفت برپا ہوگی۔

پھر اگر منشی صاحب قبلہ مر گئے!! مجھے اعتراف ہے کہ اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں طمانیت اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور مَیں نے ارادہ کرلیا کہ وہ نسخہ ضرور ان کے حوالے کردونگا۔

اسی رات مَیں نے اپنے جد عالی تبار کے کمرے میں سے وہ صندل کا بکس نکالا جس میں ان کے نسخے رکھے رہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے جد عالی تبار مرحوم کا کاتب بہت بدخط تھا۔ اور اس کا لکھا ہوا پڑھ لینا ہفت خوان رستم کو طے کرنے سے کسی طرح کم ثابت نہ ہُوا آخرکار نسخہ مل گیا۔ اور دوسرے دن منشی صاحب کو دکھایا گیا۔

مَیں نے اپنے لہجے کو باوقار اور انداز کو سنجیدہ کرتے ہُوئے کہا۔ "جہانتک میری عقل کام کرتی ہے۔ یہ نسخہ وزن کو کم کرنے کے لئے ہے۔"

"خوب" یہ منشی صاحب کی طرف سے۔

"ہر چند کہ مَیں اطمینان سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ وہی ہے۔ جو جلال الدین صاحب نے استعمال کیا تھا۔ اور اگر آپ میری بات مانیں تو اس نسخے کو استعمال نہ کریں۔ باقی جو رائے والا ہیں آئے۔"

منشی صاحب نے کہا۔ "بھئی آزمائش میں کیا ہرج ہے۔" ان کا خیال تھا کہ کہیں مَیں نسخہ لیکر چمپت ہی نہ ہوجاؤں۔ اس لئے ساتھ ہی میرے ہاتھ سے نسخہ تقریباً چھین لیا۔

مَیں نے اپنے تخیّل کو ناممکنات کی فضا میں پرواز کرنے کے لئے آوارہ چھوڑ دیا۔ اور نتیجے سے غیر مطمئن ہوکر کہا۔ "مولنٰا! خدا کے واسطے یہ تو بتایئے۔ کہ آپ کے ذہن میں یہ کیا سمائی ہے کہ آپ دُبلے ہوکر خوبصورت معلوم ہونگے۔ میرے تخیل کو تو اس حقیقت کے تصوّر کرنے میں ناکامیابی ہُوئی ہے۔"

وہ ناراض ہوگئے۔ ماتھا شکن در شکن ہوگیا۔ لیکن خاموش رہے۔

آخرکار مَیں نے ان سے وعدہ کرلیا۔ کہ چاہے کچھ ہو وہ پھر مجھ سے کبھی اپنے موٹاپے کا ذکر نہ کریں گے۔ اور یہ وعدہ لیکر انہیں نسخہ استعمال کرنیکی اجازت دی۔

اس کے بعد چودہ دن تک ہم نے اسکے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسی طرح موٹے کا موٹا تھا۔ آخرکار ایک دن وہ کہنے لگے۔ "بھئی معاف کرنا۔ لیکن گفتگو ضروری ہے۔

"آپ کے نسخے نے تو کوئی فایدہ نہیں کیا۔"

"نسخہ کہاں ہے۔"

"انہوں نے جیب سے نسخہ نکالا۔"

"کیا آپ نے انڈا ملایا تھا۔"

"نہیں"

مَیں نے خفا ہو کر کہا۔ "اب کے انڈا ضرور حل کیجئے گا میرے جد عالی تبار کے تمام نسخوں میں انڈوں کی آمیزش ضروری ہے۔ اچھا اور جہاں کسی شے کی مقدار یا حالت واضح نہ کر دی گئی ہو۔ تو شے موصوف کی قلیل سے قلیل مقدار اور اس کی ردی سے ردی قسم لینی چاہئے۔ اچھا اور جناب نے تازہ مرے ہوئے سانپ کی کھال خریدی تھی!"

"مَیں تو وایٹ مرے اینڈ کو سے لے آیا تھا۔ اور اس کی قیمت ......"

"قیمت سے مجھے کیا کام۔ آپ تازہ مرے ہوئے سانپ کی کھال خریدیئے۔ اور کتے سے مراد مرا ہوا کُتّا ہے۔"

اس کے بعد ایک ماہ تک ان کے موٹاپے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ایک دن وہ اپنے وعدے کے خلاف مجھ سے کچھ کہا چاہتے تھے۔

"آپ کے جد عالی ....."

میں نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "خبردار۔ ایک حرف نہیں۔"

وہ چُپ ہو گئے۔

ایک دن جو مَیں مجلس ادبا میں گیا تو وہ غایب تھے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے ایک تار موصول ہوا۔ "خدا کے لئے جلد آؤ" از نسیم لکھنوی۔ لکھنوی کی شیخی تار میں بھی باقی تھی!

مَیں نے اطمینان سے دوپہر کا کھانا کھایا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جد نامدار کی شہرت کو جو نقصان نسخے کے غیر موثر ہونے سے پہنچا تھا اس کی تلافی ہونے والی ہے۔ مَیں نے سہ پہر کی چائے پی۔ اور پھر مولنا نسیم لکھنوی کے ہاں روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کے تمام نوکر دروازے پر کھڑے ہیں۔ اور بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

مَیں نے پوچھا۔ کیا بات ہے۔

ایک نوکر نے جو ان کا بہت منہ لگا ہوا تھا جواب دیا۔ "حضور۔ میاں نے کمرے کا قفل اندر سے لگا لیا ہے اور کل سے باہر نہیں نکلے۔ اندر ہی سے چلاتے ہیں۔ آپ کے متعلق حکم ہوا کہ وہ جس وقت آئیں انہیں اوپر میرے پاس بھیجدیا جائے۔ باقی سب نوکر وغیرہ نیچے رہیں۔ کوئی اُوپر نہ چڑھے۔"

مَیں نے حیرانی سے کہا۔ "قفل لگا کر کل سے اندر

کیا کر رہے ہیں۔"

"خدا جانے حضور۔ میاں کو کیا ہو گیا ہے۔"

"اور کھانا"

"کھانا تو حضور وہ بے انتہا کھاتے ہیں۔ دن بھر کھانا ڈھوتے ڈھوتے کمر دُکھنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خبط خدا جانے کیا ہے کہ کل سے وہ پندرہ کے قریب میزیں منگوا چکے ہیں۔ مَیں کمرے کے باہر رکھ کر چلا آتا ہوں۔ اور وہ خود اندر گھسیٹ لیتے ہیں۔"

مَیں اُوپر گیا۔ اندر سے آواز آئی "تم ہو راحت حسین"

مَیں نے جواب دیا "جی"

مجھے یوں معلوم ہُوا۔ گویا وہ اندھیرے میں دروازے کو ٹٹول رہا ہے۔ اور پھر کُنجی کی آواز آئی۔ اور دروازہ کُھل گیا مَیں اندر داخل ہُوا۔ اور فطرتی طور پر کمرے کو خالی دیکھ کر حیران ہُوا۔ منشی صاحب قبلہ موجود نہ تھے!! شاید اس سے زیادہ مجھے کبھی خوف نہیں محسوس ہُوا۔ ان کے کمرے میں ہر ایک چیز بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھی۔ بے شمار کیک اور اشیائے خوردنی موجود تھیں۔ اور منشی صاحب غائب تھے۔ حالانکہ مَیں خود ان کی آواز سن چکا تھا۔

"راحت صاحب دروازہ بند کر دیجئے"

اور پھر مجھے معلوم ہُوا کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک کونے میں چند ایک میزیں پڑی تھیں۔ اور سب سے اونچی میز پر منشی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر چھت سے لگا ہُوا تھا۔ گویا کسی نے سریش سے جما دیا ہے۔

مَیں نے کہا "منشی صاحب اگر میزوں میں سے کوئی میز کھسک گئی تو آپ کی خیر نہیں۔"

"کاش میری جان ہی چلی جائے۔"

مَیں نے حیرانی سے کہا۔ "خیر ہے؟"

اور پھر جو دیکھتا ہوں تو منشی صاحب میزوں سے علیحدہ ہو کر چھت کے ساتھ ساتھ ہوا میں تیر رہے ہیں اور نیچے آنے کی کوشش کر رہے ہیں گویا کوئی ہوا کا غبارہ ہو۔

وہ دردناک سے انداز میں کہنے لگے "یہ سب تمہارے نسخہ کا کرشمہ ہے۔" اب وہ آہستہ آہستہ ایک تصویر کو جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔ پکڑ کر اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ یکایک تصویر ان کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اور وہ کھٹ سے چھت کے ساتھ جا لگے۔ اب مجھے معلوم ہُوا کہ ان کے کپڑوں پر سفیدی کیوں موجود تھی۔

انہوں نے اپنے سر کو سہلانا شروع کیا۔ مجھے توقع ہے کہ انہیں بہت سخت چوٹ آئی ہو گی۔

جب تکلیف کا احساس ذرا کم ہُوا تو بولے۔" وہ نسخہ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہُوا۔ میرا کوئی وزن ہی نہیں رہا۔"

اور یکایک میرے دماغ میں حقیقت کی روشنی بجلی کی طرح چمک گئی۔

مَیں نے ہنستے ہُوئے کہا۔ مولٰنا وہ نسخہ تو وزن کو کم کرنے کے لئے تھا۔ اور آپ اپنے موٹاپے کو وزن کہتے تھے۔ موٹاپا اور وزن تو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ ایک شخص دُبلا ہوکر وزن دار ہو سکتا ہے۔"

پھر مَیں نے پوچھا۔" تو اب آپ کے نیچے اُترنے کی کوئی ترکیب بھی ہے؟"

" میرا ہاتھ پکڑکر مجھے کھینچو تو شاید کامیابی کی کوئی صورت نکلے۔"

مَیں نے میز پر چڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ جب ان کے قدم زمین کے ساتھ آ لگے تو ان کو سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ وہ زمین پر کھڑے اُچھل رہے تھے اور میرا ہنسی ضبط کرنیکی کوشش میں بُرا حال ہو رہا تھا۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں بے اختیار ہنس دیا اور اس کے ساتھ ہی فطری طور پر میری گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ بس یہی آفت ہُوئی گرفت کا ڈھیلا ہونا تھا کہ ایک لمحے میں مولانا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر یکایک چھت سے جا لگے۔ اور" ٹھراک" کی آواز آئی۔ میں حیران ہوں کہ مولانا کا سر کیسے سلامت رہ گیا۔

اب وہ بہت ناراض ہُوئے۔ برس پڑے۔ فرمانے لگے۔" تم مذاق کرنے ہو جی، مجھے چوٹ لگتی ہے اور ان کو ہنسی آتی ہے۔"

مَیں نے سنجیدہ چہرہ بناکر کہا۔" مولنا! مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ آپ کو نیچے بہت دیر تک سنبھال سکوں۔"

یہ کہہ کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ ایک الماری میں ہندی کی دیراۃ المعارف پڑی ہُوئی تھی۔ ہزار ہزار صفحے کی ایک ایک جلد۔ کم از کم دس سیر وزن۔ مَیں نے ان میں سے دو جلدیں اُٹھا کر ان کے ہاتھوں میں دیدیں۔ اب وہ آہستہ خرام بلکہ مخرام زیر قدمت ہزار جان است کا ثبوت بدرجہ اتم بہم پُہنچاتے ہُوئے اور سر کو سہلاتے ہُوئے نیچے اُترے۔ لیکن ہندی کی یہ کتابیں بھی ان کا وزن درست نہ کرسکیں۔ اگر مَیں جلدی سے انہیں ایک بڑی سی میز کے نیچے نہ دبا دیتا، اگرچہ وہاں بھی وہ اُچھل اُچھل کر میز کو اُڑا لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مَیں خود میز پر بیٹھ گیا۔ اور اب ان سے باتیں شروع کیں۔

" آخر یہ واقعہ ہُوا کیسے؟"

" دوا کے استعمال سے"

مَیں نے کہا۔" یہ تو ہُوا۔ لیکن ذرا تفصیلی حالات گوش گزار کیجئے۔ اور یہ تو فرمائیے، کہ اس کا ذائقہ

کیسا تھا۔"

"کڑوا"

مولنا نسخے کی کڑواہٹ کے متعلق بالکل سچ بول رہے ہونگے۔ میرے جد عالی تبار کے تمام نسخوں کی یہ خصوصیت ہے کہ بلحاظ عناصر۔ بلحاظ امکانِ نتائج یا بلحاظ تاثراتِ ترکیب۔ تمام کے تمام انتہا درجے کے ناخوشگوار واقع ہوتے ہیں۔

"پہلے مَیں نے ذرا سا چکھا۔"

"پھر"

"اور مَیں نے اپنے آپ کو بتدریج ہلکا پھلکا محسوس کرنا شروع کیا اس لئے مَیں نے ارادہ کر لیا کہ نسخہ کلی طور پر استعمال کرونگا۔"

"واہ! مولنا"

"مَیں نے اپنی ناک بند کر کے نسخہ استعمال کرنا شروع کیا۔ اور آہستہ آہستہ میرا جسم میرے قابو سے باہر ہو گیا۔"

پھر یکایک وہ جھلا کے بولے۔ "آخر اب ہو گا کیا۔ اب مَیں کیا کروں۔"

مَیں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کم از کم ایک بات ہرگز نہ کیجیے گا۔ اور اگر آپ کہیں یہ حماقت کر بیٹھے۔ تو بس پھر عالمِ بالا کی طرف پرواز فرما جائیے گا۔"

مَیں نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے اُسے مضحکہ خیز طور پر ہلانا شروع کیا۔

"شاید پولیس کو تمہاری گمشدگی کی تفتیش میں بہت دقّت پیش آئے۔ ہاں بھئی۔ آخر وہ ہوائی جہاز کہاں سے لائیں گے۔"

اس بات کو سُن کران کے غُصّے کی انتہا نہ رہی اور اُنھوں نے میری اور میرے جد عالی تبار کی شان طبابت میں ایسے کلمات کا استعمال شروع کیا جو گستاخی کی حد تک پہنچ گئے۔

مَیں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ فطرت انہیں بہت کھانے کی سزا دے رہی تھی۔ اس معاملے پر ہماری بحث بہت عرصہ جاری رہی۔ اور آخر کار انکی شعلہ بار نگاہوں سے مرعوب ہو کر معاملات کے اس زاویہ کو چھوڑ کر انہیں ایک دوسری طرف منعطف کرنا چاہا۔

مَیں نے نہایت سکون سے اور ایسے لہجے میں گویا کوئی پروفیسر اپنی جماعت کے طلبا کو ایک گراں پایہ نصیحت کر رہا ہے۔ کہا۔

"اور علاوہ ازیں مولنا آپ اپنے موٹاپے کو "وزن" کا خطاب دیتے تھے۔ آپ سے ان دو اشیاء کو مدغم کر دینے کا منطقی قصور سرزد ہوا ہے۔ موٹاپا غیر شاعرانہ اور واہیات شے ہے۔ اور وزن ....."

اُنہوں نے مجھے ٹوک کر کہا۔ "یہ سب ٹھیک"

اور پھر نہایت عاجزانہ سے انداز میں بولے "لیکن بھئی میرا کچھ بندوبست بھی تو کرو۔"

یہ وہ موقع تھا جب میری نفرت و حقارت پر میری دانشمندی کا احساس غالب آگیا۔ اگر میں ذرا تدبر سے کام لیتا تو میں انہیں کوئی تدبیر نہ بتاتا اور پھر وہ کبھی مجھے "مجلس ادبا" میں اپنی لایعنی گفتگو سے تنگ نہ کرتے مگر اس وقت تدبر ایک نہایت دور رس خیال کی فضا میں گم ہوگیا۔

میں نے اچھل کر کہا۔ "مولانا۔ لیجئے۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آگئی ہے۔ جست کی چادریں لے کر انہیں پگھلا لیجئے۔ اور پھر ان کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر اُوپر معمولی کپڑے پہن لیجئے۔ فیصلہ ہوا۔ آپ کا وزن زیادہ ہو جائیگا۔ اور نسخہ کا اثر زائل۔"

پیشتر اس کے کہ میں اس بات کے نتائج پر غور کروں۔ مولانا میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔

اب وہ پھر اسی طرح مجلس ادبا میں آتے ہیں۔ اور اپنی بے مغز گفتگو سے میرا دماغ چاٹتے ہیں خدا انہیں غارت کرے۔ (ماخوذ)

عابد

افکارِ شامی

جانِ عزیز نذرِ تماشا کرے کوئی　　بندِ نقابِ رخ کو ذرا وا کرے کوئی

جب دِل میں تابِ جلوۂ طاقت رُبا نہ ہو　　کیوں تیرے دیکھنے کا ارادہ کرے کوئی

قیس جنوں پرست سے رونق تھی دشت میں　　اب کیا رہا جو رُخ سوئے صحرا کرے کوئی

سُنتے نہیں وہ اہلِ محبت کی سرگزشت　　کیا فایدہ جو عرضِ تمنّا کرے کوئی

یہ حسن دلفریب، یہ انداز، یہ ادا　　جی چاہتا ہے بس تجھے دیکھا کرے کوئی

روزِ ازل جو کاتبِ قدرت نے لِکھ دیا
پھر کس طرح نہ اس کو گوارا کرے کوئی

شامی

سر سیّد ایک ادیب کی حیثیّت میں

انیسویں صدی کے اخیر میں سر سیّد احمد خاں دہلوی نے اپنی شخصیت کا جو نقش ایک مصلحِ قوم کی حیثیت سے ہندوستان، خصوصاً اسلامی ہندوستان، پر ثبت کیا اُس کو دیکھتے ہوئے اس امر کا نظر انداز کر دینا بالکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک ادیب تھے۔ اور اس کے بعد کچھ اور۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن کے معاصرین میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اُردو پر اتنے احسان کئے ہوں جتنے اُنہوں نے کئے۔ اُن کا زمانہ نثرِ اُردو کی ترقی کا زمانہ تھا۔ اور اگر اس ترقّی کے اسباب تلاش کئے جائیں تو اُن میں سر سیّد کی تصانیف کو بہت بڑا درجہ حاصل ہوگا۔ جو کیا بلحاظِ کیفیت اور کیا بلحاظِ کمیّت اپنے وقت کی نثر میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہ اُن کا اُردو پر براہِ راست احسان تھا لیکن اسی پر بس نہیں۔ اُن کی بالواسطہ خدمات بھی شکریے کی مستحق ہیں۔ اُن کی ذات بعض ایسے علماءِ ادبا کی مرجع و مرکز تھی جنھوں نے نثر اور نظم دونوں شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ سر سیّد صرف ایک ادیب ہی نہ تھے، بلکہ ادیب گر بھی تھے۔ اور اُن کا نام ادبِ اُردو کی تاریخ میں ایک مستقل باب کا زیبِ عنوان ہے۔

سر سیّد کی کوشش یہ تھی کہ اُردو کی روشِ عام کا رُخ بدل دیا جائے۔ اور اس کوشش میں اُنہیں قابلِ قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ اُن سے پہلے کی تقریر و تحریر کا اُن کے وقت کی تحریر و تقریر سے مقابلہ کر کے دیکھئے زمین آسمان کا فرق ہے! ایک تکلفاتِ بارد سے پُر ہے۔ اور دوسری روزمرّہ کی سیدھی سادی زبان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو مختلف زبانیں ہیں جن کو ایک دوسری سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس اختلاف کو مٹانے کی کوشش سر سیّد سے پیشتر بھی ظہور میں آ چکی تھی۔ غالب کے خطوط کی زبان وہی زبان ہے۔ جو دلّی کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن غالب اپنے وقت کے فردِ یگانہ تھے۔ جنھوں نے ایسا طریق اختیار کیا۔ برخلاف اس کے سر سیّد کے زمانے میں اس طریق نے رواجِ عام پالیا۔ اور یہ زیادہ تر انہی کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھا۔

سر سیّد کی دلچسپ اور سبق آموز زندگی کے حالات یہاں بالتفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ دو نہایت قابلِ قدر سوانح عمریوں کے ذریعے شہرتِ عام

پا چکے ہیں۔ ایک سوانحعمری انگریزی میں ہے۔ اور اُس کے مُصنّف کرنیل گراہم ہیں۔ دوسری اُردو میں مولانا حالی کے قلم سے ہے۔ اور حیاتِ جاوید کے نام سے مشہور ہے۔ حالی نے کتاب کا جو نام رکھا ہے۔ اُس سے اُن کی وُہ عقیدت و ارادت ظاہر ہوتی ہے۔ جو انہیں اپنے دوست اور رفیقِ کار سے وابستہ کئے ہُوئے تھی۔ اور اس سے اس بات کا بھی کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسیّد کی شخصیّت کا اپنے گردوپیش کے اشخاص پر کتنا نفوذ اثر تھا۔ حالی کے تعلقات سرسیّد سے دوستانہ تھے۔ انہیں اُن سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ اس لئے جس شخص کو سرسیّد کی زندگی کے تمام و کمال حالات معلوم کرنے کا شوق ہو، وُہ اُن کی کتاب حیاتِ جاوید دیکھے، جو اُردو کی سوانحعمریوں میں بڑا رُتبہ رکھتی ہے۔

عدمِ گنجائش کے باعث ہم اسوقت صرف اس اجمالی تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں کہ سیّد احمد خاں ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دِلّی میں پیدا ہُوئے۔ آپ کا خاندانِ علم و فضل اور پابندیِ دین میں ضرب المثل ہے۔ آپ کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مشاہیر میں ہیں۔ آپ کو علومِ ریاضی میں پایۂ خاص حاصل تھا۔ چنانچہ آپ اکبر شاہ ثانی کے وزیر مالیات بھی رہے ہیں۔ اپنی وزارت کے دوران میں آپ نے مغلوں کی مالی حیثیت کی گرتی ہُوئی دیوار کو سنبھالنے کے لئے بہت کوششیں کیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے آپ کو جو کثیر مالی مطالبات لوگوں سے کرنے پڑے۔ اُنہوں نے آپ کے بہت مخالف پیدا کر دئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آپ کو آخرالامر اپنے عہدے سے دستبردار ہونا پڑا۔ سیّد احمد خاں کی والدہ آپ کی بڑی بیٹی تھیں۔ سلسلۂ آبائی میں سرسیّد ہرات کے ایک خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً شہنشاہ جہانگیر کے وقت میں آپ کے اجداد نے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے دادا سیّد ہادی عالمگیر ثانی کے عہدِ حکومت میں منصبِ جلیلہ پر سرفراز تھے۔ آپ کے والد میر متّقی نے اگرچہ دربارِ مغلیہ میں کوئی منصب قبول نہیں کیا، تاہم بڑا اثر اور رسوخ رکھتے تھے۔ تیراندازی اور تیراکی میں جو اُس زمانے کے دو نہایت قابلِ عزّت فن تصوّر کئے جاتے تھے دستگاہِ کامل بہم پُہنچائی تھی۔ دِلّی کے اُمرا و شاہزادگان میں آپ کے کثیر التعداد شاگرد تھے۔ اور سرسیّد نے بھی اپنے والد سے یہ فن بوجہِ احسن اکتساب کئے۔ سرسیّد کی ابتدائی تعلیم باقاعدہ نہ تھی۔ بلکہ رائج الوقت معیار پر بھی پُوری نہ اُترتی تھی۔ تاہم والد کے فیضِ صحبت سے کافی وسعتِ معلومات پیدا کر لی تھی۔ اوّل اوّل ایک معلّمہ سے درسِ قرآن کی تکمیل کی۔ اسکے بعد مولوی حمیدالدین سے

فارسی کی چند ابتدائی کتب پڑھیں۔ عربی میں بھی کچھ عرصہ سبق لیتے رہے۔ لیکن طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ اس لئے نہ چل سکے۔ ان کے ایک ماموں تھے جنہوں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین سے ریاضی کا مذاق ورثہ میں پایا تھا اُن سے ریاضی کی کچھ شُد بُد حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ فلکیات کے مبادی بھی اکتساب کر لئے۔ حکیم غلام حیدر خاں اپنے وقت کے مسیحائے زماں تھے۔ اُن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور طب یونانی سے خاطرخواہ واقفیت بہم پہنچالی۔ اُنیس بیس کے سن میں ان علوم کی تحصیل سے فارغ ہو لئے۔ لیکن زمانۂ طالبعلمی یہیں پہنچکر ختم نہیں ہوگیا۔ اخیر عمر تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھا کئے اور اپنی معلومات کے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہے۔ جوانی میں اتفاق حسنہ نے غالب، آزردہ، اور صہبائی جیسے مشہور اساتذہ سے متعارف کرادیا، ادب کا وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم پہلے ہی طبیعت میں موجود تھا۔ ان کے فیضان صحبت نے سونے پر سہاگے کا اثر کیا۔ مندرجہ بالا حالات کے ماتحت اوائل عمر ہی میں علم و ادب کے متفرق شعبوں میں جو استعداد پیدا کر لی تھی، وہ آگے چل کر

۱۸۳۸ء میں ملازمت سرکاری اختیار کی، اور دلّی میں صدر امین کی عدالت کے ریڈر مقرر ہوئے ۱۸۳۹ء میں کمشنر کے نائب منشی ہو کر آگرے گئے، اور دو سال نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ منصفی کا عہدہ حاصل کر لیا۔ اسی حیثیت سے مختلف مقامات پر تبدیل ہو کر گئے۔ اور آخرالامر ۱۸۴۶ء میں دلی آنا ہوا۔ وہاں از سرنو باقاعدہ طور پر مطالعہ جاری کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اس موقعہ سے فایدہ اُٹھا کر اُنھوں نے عربی میں اعلیٰ درجہ کی قابلیت پیدا کر لی۔ اور اس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر کے کام کے لئے اور اسلام پر معترضین و مخالفین نے جو حملے کئے ہیں، اُن کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔

خوش قسمتی سے سرسیّد پر بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو گئی، کہ فطرت نے آپ کو تحریر و تقریر کے لئے نہایت موزوں طبیعت عطا کی تھی۔ اس پر صحت بھی اللہ نے وہ عنایت کی تھی، جو شب و روز کی محنتِ شاقہ کا بار اُٹھا سکتی تھی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں جب آپ کمشنری کے دفتر میں ایک معمولی حیثیت کے ملازم تھے۔ آپ نے اپنی پہلی ادبی کوشش دُنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ جام جم کے نام سے ایک فہرست تھی جس میں تیمور سے لے کر بہادر شاہ کے وقت تک جتنے مغل خاندان ہوئے ہیں اُن کا حال سلسلہ وار مندرج تھا۔ اسی پہلی کوشش سے ظاہر ہوگیا۔ کہ تاریخ سے آپ کو کسقدر واقفیت تھی اور علمی تحقیق و تدقیق کی آپ میں کس درجہ قابلیت تھی۔

اس کے بعد آپ نے ایک مختلف قسم کی چیز پیش کی۔ جو قانون سے متعلق تھی۔ یعنی منصفوں کے استفادہ کے لئے ضابطۂ دیوانی کا خلاصہ کیا۔ یہ کتاب اُردو میں تھی اور سرکار نے اس کی اس درجہ قدردانی کی کہ اس کے مؤلف کو منصفی کا امیدوار انتخاب کر لیا۔ اب صغر سنی کی مذہبی تعلیم بر روئے کار آئی۔ اور آپ نے رسولِ اکرم صلعم کی ولادت و وصال کا حال ایک مختصر رسالے کی صورت میں تحریر کیا اور اس کا نام جلاء القلوب رکھا۔ اپنے ہر فنی ہونیکا مزید ثبوت آپ نے فنون میکانی کے متعلق انگریزی کی ایک کتاب کا ترجمہ کر کے دیا۔

قیام دِلّی کے دوران میں ایک اور کام جو آپ نے انجام دیا، یہ تھا کہ آپ نے اخبار نویسی کی ابتدائی مشق سیّد الاخبار کے مضمون نگار کی حیثیت سے کی جو دلّی سے آپ کے بڑے بھائی کے زیر ادارت نکلتا تھا۔ مذکورہ بالا تالیفات آپ کے دورِ ادبی کے آغاز کے کارنامے ہیں۔ آپ کی سب سے پہلی مستقل تالیف آثار الصنادید ان سے کچھ عرصہ بعد کی چیز ہے آثار الصنادید پرانی دلّی اور اُس کے مضافات کے آثار قدیمہ کا تذکرہ ہے۔ آپ مدت سے اوقات فرصت میں اس کیلئے مواد جمع کرنے میں مصروف تھے۔ چنانچہ جب یہ تاریخی کارنامہ پیش کیا گیا تو پرانی عمارتوں کے نقشوں اور خاکوں اور اُن کے کتبوں کی عکسی تصویروں سے بعنوانِ احسن مزیّن تھا۔ جس تفحص اور تجسّس سے اُنھوں نے یہ تمام لوازم فراہم کئے تھے۔ اُس کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہو سکتا ہے۔ جس میں آپ وہ طریقہ بیان کرتے ہیں جو آپ نے قطب مینار کے بلند ترین کتبوں کو پڑھنے کے لئے اختیار کیا تھا۔

> "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور مَیں خود اُوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا جس وقت مَیں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے۔ اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیّر ہو جاتا تھا۔"

تالیف مذکور ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کے شائع ہوتے ہی سرسیّد کا نام علمی حلقوں میں عزّت سے لیا جانے لگا۔ سرسیّد کا ایک انگریز دوست مسٹر رابرٹس اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ انگلستان لیگیا اور اُسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کے سامنے

پیش کیا۔ جو یورپ کی علمی انجمنوں میں بہت بڑا پایہ رکھتی ہے مذکور سوسائٹی نے اس کارگزاری کی بہت داد دی۔ چنانچہ اس کے حسب ایماء اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا۔

۱۸۵۴ء میں سرسید نے آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن طبع کیا۔ اس ایڈیشن میں انہوں نے متعدد نئے اور ترمیم شدہ نقشے اضافہ کئے تھے اسکے بہت سے نسخے غدر کے ایام میں ضائع ہوگئے چند نسخے جو بعد ہٗ تلاش و تجسس سے ہاتھ آئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کے کتابخانے میں محفوظ ہیں۔ نئے نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ایک اور اضافہ طبع دوم میں کیا گیا تھا۔ یعنی عبارت پر بھی نظر ثانی کی گئی تھی۔ بہرحال اس کتاب کا انداز تحریر طرز قدیم کے مطابق تکلف و تصنع سے مملو ہے۔ اور بعد کی صفائی و بستہ انداز سے ٹکر نہیں کھاتا۔

سرسید کی دیگر تصنیفات و تالیفات سے بحث کرنے سے پیشتر اس موقع پر برسبیل تذکرہ یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے آثار الصنادید کا ترجمہ فرانسیسی میں کر کے ۱۸۶۱ء میں شائع کیا۔ اور اس کا ایک نسخہ مؤلف کے پاس بھی بھیجا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن نے اس امر کی اطلاع پاکر ۱۸۶۴ء میں سرسید کو اپنی انجمن کا ایک رکن اعزازی منتخب کر لیا۔ بعدہٗ جب ایڈنبرا یونیورسٹی نے سرسید کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی تو اس موقع پر خطبات احمدیہ کے پہلو بہ پہلو آثار الصنادید کا بھی تذکرہ اُن کارناموں کی ذیل میں کیا گیا۔ جو انہیں اس امتیاز کا مستحق ثابت کرتے تھے۔

دلی میں آٹھ سال تک منصف کے عہدے پر قائم رہنے کے بعد سرسید بجنور میں صدر امین کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ قیام بجنور کے ایام میں آپ نے بجنور کی ایک تاریخ تالیف کی۔ اس کے علاوہ آئین اکبری کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھاپنے کا ارادہ کیا۔ تجویز یہ تھی کہ تین جلدوں میں کتاب مکمل ہو۔ پہلی جلد جس کے شروع میں مؤلف نے اپنی طرف سے ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ شامل کیا تھا۔ اور دوسری جلد دونوں چھپ گئیں تیسری جلد مشرح اور مصور ہنوز طبع ہی تھی کہ غدر کا فتنہ برپا ہوگیا اور یہ گنجینۂ معانی تلف ہوگیا۔

اختتام غدر پر سرسید بجنور سے صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہوکر مراد آباد تبدیل کئے گئے۔ وہاں آپ نے تاریخ سرکشیٔ بجنور لکھی جو بجنور کے ایام غدر کے حالات پر مشتمل تھی۔ یہ محض ایک مقامی دلچسپی کی کتاب تھی۔ لیکن اس سے زیادہ قابلقدر اور اس سے زیادہ عام شامل دلچسپی کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" تھی۔ جو باوجود اختصار مسائل وقت کے متعلق نہایت مفید اور

اہم معلومات سے پُر تھی۔ غدر کے دن پورے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا، اور ایسے وقت میں ایک ہندوستانی کے لئے ایسی کھلی کھلی باتیں کہنا جیسی سرسید نے کتاب مذکور میں بیان کی ہیں۔ غیر معمولی جرأت کا کام تھا۔ اُن کو اس امر کا احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کتاب کے صرف پانسو نسخے چھپوائے اور وہ بھی ہندوستان میں شائع نہیں کئے۔ اس خیال سے کہ مبادا کہیں شورش و فساد، یا غلط فہمی کا باعث ہوں۔ فقط ایک نسخہ اپنے پاس رکھا۔ ایک نسخہ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجا۔ باقی سب پارسل کر کے انگلستان بھیج دیئے۔ تاکہ وہاں جن لوگوں کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو، اُن میں تقسیم کر دیتے جائیں۔ وائسرائے کی مجلس میں یہ کتاب ایک معرکۂ بحث و تمحیص کا باعث ہوئی۔ لارڈ کیننگ، اور سر بارتھ فریئر نے اس کے حق میں یہ رائے ظاہر کی کہ یہ سرکار کو اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دینے کی نیت سے لکھی گئی ہے۔ مسٹر سیسل بیڈن نے اُن کی رائے کے برعکس اسے ایک باغیانہ تحریر قرار دیا۔ ۱۸۷۳ء میں کرنیل گراہم کے قلم سے اس کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا۔ مذکورۂ بالا دو نسخوں کے سوا اس کا کوئی اصلی نسخہ ہندوستان میں دستیاب نہیں ہو سکتا، البتہ حالی مرحوم نے ضمیمہ کے طور پر اسے حیاتِ جاوید میں شامل کیا ہے

اور ملک فضل الدین تاجر کتب لاہور نے اسے ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی چھاپا ہے۔

"اسبابِ بغاوتِ ہند" صرف تاریخی نقطۂ نگاہ سے اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ ادبی لحاظ سے بھی وقعت کے قابل ہے۔ یہ بیشک سچ ہے کہ اس کے اندازِ تحریر میں وہ نفاست اور لطافت نہیں۔ جو بعد میں سرسید اور اُن کے معاصرین کے اندازِ تحریر کی خصوصیات میں داخل ہو گئی تھی۔ بلکہ جا بجا قدما کے متروک طرز کے نمونے نظر آتے ہیں۔ جو عربی کے لفظی ترجموں سے مشابہ ہیں:۔ مثلاً

"واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں واجبات سے ہے۔"

یا

بادشاہانِ ملک غیر بھی کمال اعتبار رکھتے تھے ہماری گورنمنٹ پر

یا

مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے

تاہم اس قسم کی عبارتیں خال خال ہیں۔ اور کتاب کا بیشتر حصہ اُس سلیس اور رواں انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس کو پڑھنے سے طبیعت پر بوجھ نہیں پڑتا۔

ایک اور خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے مصنّف نے جن خیالات و آراء کا ضمناً اظہار کیا ہے اُن کا اطلاق آجکل کے حالات و واقعات پر بھی بدرجہ کامل ہوتا ہے اور اس اعتبار سے کتاب کی قدر و قیمت آج بھی وہی ہے جو اوّلین اشاعت کے موقعہ پر تھی۔ پھر جس حق گوئی اور صاف بیانی سے امور واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ مصنّف کی سیرت کا ایک نہایت مستند اظہار ہے۔

اسباب بغاوت ہند سے فارغ ہوکر آپ نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح اور نظر ثانی کی۔

۴۴ سال کی عمر میں سرسیّد کو اپنی رفیق زندگی کی وفات سے شدید صدمہ پہنچا۔ مرحومہ تین بچّے اپنی یادگار چھوڑ گئیں۔ جن میں سے ایک مسٹر جسٹس محمود تھے۔ احباب نے سرسیّد کو ازدواج ثانی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے باقیماندہ زندگی کو مُلک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ اس لئے تجرّد کی زندگی کو ترجیح دی۔

جن تصنیفات و تالیفات کا ذکر اُوپر آیا ہے۔ اُنہیں آپکی ادبی سرگرمیوں کا ثمر پیش رس کہنا چاہئے۔ آپ کی ادبی زندگی کی بہارِ شباب حقیقت میں ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتی ہے جب بیوی کی وفات کے صدمے نے آپ کے دل کو جو درد قوم سے پہلے ہی آشنا تھا۔ قومی خدمت کے ایک جذبۂ بیقرار سے لبریز کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کا شوق جو عشق کے درجے تک پہنچا ہُوا تھا۔ اُن کی آئندہ زندگی کے ہر قول و فعل کا محرک ہے۔

سرسید احمد کا نام اُن لوگوں کی ذیل میں ہمیشہ سرفہرست ہوگا جنہوں نے اُردو نثر کو ایک نئے قالب میں ڈھالکر سنجیدہ علمی مطالب کے اظہار کا ذریعہ بنایا اس کام کے لئے اُن کا سائنٹفک مزاج کا آدمی سب سے زیادہ موزوں و مناسب تھا۔ مقام تعجب ہے کہ ایک شخص جس نے اپنی جوانی کے دن دلّی کے جلسوں اور محفلوں میں گزارے ہوں۔ جہاں دن رات شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ بالخصوص وہ شخص جسے غالب جیسے رنگین مزاج شاعر کی صحبتیں نصیب ہُوئی ہوں۔ شاعری کے مذاق سے عاری رہے!

سرسیّد سخن فہم تھے اور اچھا شعر سُنکر داد دیتے تھے لیکن اُن کی سلیم و متین فطرت مشغلۂ شعر و سخن کو اپنی زندگی کا واحد مشغلہ بنانا قبول نہ کرتی تھی۔ ممکن ہے اوائل شباب میں کبھی کبھی طبع آزمائی کرکے رسم ادا کر لیتے ہوں۔ لیکن آخر عمر میں اس طرف سے ایسی توجہ ہٹائی کہ پھر کبھی ملتفت نہ ہوئے۔ اس بے توجہی اور بے التفاتی کی انتہا یہ تھی کہ اپنی تحریر و تقریر میں بھی شعر کو شاذ و نادر

دخل دیتے تھے۔ حالانکہ اُس وقت کے مذاق کے مطابق
جس نثر کا جزوِ غالب اشعار نہ ہوں وہ نثر ادبیت سے
معرّا ہوتی تھی۔

انشا پردازوں کی جو کثیر جماعت سرسیّد کے
اثرِ تربیت سے مستفیض ہوئی اُس میں مولوی نذیر احمد
مولوی حالی۔ مولوی شبلی۔ منشی ذکاء اللہ اور نواب محسن الملک
کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور یوں تو سرسیّد
کے شاگردانِ معنوی کے نام گنانا تحصیلِ حاصل ہے
کیونکہ یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ متاخرینِ ادب
میں اکثر بن کی جماعت ایسے لوگوں کی ہے، جو اسی
مدرسے کے ابجد خوانوں میں ہیں۔

مذکورۃ الصدر اعاظم مصنّفین میں فقط مولانا حالی
کا پلّہ نثر اور نظم دونوں میں یکساں ہے۔ اُن کی شاعری
کی رُوح و رواں وہی قومی سوز و گداز ہے جو سرسیّد کی
نثر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور اس میں مطلق کلام
نہیں کہ حالی جن خیالات و افکار کا اپنے اشعار میں
اظہار کرتے ہیں اُن کا منبع و مخرج، براہِ راست یا
بالواسطہ سرسیّد ہیں۔ مدوجزرِ اسلام جو حالی کی
مشہور ترین نظم ہے۔ وہ بھی اُنہی کے اثرِ تربیت کا نتیجہ
ہے۔ خود مصنّف نے دیباچہ میں بالفاظ ذیل اس امر کی
طرف اشارہ کیا ہے :۔

"چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا۔ کہ ایک قدم
آگے پڑتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ
ایک خدا کا بندہ جو اس میدان (یعنی میدانِ عمل)
کا فرد ہے ایک دشوار گزار راستے میں رہ نورد
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی چتونوں میں غضب کا
جادو بھرا ہے۔ کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے
وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے
اُس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام
کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ
اُسی دشوار گزار راستے پر پڑ لئے۔ نہ یہ خبر ہے کہ
کہاں جاتے ہیں۔ نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے
ہیں نہ طلبِ صادق ہے نہ قدم راسخ ہے نہ عزم
ہے نہ استقلال ہے نہ صدق ہے نہ اخلاص
ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لئے
چلا جاتا ہے۔"

اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ سرسیّد کی شخصیت اپنے
معاصرین کے لئے کیا معنی رکھتی تھی۔ اور اس کے بعد اس امر
میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ کہ اُس وقت کے
خیالات و افکار اور جذبات و احساسات کس حد تک ان
کی ذات سے تاثر پذیر تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے
تھا کہ ادبیات عصر بھی بالارادہ یا بلا ارادہ اُن سے متاثر ہوں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حالی کے علاوہ ایسے ادیبوں کی لاتعداد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ جن کی تحریریں سرسید کی صریر قلم کی صدائے بازگشت ہیں۔

ایک طرف تو سرسید کے ہمہ گیر اثر کا یہ حال ہے لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید خود ایک زبردست مؤثر کے مرہون منت ہیں۔ یعنی مغربی تہذیب کے۔ یہ امر کسی قدر تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ سرسید انگریزی زبان سے بہت کم واقف تھے۔ اور جو کچھ علم اس کا انہوں نے حاصل کیا تھا وہ بھی کہیں جاکر اخیر عمر میں۔ لیکن اپنے ذوق تحقیق کی بدولت انہوں نے انگریزی زبان پر اس قدر کم دسترس رکھنے کے باوجود انگریزی علوم سے بقدر ضرورت استفادہ کیا اور مغربی ماخذوں سے معلومات کا وافر ذخیرہ بہم پہنچایا۔ حتےٰ کہ اُن کی تحریریں اکثر مغربی خیالات کی حامل ہوتی ہیں۔ اور اسی پر منحصر نہیں اسلوب بیان میں بھی انگریزی کا اثر نمایاں ہے۔ انگریزی کے الفاظ جا بجا بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں۔ اور اکثر جملوں کی ترکیب ایسی ہوتی ہے۔ جس کی مثال اُردو میں پہلے موجود نہ تھی۔ لیکن اب اُردو کا جزو غالب ہوگئی ہے۔ یوں کہئے کہ سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہماری زبان جدید مطالب و مباحث کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور غیر زبانوں سے اخذ و اکتساب کر سکتی ہے۔ آج اُردو کی جو روش ہے اس کی داغ بیل انہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ اور جو شاندار مستقبل اُس کو اپنے سامنے نظر آرہا ہے۔ اُس کو سب سے پہلے انہی نے بے نقاب کیا۔

سرسید کی تعلیم و تربیت اگرچہ مشرقیت کی فضا میں ہوئی۔ لیکن جب نئے نئے حالات رونما ہوئے، اور اُن کے گرد و پیش ایک نیا ماحول پیدا ہوگیا۔ تو انہوں نے اُس قدامت پرستی کو جو مشرقیوں کی گھٹی میں پڑی ہے۔ بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو ان حالات اور اس ماحول کے مطابق بنا کر کمال وسیع المشربی اور زمانہ شناسی کا ثبوت دیا۔ زمانے کا رنگ بدلتا دیکھ کر خود بھی بدل گئے لیکن اسقدر نہیں کہ اپنی اصلیت سے دور ہو جائیں اور اپنے آپ سے اسقدر مختلف ہو جائیں کہ خود کو پہچان نہ سکیں یہ اسی قدامت پسندی اور آزاد خیالی کے طرفہ اجتماع کا نتیجہ تھا۔ کہ آپ نے مشرقیت و مغربیت کو اس طرح یکجا کیا کہ دونوں کا باہمی تضاد مٹا دیا۔ ان سے زیادہ علوم مغربی کے جاننے والے اور جدید تعلیمیافتہ سینکڑوں موجود تھے۔ لیکن اُن میں سے کوئی ایسا نہ اُٹھا کہ اپنی قوم کے تاریک خیال اور کورانہ تقلید کے دلدادہ لوگوں کو ضروریات وقت سے واقف کرتا۔ اور اُن کو ہوا کا رُخ بتاتا۔ یہ فخر ایک پامال اور فرسودہ روشوں کے چلنے والے ہی کو حاصل ہونا تھا۔ کہ اپنی قوم کے سامنے نئی راہیں

کھول دے اور اُسے ایک نئی منزلِ مقصود کا پتہ دے۔

اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے سرسیّد کو جو بہترین وسیلہ دستیاب ہوسکتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مغربی کتابوں کے تراجم کے ذریعے لوگوں میں جدید خیالات کی اشاعت کریں۔ اور یہ وسیلہ اُن کے انگریزی داں احباب نے بہم پہنچا دیا۔ اُن لوگوں سے آپ نے اس طور پر مدد لی کہ اُن سے انگریزی کتابوں کے ترجمے پڑھوا کر سُنتے جاتے تھے اور اُن کے مطالب کو ذہن نشین کرتے جاتے تھے۔ حتّٰی کہ تھوڑے عرصے میں انگریزی زبان سے کماحقہٗ واقف ہونے کے بغیر آپ نے انگریزی طرزِ خیال اور انگریزی طرزِ اظہار کو اپنا بنا لیا۔ یہ اسی کی بدولت ہے کہ اُن کی تحریریں ایک مجمع البحرین ہیں۔ جس میں مشرقی و مغربی خیالات کی مخالف روئیں ایک دوسرے کے دوش بدوش بہتی نظر آتی ہیں۔

ذاتی کوششوں کے علاوہ سرسید نے اپنے احباب کو بھی ترجمے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ ان کے اصرار پر کئی مفید کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔

سرسیّد کے مضامین وقتاً فوقتاً علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپتے رہتے تھے۔ جس کے مدیر اعزازی کی خدمات بھی آپ کے سپرد تھیں۔ یہ رسالہ اپنے وقت میں شمالی ہند میں مسلمانوں کے مبادلۂ خیالات کا واحد وسیلہ تھا۔ اور اُس نے جہاں وقتی موضوعات پر مسلمانوں کے خیالات و آرا کی صحیح صحیح ترجمانی کی۔ وہاں ایک اس سے زیادہ قابلِ فخر اور اس سے زیادہ نمایاں خدمت بھی انجام دی، یعنی اُردو کے سرمایے میں معتد بہ اضافہ کیا۔ سرسیّد نے جو مضامین اس رسالے میں شائع کئے۔ اگر ان کا مجموعہ چھاپا جائے تو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ اور اس میں اکثر حصّہ ایسی چیزوں کا ہوگا جو صرف ہنگامی دلچسپی کی چیزیں نہیں بلکہ ایک مستقل قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ حالیؔ نے حیاتِ جاوید میں اس رسالے کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اگر اس کے آخری دور کو جب اس میں پہلے سے زور و شور کی بجائے صرف رمقِ حیات باقی تھی۔ نظر انداز کر دیا جائے، تو یہ فی الحقیقت اس تعریف کا بلکہ اس سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے۔

۱۸۶۹ء میں سرسیّد نے انگلستان کا سفر کیا اور ایک سال تک وہاں مقیم رہے۔ اس قلیل مدت میں اُنھوں نے بہت سے مفید کام انجام دیئے۔ لیکن ہمیں اُن سب سے بحث نہیں۔ صرف ایک کام کو اس مضمون سے تعلق ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح سے کہیں زیادہ سرسیّد کی زندگی کا یہ نصب العین تھا کہ وہ ان بیجا حملوں کا مسکت اور قطعی جواب دیں، جو اسلام کے مغربی مخالفین نے اس پر کئے تھے۔ چنانچہ یہ نصب العین زندگی بھر اُن کے پیش نظر رہا۔ بلکہ اُن کی زندگی کا بیشتر حصّہ اسی کے حصول

کی سعی و کوشش میں صرف ہوا۔ ہمیشہ تحریر و تقریر کے ذریعے اسلام کی حقیقت کو عقلی دلائل سے بیان کرتے رہتے تھے اور دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کی بے سروپائی کو ثابت کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ گھر بیٹھ کر معترضین کا جواب دینے کے مرادف تھا۔ جب انگلستان گئے تو محسوس کیا کہ اپنے خیالات کو یورپ کے لوگوں تک پہنچانے کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے خطباتِ احمدیہ کا انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا۔ یہ کتاب پیغمبرِ اسلام کی مختصر سیرت ہے۔ جس میں آنحضرت صلعم کی تعلیم پر عقلی طور سے بحث کی گئی ہے۔ اور ضمناً معترضینِ یورپ کے اعتراضات کی حقیقت کا پول کھولا گیا ہے۔ ہندوستان واپس آکر خطبات کا ایک ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد چھاپا۔ علاوہ بریں اپنے سفر کے حالات جو اثنائے سفر میں لکھتے رہتے تھے علیگڑھ انسٹیٹیوٹ میں بالاقساط چھاپے۔ اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو نہایت دلچسپ کتاب ہوگی۔

سفرِ انگلستان کے بعد آپ کی زندگی کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ تہذیب الاخلاق کا اجرا ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ تھوڑا ہی عرصہ زندہ رہا یعنی ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک لیکن اس مختصر عمر میں اسلامی ہندوستان کی ادبی، مذہبی اور معاشرتی فضا میں ایک انقلاب برپا کر گیا۔ اور جو نقوش اس نے اس سات سال کی مدت میں اردو ادب پر اور اسلامی معاشرت پر ثبت کئے وہ اب تک باقی ہیں۔ اور جب تک ان دونوں کا وجود ہے باقی رہینگے۔ سرسید کے ادبی شاہکار اسی رسالے کی وساطت سے دُنیا کے سامنے پیش کئے گئے۔ تہذیب الاخلاق کا ایک انتخاب ملک فضل الدین، لاہور نے دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ دوسری جلد تمامتر سرسیّد کے مضامین سے مرتّب کی گئی ہے۔ اور اگرچہ اس میں ایسے مضامین کی تعداد کم نہیں جو آج اپنی تازگی کھو بیٹھنے کے باعث دلچسپی سے عاری ہوگئے ہیں یا جنکے متعلق آج جمہور کی رائے مصنّف کی رائے کے مخالف ہے۔ اور ایسے مضامین بھی بہت ہیں، جو خالص مذہبی یا خالص علمی و اصطلاحی ہونے کی وجہ سے عوام کے کام کی چیز نہیں ہیں۔ تاہم ان سے صرفِ نظر کر کے ایک قابلِ قدر تعداد ایسے مضامین کی رہ جاتی ہے۔ جن کو پڑھنا فائدے اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ سرسیّد کی بہترین نثر انہی مضامین میں ملے گی۔ مثال کے طور پر ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے "امید کی خوشی" ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جب زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دُنیا دی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی رنگ فق ہو جاتا ہے۔ مُنہ پر مُردنی چھا جاتی ہے

ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں، ملنے کو ہوتی
ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان
ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اُس زرد چہرے، اور
آہستہ آہستہ ملتے ہُوئے ہونٹوں اور بے خیال
بند ہوتی ہُوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں
ڈوبتے ہُوئے دل کو تیری یاد ہوتی ہے تیرا نورانی
چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے۔
اور ایک نئی رُوح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے
اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ
رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے۔..... یہ
تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے
موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے، اُس
لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دُنیاوی رنجوں
اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے۔ اور غم کی شام
کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے۔"

یا ایک اور مضمون سے جس کا عنوان "گزرا ہُوا زمانہ" ہے:۔[۵۱]

"برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے
گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری
ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی
ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ بادل کانپتا
ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے
مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے۔ نہ اکیلے پن
پر، اور نہ اندھیری رات، اور بجلی کی کڑک اور
آندھی کی گونج پر۔ اور نہ برس کی اخیر رات پر۔
وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اور وہ
جتنا زیادہ یاد آتا ہے اُتنا ہی غم بڑھتا ہے۔
ہاتھوں سے ڈھکے ہُوئے مُنہ پر آنسو بہے چلے
جاتے ہیں۔"

اس نثر میں نظم کی طرح ایک ایک لفظ نگینہ ہے۔[۵۲]
جو جہاں جڑ دیا گیا ہے وہیں سب سے زیادہ موزوں ہے۔ یا یوں کہئے
کہ یہ ایک تصویر کی طرح ہے جس کا خفیف سے خفیف لمس
بھی ایک معنی رکھتا ہے۔

تاہم واضح رہے کہ اس عبارت میں تکلّف کو مطلق دخل نہیں لفظی تصنّع[۵۳]
اور عبارت آرائی سرسیّد کے اندازِ تحریر کی خصوصیات میں نہیں۔ اگر کوئی
محاسنِ ظاہری اُنکی تحریریں ہوتے ہیں تو یہ آورد نہیں ہوتی بلکہ آمد چنانچہ
ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو جس میں وہ عبارت آرائی کو مذموم قرار دیتے ہیں تاہم
غیر محسوس طور پر خود اُنکی عبارت محاسنِ گوناگوں کا مجموعہ ہو گئی ہے:۔

اسی طرح معانی جلیل خواہ کیسی ذلیل عبارت میں ہوں وہ عبارت
کی لطافت کے خالی ہونے سے اپنی شرافت کے مرتبے سے نہیں گرینگے
جو عبارتیں کہ رنگین الفاظ سے پُر اور خیال و معانی سے خالی ہوتی
ہیں۔ ان کا حال ایسے درختوں کا سا ہوتا ہے کہ جن میں پتّے
اور شاخیں بہت ہوں اور پھل تھوڑے ہوں۔ مگر بعض صاحبِ عقل
ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ انہیں درختوں کو جن میں پتّوں پر پتّے
اور شاخوں پر شاخیں ہوں۔ اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان کے

[۵۱] و [۵۲] و [۵۳] یہ چند سطور میں نے اپنی طرف سے اضافہ کی ہیں۔

نیچے ٹھنڈے سائے میں نیند بھر کے سوئیں اور خواب ہائے شیریں دیکھیں گو کبھی اس خوابِ غفلت میں مُنہ کھل جاتے اور قدر شناسی سے عالمِ بالا سے بند ہو جاتے تو بلا سے غرض وہ ورقِ معانی کے نسخے کا ایک حرف نہیں پڑھتے اور یک قلم الفاظ ہی کے نشے میں مست اور مخمور رہتے ہیں مجاز کی پابندی حقیقت پر نہیں جانے دیتی۔

مقامِ مسرت ہے کہ سرسیّد کے خطبات و مواعظ کا ایک مجموعہ بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔ جسے مولوی امام الدین صاحب نے شائع کیا ہے۔ ہمیں ان دونوں اصحاب کا بیحد ممنون ہونا چاہئے کیونکہ یہ مجموعہ ایک ایسا گنجینۂ معانی ہے جس سے ہم اسی طرح منفعت اندوز ہو سکتے ہیں جس طرح ہم سے چالیس پچاس سال پہلے کے لوگ ہوئے ہونگے۔

سرسیّد کی ایک اور تالیف ہے جو نامکمل ہونے کے باوجود بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم چونکہ وہ خالص ادب کی ذیل سے خارج ہے اس لئے ہم اُس کی طرف اشارہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ ہماری مراد تفسیر قرآن سے ہے۔ جس کی تکمیل کی موت نے اجازت نہ دی۔ جہانتک لکھ سکے تھے، وہیں تک اپنی زندگی میں چھاپ دی تھی۔ حال میں دوبارہ چھاپی گئی ہے۔ اور چھ جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔

اس تفسیر کے متعلق اربابِ تنقید کی رائیں بہت مختلف و متبائن ہیں۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ اس پر کفر کا فتوے لگاتا ہے۔ اور اسے مضرِ اسلام کتابوں کی ذیل میں شمار کرتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل کا فرقہ، جس کے افراد جدید تعلیمیافتہ ہیں۔ اسے اپنے لئے مشعلِ ہدایت سمجھتا ہے۔ اور اسکے مُصنّف کو مخیرِ نوع اور محسنِ قوم کہہ کر یاد کرتا ہے حقیقت میں سرسیّد کا مدعا یہ تھا۔ کہ مادیّت اور لامذہبیّت کے اُس سیلابِ عظیم کی پیش بندی کی جائے۔ جو تعلیمِ دینی کے وہ اُستوار بند ٹوٹ جانے کے بعد جنہیں رواج نے مدتہائے مدید سے قائم کر رکھا تھا۔ زور و شور سے جدید تہذیب کے عقب میں چلا آرہا تھا۔ واقعات شاہد ہیں کہ وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب کو عقل سے منطبق کرنے کی کوشش میں وہ اکثر دور از کار اور بعید از فہم دلائل پیش کر جاتے تھے۔ اور منطقی مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ تاہم دوسری طرف اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ آیندہ نسلیں اُنہیں آزاد خیالی اور وسیع المشربی کا علمبردار کہکر یاد کیا کرینگی۔ اور اس کوشش کی داد دیں گی جو اُنہوں نے قرآن مجید کی ترجمانی میں صرف کی۔

عدمِ گنجائش کی وجہ سے میں سرسیّد کے کئی مختصر

رسالوں اور پریشان مضامین کا ذکر نہیں کر سکا۔ جنہیں اُن کی تالیفات و تصنیفات سے کامل واقفیت حاصل کرنے کی خواہش ہو، وہ حیاتِ جاوید کو ایک مفید مطلب کتاب پائیں گے۔

سر سیّد کا میدانِ عمل جیسا کہ میں اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ اگرچہ صرف خدمتِ ادب تک محدود نہ تھا لیکن اگر اس محدود دائرے ہی میں اُن کے کارہائے نمایاں دیکھے جائیں تو یہی اُن کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں

خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ وہ اُن قابلِ احترام بزرگوں میں ایک بزرگ تھے۔ اور اُن مایۂ ناز ہستیوں میں ایک ہستی، جن کی نظیر چشمِ زمانہ مُدتوں کے انتظار کے بعد دیکھتی ہے۔

جب اُن کی وفات کی خبر عام ہوئی تو ہندوستان کا گوشہ گوشہ ماتمکدہ بن گیا۔ تمام اہلِ ملک نے خصوصاً مسلمانوں نے، محسوس کیا کہ آج اُنکو ایک ایسا نقصان عظیم پہنچا تھا جس کی تلافی ایک مُدت تک محال تھی۔ اُنکے بیشمار مدّاحوں نے ہزار ہا مرثیے لکھے اور جا بجا ماتمی جلسے کئے گئے۔ جن میں انبوہائے کثیر نے متفق اللسان ہو کر اظہار افسوس کیا۔ آج سر سیّد کی وفات کو ایک ربعہ صدی گزر چکی ہے۔ لیکن ہنوز اُن کا نام زبانوں پر ہے۔ اور جب تک اُردو اور اسلام کو دُنیا میں بقا ہے اُن کی شخصیت زندہ رہے گی۔

وہ جس کا دل مُدت العمر سوز و گداز قوم سے جلا کیا۔ اُس کا جسدِ خاکی ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کی مسجد کے وسیع صحن کے ایک گوشے میں مدفون ہے اور اُس کا نشانِ مزار اُن لوگوں کو جنہوں نے اُس کی قدر زندگی میں نہ پہچانی زبان خاموشی سے یہ پیغام دے رہا ہے:۔ زمن بہ جرمِ طپیدن کنارہ می کردی

بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

(ماخوذ از مضمون انگریزی مرتوبہ شیخ عبد القادر سابق اڈیٹر مخزن)

"ہ"

نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف

"مینجر"

ماتمِ عیش

نہ اب وہ زمانِ طرب زائے عیش — نہ اب وہ جہانِ تماشائے عیش

نہ اب وہ بہار گل وُمل سے ربط — نہ اب وہ دلِ مستِ صہبائے عیش
نہ اب وہ شکارِ بطِ مے کا خبط — نہ اب وہ سرِ صرف سودائے عیش

نہ اب وہ ضیا باریِ انبساط — نہ اب وہ فروغِ تجلّائے عیش
نہ اب وہ تماشائے کیف نشاط — نہ اب وہ بہارِ دل آرائے عیش

نہ وہ دورِ ہیجانِ شوقِ طرب — نہ وہ شوقِ امید افزائے عیش
نہ وہ عہدِ ارمانِ ذوقِ طرب — نہ وہ ذوقِ آمادہ فرمائے عیش

نہ وہ عالمِ جلوہ زارِ خوشی — نہ وہ جلوۂ عیش بالائے عیش
نہ وُہ موسمِ نوبہارِ خوشی — نہ وہ رونقِ بزمِ زیبائے عیش

نہ وُہ نظمِ عشرت، نہ وہ اہتمام — نہ وہ ہر طرف سے تقاضائے عیش
نہ وہ بزمِ صہبا، نہ وہ دورِ جام — نہ وہ صحبت غرق دریائے عیش

نہ وُہ ساقیانِ سراپا جمال — نہ وہ بادہ ہائے گوارائے عیش
نہ وُہ مطربانِ عدیم المثال — نہ وہ نغمہ ہائے طرب زائے عیش

نہ وہ مجمعِ شاہدانِ شکیل نہ وہ محفلِ جلوہ آرائے عیش
نہ وہ اجتماعِ حسین و جمیل نہ وہ جلسۂ رنگ پیرائے عیش

نہ اگلی سی تائیدِ بختِ رسا نہ پہلی سی توفیق اجرائے عیش
نہ قسمت سے تسکینِ دل کا پتا نہ شامت سے امیدِ احیائے عیش

تم آزادِ زار! اور یہ حال۔ حیف
کبھی ہائے عشرت۔ کبھی ہائے عیش

آزاد انصاری

جذباتِ اکبر

اظہارِ آرزو کی جو ہمت نہ ہو سکی تم نے سمجھ لیا کہ محبت نہ ہو سکی
اندوہِ شامِ ہجر سے فرصت نہ ہو سکی ہم سے وصالِ یار کی حسرت نہ ہو سکی
دل کو خیالِ یار سے فرصت نہ ہو سکی رنجِ شبِ فراق کی خدمت نہ ہو سکی
جھوٹوں ہی پوچھتے کبھی بیمارِ غم کا حال تم سے نہ ہو سکی یہ مروت نہ ہو سکی
جور و جفائے یار پہ بھی شادماں رہا یعنی ہمارے دل کو نصیحت نہ ہو سکی
کیوں مٹ رہا ہے اُس بتِ غفلت شعار پر معلوم ہم کو دل کی حقیقت نہ ہو سکی
دامانِ یار تک نہ تصور میں بھی گیا اتنی بھی دستِ شوق سے جرأت نہ ہو سکی
اتنی ہر دو خبر تھی ساقی کی چشمِ مست جامِ شراب سے مجھے رغبت نہ ہو سکی
اتنا ترے خیال نے بیخود بنا دیا اندوہِ انتظار کی زحمت نہ ہو سکی

اکبر وفورِ یاس میں احساس مٹ گیا
آنے سے اُس کے دل کو مسرت نہ ہو سکی

اکبر بٹالوی

غزل

تجھ کو میرے دل پوچھا چاہئے　　تجھ کو ان آنکھوں سے دیکھا چاہئے

دیکھ لی۔ تیری تجلی دیکھ لی　　دیکھنے کو بھی کلیجا چاہئے

تیری وہ غفلت کہ پرواہی نہیں　　میری وہ حالت کہ دیکھا چاہئے

آنکھ کو یہ ہٹ کہ "لا اُس کو دکھا"　　دل جھجکتا ہے کہ "دیکھا چاہئے"

تو ہے اور دانستہ بے پروائیاں　　کیا مجھے بھی صبر کرنا چاہئے

کیا نئی ضد ہے کہ "ظالم صبر کر"　　صبر آجائے تو پھر کیا چاہئے

ڈوبتوں کا بچ نکلنا سہل ہے　　ایک تنکے کا سہارا چاہئے

میری کھیتی کا　　کیا محال　　اِک ترشح۔ ایک چھینٹا چاہئے

میری بگڑی کا بنانا کیا محال　　لطف کی آنکھوں سے دیکھا چاہئے

چارۂ بیمار کچھ مشکل نہیں　　التفاتِ چارہ فرما چاہئے

آہ! اے آرامِ جانِ بیقرار　　درد بن کر دل میں رہنا چاہئے

حادثاتِ دہر کے شکوے فضول　　کڑوی میٹھی سب گوارا چاہئے

صورتِ چرخ اب زمیں گردش میں ہے　　مقتضائے وقت سمجھا چاہئے

حضرت آزاد! یوں بیدل نہ ہوں
اُس کی رحمت پر بھروسا چاہئے

آزاد انصاری

میری داستان حیات

ساتواں باب

مطالعۂ قدرت۔ پھولوں کی سیر۔ پڑھنا۔ حساب۔ جغرافیہ۔ حیوانات اور نباتات کی تعلیم

میری تعلیم میں اگلا ضروری مرحلہ پڑھنا سیکھنے کا تھا۔

جب میں چند الفاظ کا ہجّا کرنے لگی، تو میری اُستانی نے مجھے مقوّے کے چند ٹکڑے عنایت کئے، جن پر اُبھرے ہوئے حروف کو ملا کر الفاظ چھپے ہوئے تھے میں نے جلد ہی سیکھ لیا۔ کہ ہر ایک مطبوعہ لفظ کسی نہ کسی چیز، فعل یا خاصیت کا نام ہے۔ مجھے ایک چوکھٹا دیا گیا۔ میں اس چوکھٹے میں ان الفاظ کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں مرتب کر سکتی تھی۔ لیکن چوکھٹے میں جملے بنانے سے پیشتر میں ان الفاظ کو مجسم اور عملی صورت میں مرتب کیا کرتی تھی۔ مثلاً سب سے پہلے میں ان ٹکڑوں کو ٹٹول کر نکالتی، جن پر یہ الفاظ لکھے ہوتے تھے "گڑیا۔ بستر پر ہے۔" تو میں ہر ایک نام کو اس کی متعلقہ شے پر رکھتی۔ ازاں بعد اپنی گڑیا کو بستر پر رکھ کر اس کے پاس الفاظ "بستر پر ہے۔" کو ترتیب دیکر رکھ دیتی۔ اس طرح الفاظ کا جملہ بھی بن جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی اس جملے کا تصوّر متعلقہ اشیاء کے قریب ہونے سے پیدا ہو جاتا تھا۔

اُستانی صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز میں لفظ لڑکی کو اپنے لبادہ کے اگلے حصّے پر سُوئی سے ٹانک کر کپڑوں کی الماری میں کھڑی ہو گئی۔ اور طاق پر میں نے ان الفاظ کو ترتیب دیا۔ "لباس کے کمرے میں ہے۔" مجھے اس کھیل سے بڑھ کر کسی چیز سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ میں اور اُستانی بیک وقت گھنٹوں تک اس طرح کھیلتے رہتے تھے۔ اور اکثر اوقات کمرے کی ہر ایک چیز کو اس کے محل وقوع کے اعتبار سے جملوں میں مرتب کرتے تھے۔

چھپے ہوئے حروف والے ٹکڑوں سے ایک مطبوعہ کتاب کی طرف چلنا محض ایک قدم اُٹھانا تھا۔ میں اپنی ابتدائی درسی کتاب لیکر اس میں سے ان الفاظ کو تلاش کیا کرتی تھی۔ جن سے میں آشنا تھی جب میں

انہیں پالیتی، تو میری خوشی بعینہٖ ایسی ہوتی تھی۔ جیسے کہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے سے ہوتی ہے۔ اس طریق سے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ میں اس وقت کا تذکرہ بعد میں کرونگی جبکہ میں نے مسلسل کہانیوں کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

مدت تک میں نے کوئی باقاعدہ سبق نہیں پڑھے بلکہ جب میں مطالعہ میں نہایت مصروفیت کے ساتھ مشغول ہوتی تھی۔ تو اس وقت وہ کام کی بجائے کھیل سا معلوم ہوتا تھا۔ مس سلیون مجھے جو کچھ پڑھاتی تھیں، اس کی تمثیل اور تشریح، ایک دلکش نظم یا کسی کہانی کے ذریعے سے کیا کرتی تھیں۔ جب کبھی میں کسی شے سے محظوظ ہوتی تو اُستانی اس کے متعلق مجھ سے ایسے طریق پر گفتگو کرتی تھیں کہ گویا وہ خود بھی ایک چھوٹی سی لڑکی ہیں۔ وہ چیزیں جن کا تصور کبھی بچے خوف و ہراس کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً گرامر کا تکلیف دہ مطالعہ یا مشکل سوالات اور اصطلاحات کا یاد کرنا، آج یہ تمام اشیاء میرے پاس ایک نہایت ہی قیمتی ورثے کی طرح محفوظ ہیں۔ کیونکہ وہ مجھے نہایت دلچسپ طریق سے پڑھائی گئی تھیں۔

میں وہ ہمدردی کیا بیان کروں جو مس سلیون میری خوشیوں اور میری خواہشات کے ساتھ رکھتی تھیں۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک طویل عرصے سے اندھوں کی تعلیم و تربیت کے کام سے خوگر تھیں۔ اس ہمدردی کے علاوہ ان کی قوت بیانیہ نہایت تیز تھی۔ وہ بے لطف شرح و تفصیل پر سے جلد جلد گزر جاتی تھیں۔ اور انہوں نے کبھی مجھے ایسے سوالات کر کے دق نہیں کیا۔ جن سے یہ دیکھنا مقصود ہو کہ مجھے کل یا پرسوں کا سبق یاد ہے یا نہیں۔ انہوں نے سائنس کی خشک اصطلاحات کو تھوڑا تھوڑا کر کے معمولی اسباق کا جزو بنا دیا تھا۔ اور وہ ہر مضمون کو اس کے اصلی رنگ میں ایسے طریق سے پیش کرتی تھیں کہ میں سبق کو یاد کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

ہم تعلیم کے معاملے میں آفتاب کے منور کئے ہوئے جنگلات کو ہمیشہ مکان کی چار دیواری پر ترجیح دیتی تھیں۔ اور اکثر باہر کھلی ہوا میں مطالعہ کرتی تھیں میرے تمام ابتدائی اسباق میں تو کدار چیڑ کے درختوں اور جنگلی انگوروں کی خوشبو کا تصور شامل ہے۔ جنگلی گل لالہ کے محبت آفرین سائے کے نیچے میں نے یہ غور کرنا سیکھا۔ کہ ہر شے اپنے اندر ایک سبق اور ہدایت رکھتی ہے۔ بقول کسے "اشیاء کی دلربائی ہی نے مجھے ان تمام کا استعمال سکھایا" درحقیقت شگوفوں کا کھلنا اور بھونرے اور مکھی کی بھنبھناہٹ، پرندوں کے گیت، مینڈک کا

گلا پھاڑ پھاڑ کر ٹرّانا۔ ٹڈی اور جھینگر (جنھیں مَیں اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی۔ اور وہ بلا تکلّف بانسری کی سی آواز نکال کر گانے لگتے تھے) مُرغی کے چوزے مرغزار گلہائے بنفشہ، ثمردار درخت غرض یہ تمام اشیا میری تعلیم کا جزو تھیں۔ مَیں رُوئی کے گالوں کو چھو کر ان کے نرم نرم ریشوں اور ننّھے بیجوں کو محسوس کرتی۔ ہوا کا اناج کے ڈنٹھلوں میں سے سرسرانا اور درختوں کے لمبے لمبے پتّوں کا باہم ٹکرانا، ان سب کو مَیں بخوبی محسوس کرتی تھی۔ آہ! مجھے اپنے یابو کی خشمناک آواز اور اُس کا خوشبودار سانس جبکہ وہ چراگاہ میں کلّا اور گھاس چر کر آتا اور اس کے کھانے سے اس کے سانس میں بھی خوشبو پیدا ہو جاتی اور ہم سب پکڑ کر اس کے مُنہ میں لگام دیتی تھیں۔ کیا اچھی طرح یاد ہے!

بعض اوقات میں علے الصبح اُٹھ کر چپکے سے باغ میں آ جاتی۔ اُس وقت گھاس اور پھول شبنم سے لدے ہوتے تھے۔ گلاب کے پھولوں کی نرمی کو ہاتھ سے دبا کر محسوس کرنے سے یا بادِ صبا کے جھونکوں سے گلِ سوسن کے جھومنے کا لطف بہت کم اشخاص نے اُٹھایا ہو گا۔ کبھی کبھی مَیں پھول توڑتے وقت اس کے اندر چھپے ہوئے بھونرے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ محسوس کرتی، جبکہ یہ ننّھا جانور میری اُنگلیوں کے بیرونی دباؤ سے باخبر ہو کر یکایک خوفزدہ ہو جاتا اور اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا تھا۔

میرا ایک اور مرغوب اڈّا باغ کا وہ حصّہ تھا، جہاں جولائی کے شروع میں پھل پکتے تھے۔ میرے ہاتھ بڑے بڑے روئیں دار، نرم آڑوؤں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور جب مسرت خیز ہوائیں درختوں پر چلتی تھیں اُس وقت میرے پاؤں میں آ گرتے تھے۔ اس خوشی کا کیا ٹھکانا تھا۔ جو مجھے اپنی جھولی میں میوہ جمع کرنے اور صاف سیب کو جو دُھوپ سے گرم ہوتا تھا۔ اپنے رخساروں کے ساتھ دبانے اور پھر اُچھلتے کُودتے گھر چلے جانے سے حاصل ہوتی تھی۔

ہم دونوں کی مرغوب سیرگاہ دریائے ٹینی سی کے کنارے ایک ٹوٹا پھوٹا گھاٹ تھا۔ جو مُلکی خانہ جنگی کے ایّام میں سپاہ کو جہاز پر سے اُتارنے کا کام دیتا تھا۔ اور جواب لکڑی کا گودام تھا۔ یہاں ہم نے بہت سی راحت بخش گھڑیاں بسر کی تھیں۔ اور ہم جغرافیہ پڑھنے کا کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ مَیں تفریح اور دل لگی کی غرض سے کنکروں کے بند لگا کر جزیرے اور جھیلیں بناتی اور دریاؤں کی تہ کھودا کرتی تھی۔ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ مَیں دراصل ایک سبق پڑھ رہی ہوں۔ مَیں نہایت حیرت کے ساتھ مس سلیون کے تذکرۂ عالم میں محو ہو جاتی تھی۔ جس میں آتش خیز پہاڑوں

مدفون شہروں، متحرک برفانی دریاؤں، اور بہت سی عجیب و غریب اشیاء کا حال بتایا جاتا تھا۔ اُستانی مٹی کے ابھرے ہُوئے موڈل (نمونے) تیار کیا کرتی تھیں تاکہ مَیں ان پر اپنی اُنگلیاں پھیر کر پہاڑوں اور وادیوں کے سلسلوں اور دریاؤں کے خمدار رستوں کو ٹٹول سکوں۔ مجھے بھی یہ شغل پسند تھا، لیکن منطقوں میں زمین کی تقسیم مجھے گھبراہٹ اور تکلیف میں ڈال دیتی تھی۔ زمین کی گردش، شکل اور قطبین کی تمثیل کے دوران میں جو رسّی تنکا اور نارنگی استعمال کی جاتی تھی وہ اس قدر مطابق اصل معلوم ہوتی تھی کہ آج بھی منطقہ معتدلہ کے ذکر ہی سے، خمدار دائروں کا ایک سلسلہ ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کوشش کرے تو وہ مجھے یقین دلا سکیگا۔ کہ سفید قطبی ریچھ، درحقیقت قطب شمالی پر چڑھ جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا تذکرہ محض اس لحاظ سے تھا کہ وہ منطقہ باردہ کے مخصوص جانور ہیں۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ میری مجازی تعلیم میں حقیقت کا ایک نہایت ہی گہرا رنگ جھلکتا تھا۔

صرف حساب ایک ایسا مضمون تھا جو مجھے ناپسند تھا۔ مجھے اس علم میں ابتدا ہی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مس سلیون نے مجھے گولیوں کو مختلف گروہوں میں پرو کر گنتی سکھانے کی کوشش کی۔ اور کنڈرگارٹن کی تیلیوں کے ذریعہ سے مَیں نے جمع اور تفریق سیکھ لی تھی۔ مَیں ایک وقت میں پانچ یا چھ مُٹھوں سے زیادہ ترتیب نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ اس سے جلد اُکتا جاتی تھی۔ اور جب مَیں حساب کا اتنا کام کر لیتی تو میرا ضمیر دن بھر کے لئے مطمئن ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد مَیں جلد ہی اپنی ہمجولیوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی تھی۔

اسی فراغت کے ساتھ مَیں نے علم نباتات اور علم حیوانات کی تحصیل کی۔

ایک مرتبہ کسی شریف آدمی نے جس کا نام یاد نہیں رہا۔ مجھے چند "معدنی پتھر" بھیجے۔ ان میں ننھّے ننھّے خوبصورت چتکبرے گھونگے، بھربھرے پتھر، (جن پر پرندوں کے پنجوں کے نشان تھے) اور ایک خوشنما خاردار بھٹو ہر کا نمونہ تھا۔ یہی وہ کنجیاں تھیں جن کے ذریعے سے پُرانی دقیانوسی دُنیا کے مقفل خزانے مجھ پر کھل گئے۔ مَیں نے کانپتی ہُوئی اُنگلیوں کے ساتھ (کیونکہ یہی میرے کان اور یہی میری آنکھیں تھیں) مس سلیون سے اُن ہیبتناک حیوانات کے تذکروں کو سُنا۔ جن کے نام اتنے بھدّے اور طویل تھے۔ کہ آسانی سے لکھے یا پکارے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ حیوان کسی زمانے میں قدیم ابتدائی دُنیا کے جنگلات میں چلتے پھرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے درختوں کی ٹہنیوں کو توڑ کر کھا جاتے تھے

اور کسی نامعلوم عہد گزشتہ کی تیرہ و تار دلدلوں میں مر کھپ چکے تھے۔ مدت تک یہ نامعلوم حیوان مجھے خواب میں دکھائی دیتے رہے۔ یہ تاریک زمانہ در اصل میری زندگی کی تصویر کا وہ پچھلا حصّہ تھا جس کے روبرو میرا موجودہ راحت بخش گلاب کے پھولوں اور روشنی کے جلووں سے لبریز ہے اور جس کے اندر میرے یابو کے سموں کے ٹکرانے کی سی دھیمی دھیمی گونج پائی جاتی ہے۔

ایک اور موقع پر مجھے ایک خوشنما گھونگا دیا گیا۔ جس سے مجھے بچوں کی سی خوشی اور اس کے ساتھ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ اس ننھے سے جانور نے کیسی کاریگری سے اس کے اندر ایک نورانی کنڈی دار گھر بنا لیا ہے۔ اور رات کو جب کہ چاروں طرف خاموشی طاری ہوتی ہے اور سمندر پر ہوا کے بند ہونے سے کوئی تموج نہیں ہوتا تو یہ خوبصورت سیپ دار حیوان بحر ہند کی نیلگوں سطح پر اپنا گوہر وار جہاز کس طرح چلاتا ہو گا۔ جب میں اس ننھی بحری مخلوق کے عادات و خصائل حیات کے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات حاصل کر چکی، مثلاً یہ کہ سمندر کی ٹکرانے والی لہروں کے اندر ننھے ننھے کنکھجورے کے سے جانور، بحرالکاہل میں مونگے کے جزیرے بنا لیتے ہیں، یا یہ کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے سوراخ دار کیڑے، کتنی سرزمینوں کے ساحلوں پر چاک کی پہاڑیاں تعمیر کرتے ہیں۔ تب استانی جی نے مجھے نظم "خانے دار گھونگا" پڑھ کر سنائی۔ اور اس کی تشریح کی کہ گھونگے بنانے والے ننھے جانور کا مختلف کوٹھڑیوں والا گھر بنانا نفسانی نشو و نما کے مختلف منازل کی ایک تمثیل ہے جس طرح گھونگے کا معجز نما لبادہ اس مصالحہ کو جو وہ سمندر کے پانی سے حاصل کرتا ہے۔ جذب کر کے اپنے جسم کا جزو بنا لیتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کی تبدیلیاں علم کے ذرات میں جو انسان تھوڑا تھوڑا کر کے حاصل کرتا ہے واقع ہوتی ہیں۔ اور بالآخر وہ عالمِ خیال کے جواہر ریزے بن جاتے ہیں۔

اس کے بعد میرا سبق "پودے کی نمو" تھا ہم نے سوسن کا ایک پودا خرید کر اسے کھڑکی کی روشنی میں رکھ دیا۔ بہت جلد، سبز نوکدار کلیوں کے کھلنے کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ باہر کی طرف کے نازک، انگشت نما پتے آہستہ آہستہ کھلنے شروع ہوئے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ پتے اپنی شان رعنائی کو ظاہر کرنے سے شرماتے ہیں۔ اسی لئے وہ آہستہ اور نارضامندی کے ساتھ شگفتہ ہو رہے ہیں لیکن جب انہوں نے ایک دفعہ کھلنے کی ابتدا کی تو باقیماندہ شگفتگی کا عمل سرعت، مگر ایک خاص ترتیب کیساتھ ہونے لگا۔ اس پودے میں ایک کلی، دوسروں کی نسبت قدآور

اور زیادہ حسین تھی۔ جو اپنا بیرونی پتّوں کا لباس، دوسروں کی نسبت زیادہ آن بان اور شان و شکوہ کے ساتھ اتارتی تھی۔ گویا یہ نرم نرم ریشمی لباس پہننے والی حسین کلی اس بات سے آگاہ تھی کہ پودے کی بادشاہت میں ملکہ سوسن کہلانے کا حق اسی کو ہے۔ حالانکہ اس کی دوسری شرمیلی بہنیں اپنی اپنی دھانی اوڑھنیاں اُتار ڈالنے میں شرم و حیا سے کام لے رہی تھیں۔ آخرکار پودے کی تمام سرزمین خوشبو اور خوشنمائی کی ایک وجد آور مملکت دکھائی دینے لگی۔

ایک دفعہ شیشے کے ایک مرتبان میں گیارہ بینڈک کے بچے ڈال کر ایک کھڑکی میں جو پودوں سے لبریز تھی رکھ دئے گئے۔ جس اشتیاق کے ساتھ میں نے ان بینڈکوں کے حالات دریافت کئے۔ وہ مجھے بخوبی یاد ہے۔ میرے لئے یہ ایک بڑی تفریح تھی۔ کہ اپنا ہاتھ اس بلوری برتن میں ڈالوں اور بینڈکوں کو اِدھر اُدھر بھاگنے اور میری اُنگلیوں کے درمیان نقل و حرکت کرتے معلوم کروں۔ ایک دن ان میں سے ایک زیادہ دلیر بینڈک، برتن کے کنارے کے باہر کودا۔ اور فرش پر گر پڑا۔ جہاں میں نے اس کو بظاہر مردہ پایا۔ اس کی زندگی کی واحد علامت اس کی دم کی خفیف حرکت تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے اصلی عنصر (پانی) میں داخل ہُوا۔ تو جھٹ لپک کر تہ تک پہنچ گیا۔ اور خوشی خوشی چستی کے ساتھ تیر کر چکّر کاٹنے لگا۔ وہ ذقند لگا کر وسیع دُنیا کی سیر کر چکا تھا۔ اور اب وہ اپنے خوبصورت شیشے کے گھر میں بڑے نکسیا کے درخت کے تلے رہ کر قانع تھا۔ تا کہ کسی روز وہ بڑھ کر ایک رعب دار بینڈک بن جائے۔ بعد ازاں یہی بینڈک کا بچّہ باغ کے سرے پر پتّوں والے حوض میں رہنے لگا۔ یہاں اس نے اپنے نرالے عشقیہ گیت سے گرمی کی راتوں کو ترنم آمیز بنا رکھا تھا۔

اس طریق سے میں زندہ مخلوق ہی کے ذریعے علم حاصل کرتی رہی۔ ابتداً میں فقط ممکنات کا ایک مجموعہ تھی۔ یہ میری اُستانی ہی تھیں جنہوں نے ان ممکنات کی نشو و نما کی اور انہیں بے نقاب کر دیا۔ ان کے آنے پر میرے اردگرد کی ہر شے سے محبت و مسرت اور معانی ٹپکنے لگے۔ اس وقت سے ابتک انہوں نے کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہ انہوں نے ہر چیز کے حسن اور اس کی دلفریبی سے مجھے آگاہ نہ کیا ہو۔ اور نہ کبھی انہوں نے آجتک خیال قول اور مثال کے ذریعہ سے میری زندگی کو پُرلطف اور کارآمد بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا ہے۔

یہ اُستانی صاحبہ ہی کی گہری ہمدردی، بامہر سلیقہ

ہنروری اور فطنت تھی۔ کہ اس کے طفیل میری تعلیم کے
ابتدائی سال اسقدر پرلطف بن گئے۔ بات یہ ہے کہ علم
سکھانے کے لئے وہ ہمیشہ صحیح موقعہ کو کبھی ہاتھ سے جانے
نہ دیتی تھیں۔ جس سے انکی باتیں بہت زیادہ خوشگوار و قابل فہم
معلوم ہوتی تھیں۔ وہ یہ نکتہ سمجھ چکی تھیں کہ بچے کا دل
ایک پایاب ندی کی مانند ہوتا ہے۔ جو تعلیم کے دشوار گزار
پتھریلے راستے پر اچھلتی کودتی لہریں بناتی ہوئی بہ رہی
ہو۔ اس ندی کے اندر کہیں کسی پھول کہیں جھاڑی اور
کہیں ریشم کے سے بادلوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔
پس انہوں نے اس ندی کے راستے کی رہنمائی شروع
کی۔ اور ساتھ ہی انہیں یہ علم تھا کہ نالے کی پرورش
پہاڑی آبشاروں اور خفیہ چشموں ہی کے ذریعے سے
ہو سکتی ہے۔ یہانتک کہ وہ نالہ بالآخر ایک وسیع اور
گہرا دریا بن جاتا ہے۔ جس کی ساکن سطح جس طرح کہ
موجوں، درختوں اور نیلگوں آسمان کے روشن سائے کو
منعکس کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک
ننھے سے پھول کا شیریں عکس بھی دکھا سکتی ہے۔
ہر ایک اُستاد بچے کو جماعت کے کمرے میں
تو لیجا سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ اسے پڑھا
بھی سکے۔ بچہ کبھی خوشی سے نہیں پڑھ سکتا جب تک
کہ وہ یہ محسوس نہ کرے کہ خواہ وہ کمرے میں مصروف ہو
یا آرام کر رہا ہو۔ اس کی آزادی میں فرق نہیں آئے گا۔
اس سے پیشتر کہ بچہ ان کاموں کو جو اُسے ناگوار ہوں،
اپنی ہمت کے بل پر کرنے کے لئے تیار ہو اور درسی کتب
کے بے لطف دستور العمل میں سے ہنستا کھیلتا گزر جانے
کے لئے آمادہ ہو۔ اسے کامیابی کی خوشی اور ناکامی کا غم
محسوس ہونا چاہیئے۔
میرے دل کو اُستانی صاحبہ سے اسقدر قرب
حاصل ہے کہ میں اپنے متعلق بمشکل ہی کوئی خیال
ایسا رکھتی ہوں جس میں انکا خیال شامل نہ ہو۔ میں کبھی یہ
نہیں بتا سکتی ہوں کہ تمام نفیس اور خوشنما اشیاء کے
متعلق میری خوشی کس قدر فطری ہے۔ اور کس قدر
اُن کے اثر سے حاصل کی ہوئی ہے۔ میں یہ محسوس
کرتی ہوں۔ کہ ان کی ہستی میرے وجود سے
ناقابلِ انقطاع ہے۔ اور یہ کہ میری زندگی
کے قدم اُن کے قدموں میں شریک ہیں۔
میری بہترین چیزیں دراصل انہیں کی ہیں۔
کیونکہ میرے اندر کوئی قابلیت، مسرت
یا خواہش ایسی نہیں جو ان کے محبت آمیز اشارے
سے پیدا نہ ہوئی ہو۔

آٹھواں باب

کرسمس (بڑے دن) کی عید

مس سلیون کے ٹسکمبیا میں آنے کے بعد پہلا کرسمس میرے لئے ایک اہم واقعہ تھا۔ ہمارے کنبے میں ہر شخص اس موقعہ پر اس کوشش میں تھا کہ مجھے حیرت میں ڈالے۔ لیکن جس بات سے مَیں بہت خوش ہوتی تھی۔ وہ یہ تھی۔ کہ مس سلیون اور میں دونوں دوسرے لوگوں کو حیران کرنے میں کامیابی حاصل کرتی تھیں۔ اس تہوار کے عطیوں میں جو راز اور معمے پنہاں تھے وہ میرے لئے از بس موجب مسرت و تفریح تھے۔ دوست اور احباب میرے استعجاب کو اشاروں اور نا تمام جملوں کے ذریعے سے عین وقت پر افشا کر کے جنبش میں لاتے رہے۔ مس سلیون اور میں بجھارتوں کا کھیل کھیلتی تھیں اور اس کھیل کی مدد سے مَیں زبان اور الفاظ کے استعمال کو اسقدر زیادہ سیکھ گئی کہ اگر یہی مقررہ اسباق کے ذریعہ سے سکھایا جاتا۔ تو مَیں بہت کم سیکھ سکتی۔ ہر شام کو آگ کے اردگرد بیٹھ کر ہم اپنی پہیلیاں کہا کرتی تھیں اور جوں جوں بڑا دن نزدیک آتا گیا اس کھیل میں اور زیادہ سرگرمی پیدا ہوتی گئی۔

بڑے دن کی شام کو ٹسکمبیا کے اسکول کے بچوں نے "کرسمس کا درخت" تیار کیا۔ اور اس جلسے میں شامل ہونے کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ مدرسے کے کمرے کے عین وسط میں ایک خوشنما درخت دھیمی روشنی کے اندر نورانی صورت میں کھڑا کیا گیا۔ اس کی شاخیں عجیب و غریب، نرالے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ یہ سماں نہایت خوشی کا تھا۔ مَیں جوش مسرت سے بیخود ہو کر اس درخت کے اردگرد اچھلتی کودتی تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ ہر ایک بچے کو کرسمس کا ایک ایک تحفہ ملیگا۔ تو مَیں بیحد خوش ہوئی۔ اور جن مہربان احباب نے وہ درخت بنایا تھا۔ انہوں نے دوسرے بچوں کو میرے ہاتھ سے تحفے اور کھلونے دلوائے۔ مَیں نے اس خوشی میں اپنے حصے کے تحفوں کو دیکھا تک نہیں۔ لیکن جب مَیں نے انہیں قبول کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے اُس وقت میری بے صبری کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور مَیں اس خواہش میں کہ اب کرسمس کا تہوار جلد از جلد شروع ہو۔ آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی میں جانتی تھی کہ جو تحفے مجھے اب مل چکے ہیں وہ دراصل ان سے مختلف ہیں جن کے متعلق میرے دوستوں نے

اس سے پیشتر للچانے والے اشارے کئے تھے۔ اور اُستانی جی نے بھی کہا تھا۔ کہ اور جو ہدیے مجھے ملیں گے وہ ان سے بدرجہا اچھے اور نفیس ہونگے۔ تاہم مجھے درست والے کھلونوں ہی پر قناعت کر لینے کی تلقین کی گئی۔ اور دوسروں کا اگلی صبح تک انتظار کرنا پڑا۔

اس شب کو مَیں اپنی جرابیں اتار کر انہیں لٹکانے کے بعد دیر تک جاگتی رہی۔ گو بظاہر مَیں سوئی ہُوئی تھی لیکن دراصل میں بزرگ سنٹا کلاز[۱] کی تاک میں رہی کہ وہ آکر کیا کرتا ہے۔ آخرکار مَیں ایک نئی گڑیا کو ہاتھ میں اور ایک سفید ریچھ کے کھلونے کو بغل میں لیکر سو گئی۔ اگلی صبح کو سب سے پہلے مَیں نے ہی تمام گھر والوں کو "کرسمس کی عید مبارک" کے نعرے سے بیدار کیا۔

مَیں نے نہ فقط اپنی جرابوں میں بلکہ میزوں، کرسیوں، دروازوں اور کھڑکی کے آستانے پر بھی حیرت انگیز تغیرات کو محسوس کیا۔ دراصل مَیں مشکل چل سکتی تھی۔ کیونکہ قدم بار بار کسی نہ کسی باریک کاغذ میں لپیٹے ہُوئے کرسمس کے تحفے سے ٹھکراتے تھے۔ لیکن میری خوشی کا پیمانہ اس وقت لبریز ہو کر اُچھلنے لگا۔ جبکہ میری اُستانی نے مجھے ایک کنیری (کوئل کی شکل کا) پرندہ تحفے کے طور پر عطا کیا۔

یہ ننھا جانور ایسا سدھا ہُوا تھا کہ وہ میری انگلی پر ناچتا اور میرے ہاتھ سے مٹھائی لیکر کھا لیتا تھا۔ مس سلیون نے مجھے اپنے نئے پالتو پرندے کی خبرگیری سکھا دی۔ میں ہر صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد اس کو غسل کراتی۔ اس کا پنجرا صاف سُتھرا کرتی اور اس کے پیالوں میں تازہ دانہ اور پانی ڈالتی۔ اور اس کے جھولے میں گھاس بچھا دیتی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت مَیں پنجرے کو حسب معمول کھڑکی میں رکھ کر کنیری کے لئے پانی لانے گئی۔ جب اپنی واپسی کے وقت مَیں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک بڑی بلّی کو اپنے پاس سے گزرتے ہُوئے محسوس کیا۔ پہلے تو مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ کیا واقعہ گزرا ہے؟ لیکن جب مَیں نے پنجرے کے اندر ہاتھ ڈالا اور کنیری کے بازو میرے ہاتھ میں نہ آئے۔ اور نہ اس کے نوکدار پنجوں نے میری اُنگلی ہی کو پکڑا۔ تو مَیں سمجھی کہ میں اپنے ننھے مُنّے گویّے کو ہمیشہ کے لئے کھو چکی ہوں۔

---

[۱] عیسائی بچوں کے نزدیک ایک خیالی بزرگ سفید ریش انسان ہے۔ جو بڑے دن سے پہلی شب اپنے ساتھ بے شمار کھلونے لاکر بچوں کے پاس رکھ جاتا ہے۔ اور وہ انہیں صبح کو اُٹھا لیتے ہیں۔ اگر نیک بچہ ہو تو اُسے زیادہ کھلونے ملتے ہیں۔ لیکن اگر ضدی یا شرارتی ہو تو اسے کم۔ (مترجم)

نواں باب

شہر بوسٹن کی سیر

میری زندگی میں اس کے بعد کا اہم واقعہ سنہ ۱۸۸۸ء میں بوسٹن کی سیر تھا۔ وہاں جانے کی تیاری امّاں جان اور اُستانی کے ہمراہ روانگی، سفر اور بوسٹن میں پہنچنا، یہ سب مجھے اس طرح یاد ہے کہ گویا ابھی کل ہی کی بات ہے۔ یہ سفر دو سال پیشتر کے بالٹی مور والے سفر سے کسقدر مختلف تھا! اب میں پہلی سی بے چین نہ تھی۔ اور جلد جوش میں نہ آجایا کرتی تھی۔ اور نہ ریل میں ہر شخص کی توجہ کی محتاج تھی تاکہ مجھے بہلایا جاتے۔ بلکہ مس سلیون کے پاس خاموش اور مطمئن بیٹھی رہتی تھی اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر وہ جو کچھ دیکھتی اور مجھ پر ظاہر کرتی تھیں، میں یہ تمام حالات پورے اشتیاق اور دلچسپی کے ساتھ "معلوم کرتی جاتی تھی" ان نظاروں میں خوبصورت دریائے ٹینی سی، روئی کے وسیع کھیت جنگل اور پہاڑ، سٹیشنوں پر ہنستے ہوئے حبشیوں کے گروہ جو ہاتھ ہلا ہلا کر مسافروں کا استقبال کرتے انہیں الوداع کہتے اور گاڑی میں لذیذ مٹھائی اور مکّی کے لڈو لاتے تھے اور اور مناظر شامل تھے۔ میری نشست کے بالمقابل میری بڑی گڑیا نانسی دھاریدار لباس اور ... دار ٹوپی پہنے ہوئے اپنی دو گولیوں کی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ بعض اوقات جبکہ میں مس سلیون کے تذکروں میں محو نہیں ہوتی تھی، میں نانسی کی ہستی سے باخبر ہو کر اسے گود میں اٹھا لیتی تھی۔ لیکن بالعموم میں اپنے دل کو اس کے متعلق یہ خیال کر کے تسکین دیا کرتی تھی کہ گڑیا سو رہی ہے۔

چونکہ مجھے نانسی کی طرف دوبارہ اشارہ کرنے کا موقع نہیں ملیگا۔ اس لئے میں یہاں اس کے متعلق ایک افسوسناک واقعہ بیان کرتی ہوں۔ جو اسے بوسٹن میں پہنچتے ہی پیش آیا۔ وہ غلاظت سے بھری ہوئی تھی۔ یعنی کیچڑ اور سموسے کا بقایا جس کے کھانے پر میں نے اسے مجبور کیا تھا۔ اور جسے اس نے کبھی پسند نہیں کیا اس کے جسم پر جما ہوا تھا۔ پرکنز انسٹی ٹیوشن کی دھوبن اسے غسل دینے کے لئے چپکے سے اٹھا کر لے گئی۔ غریب نانسی اسے برداشت نہ کر سکی۔ اور جب میں نے اس کے بعد اسے دیکھا تو وہ غریب چیتھڑوں کا ایک بے شکل ڈھیر تھی جسے میں کبھی پہچان نہ سکتی تھی۔ اگر اس کی دو گولیوں کی آنکھیں نہ ہوتیں جن کے ذریعے سے وہ مجھے حقارت آمیز نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

آخر کار جب ریل بوسٹن کے سٹیشن پر ٹھہری، تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ایک دلآویز پریوں کی کہانی تھی جو سچی ثابت ہو گئی ہے۔ جس میں " ایک دفعہ کا ذکر ہے " کی بجائے " اب " اور " دور و دراز کے ملک " کی بجائے " یہاں " سب کچھ موجود تھا۔ ہم بمشکل بوسٹن کے نابینا سکول یعنی پرکنز انسٹی ٹیوشن میں پہنچے تھے۔ کہ میں نابینا بچوں کے ساتھ جان پہچان کرنے لگی۔ مجھے یہ معلوم کر کے ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوئی۔ کہ وہ دستی حروفِ تہجی کا استعمال جانتے ہیں۔ مجھے اپنی زبان میں اپنے جیسے دوسرے بچوں کے ساتھ بات چیت کر کے کس قدر لطف حاصل ہوا۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اب تک میں ایک ایسے اجنبی کی مانند تھی جو کسی شارح کی امداد ہی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ یہ وہی مدرسہ تھا۔ جہاں لارا برجمن نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب میں گویا اپنے ہی ملک میں تھی۔ نہ کہ کسی اجنبی جگہ میں مجھے اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے کچھ عرصہ درکار تھا۔ کہ میرے نئے رفیق نابینا ہیں۔ میں جانتی تھی کہ میں دیکھ نہیں سکتی ہوں لیکن یہ امر غیر ممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام مشتاق اور محبت کرنے والے بچے بھی جو میرے ارد گرد جمع تھے اور میری چہل پہل میں شریک تھے۔ سب کے سب اندھے ہیں۔ مجھے وہ حیرت اور درد و کرب یاد ہے، جو مجھے یہ معلوم کرنے پر محسوس ہوا تھا۔ کہ جب میں ان سے بات کرتی تھی تو وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھتے، اور کتابوں کو اپنی انگلیوں سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس سے پیشتر یہ بتایا گیا تھا اور میں اپنی معذوریوں کو سمجھتی تھی۔ تاہم مجھے یونہی سا خیال تھا کہ چونکہ وہ سن سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں ایک دوسری قسم کی بینائی عطا ہو چکی ہے۔ میں اس کے لئے تیار نہ تھی۔ کہ ایک دو نہیں، بیسیوں بچے اس قیمتی عطیہ یعنی بینائی سے محروم ہیں۔ باوجود اس کے وہ اسقدر خوش و خرم اور قانع تھے کہ ان کی صحبت میں میری تمام دلی تکلیف کافور ہو گئی ان نابینا بچوں کی صحبت میں ایک دن بسر کرنے سے میں اپنے نئے ماحول میں بے تکلفانہ رہنے لگی۔ اور جوں جوں دن مسرت کے ساتھ گزرتے گئے میں ایک خوشگوار تجربے سے دوسری واقفیت کو حاصل کرنے کی مشتاق ہوتی گئی۔ میں اپنے آپکو قطعی طور پر یہ یقین نہ دلا سکی کہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے بہتیری دنیا پڑی ہے۔ کیونکہ میں بوسٹن کو کائنات کا مبدا و منتہا خیال کرتی تھی۔ بوسٹن کے دوران قیام میں ہم نے بنکرہل[۱] کو دیکھا

[۱] ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ریاست میسا چوسٹس میں واقع ہے۔ اب یہ شہرِ بوسٹن کا ایک حصّہ ہے اور اسے چارلس ٹاؤن کہتے ہیں۔ یہاں ۱۷ جون ۱۷۷۵ء کو برطانیہ اور امریکہ کے مابین ایک لڑائی ہوئی۔ جس میں امریکہ نے فتح پائی تھی۔ (مترجم)

اور وہاں جاکر مَیں نے علم تاریخ کا پہلا سبق حاصل کیا ان بہادروں کی کہانی سے جنہوں نے اس مقام پر جنگ کی تھی۔ مَیں بیحد متاثر ہُوئی مَیں اس پہاڑی پر جو ایک مشہور واقعہ کی یادگار ہے ایک ایک قدم گنتی ہُوئی چڑھ گئی۔ اور جوں جوں میں بلندی پر چڑھتی گئی۔ مَیں یہ خیال کر کے حیران ہُوئی۔ کہ اس مقام پر سے سپاہیوں نے چڑھ کر نیچے کی سپاہ پر کیونکر گولیاں برسائی ہونگی۔ اگلے روز ہم سمندر پر سے پلیتھ گئے دخانی کشتی پر یہ میرا پہلا بحری سفر تھا۔ اللہ اکبر! اس میں کس قدر زندگی اور حرکت تھی! کلوں کی گڑگڑاہٹ سے مجھے محسوس ہوا کہ شاید بادل گرج رہے ہیں' اور میں رونے لگی۔ کیونکہ مجھے خیال پیدا ہُوا کہ اگر بارش ہونے لگی، تو ہم اپنی تفریح سے محروم ہو جائینگے۔ مجھے پلیتھ میں، اور کسی شے کی نسبت اُس چٹان سے زیادہ دلچسپی تھی، جس پر انگلستان کے تارکینِ وطن[۵۱] آکر اُترے تھے، میں اس چٹان کو چھو سکتی تھی۔ اور اس احساس نے اُن تارکینِ وطن کی آمد اور انکے عظیم الشان کارناموں اور مشقّتوں کی اصلیت کو مجھ پر بخوبی واضح کر دیا۔ مَیں نے اس چٹان کے نمونے کو جو ایک مہربان شریف آدمی نے مجھے پلگرم ہال میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا' اکثر ہاتھ میں رکھا ہے۔ مَیں نے اس کے منحنی خطوط اس کے مرکزی کٹاؤ اور اس کے اُبھرے ہُوئے ہندسوں (۱۶۲۰ء) پر ہاتھ پھیرا ہے۔ اور اپنے ذہن میں "تارکین وطن" کی تمام حیرت انگیز تاریخ کا، جو مجھے معلوم ہُوئی تھی۔ اعادہ کیا ہے۔ ان بزرگوں (تارکینِ وطن) کے کارہائے نمایاں کی عظمت میرے بچپن کے تخیّل کو کسقدر روشن کرتی رہی! مَیں انہیں بہادر اور فیاض انسانوں کا گروہ تصوّر کرتی تھی۔ جنہوں نے اس اجنبی سرزمین میں آکر اپنا مسکن تلاش کیا۔ مَیں نے خیال کیا کہ یہ لوگ اپنی طرح بنی نوع انسان کی آزادی کے بھی خواہاں

[۵۱] چارلس اول شاہ انگلستان کے عہد میں فرقہ پیوریٹن (مخلصین) سخت مصائب کا شکار رہا۔ یہ لوگ غیر مقلد تھے۔ اور تمام مذہب کا سرچشمہ فقط انجیل کو تصوّر کرتے تھے۔ جب ان کی تکالیف کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ تو ان میں سے ۴۷ مردوں اور ۲۸ عورتوں نے وطن سے ہجرت کی۔ کچھ عرصہ تک یہ لوگ ہالینڈ کے مُلک میں مقیم رہے۔ بالآخر ۵ اگست سنہ ۱۶۲۰ء کو بندرگاہ ساؤتھ ایمپٹن سے امریکہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ اور اسی سال ۲۵ اگست سنہ ۱۶۲۰ء کو بہت سی تکالیف برداشت کر کے اس سرزمین کی بندرگاہ پلیتھ میں وارد ہُوئے۔ دراصل پلیتھ کی بستی کے بانی یہی لوگ ہیں۔ اور اضلاع متحدہ امریکہ کی موجودہ قوم اسی انگریزی قوم کی نسل سے وہاں آباد چلی آرہی ہے۔ ان لوگوں کو "پلگرم فادرز" کہتے ہیں

(مترجم)

ہو نگے۔ لیکن کئی سال کے بعد جب مجھے ان کے کشت وخون کے کارناموں کا علم ہوا۔ جس سے کہ ہم عرق انفعال میں ڈوبنے لگتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی جبکہ ہم ان کی شجاعت اور قوت کے قصیدہ خواہاں ہوتے ہیں۔ جس کی بدولت ہمیں یہ خوشنما ملک حاصل ہوا۔ تو مجھے اس خیال سے نہایت ہی حیرت اور مایوسی ہوتی ہے۔ مَیں نے بوسٹن میں جو بہت سی دوستیاں پیدا کیں ان میں مسٹر ولیم ابنڈیکاٹ اور انکی بیٹی قابل ذکر ہیں۔ ان کی جو نوازش میرے حال پر مبذول رہی وہ دراصل ایک تخم تھا جس سے بہت سی خوشگوار یادگاروں کے شگوفے پھوٹ نکلے ہیں۔ ہم ایک دن بیورے فارم میں ان کے خوشنما مکان پر گئے۔ مجھے یہ امر یاد کر کے نہایت مسرت ہوتی ہے۔ کہ کس طرح میں ان کے گلاب کے باغ میں سے گزری۔ جبکہ ان کے دو کتے ایک تو وہ قدآور جانور مسمی بہ لیو اور دوسرا لمبے کانوں اور گھونگریالے بالوں والا فرٹنر مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ جبکہ ان کا صبا رفتار گھوڑا نمرود اپنی ناک اور منہ کو شاباش اور مٹھائی کی ڈلی حاصل کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں ڈالے دیتا تھا۔ مجھے وہ سمندر کا ساحل بھی یاد ہے۔ جہاں میں پہلی مرتبہ ریت میں کھیلی تھی۔ یہ ریت بروسٹر کی بھربھری اور ہماری سیپ، اور گھونگوں کے ریزوں سے ملی ہوئی چبھنے والی ریت سے بہت مختلف یعنی سخت اور صاف تھی، جو بڑے جہاز بوسٹن کے قریب سے یورپ کی طرف جانے کے لئے گزرتے تھے۔ ان کا حال مسٹر ابنڈیکاٹ مجھ سے بیان کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ صاحب موصوف سے ملاقات کی اور وہ مجھ سے ہمیشہ لطف وکرم سے پیش آتے تھے۔ جب بعدازاں میں نے بوسٹن کو "نیک دلوں کے شہر" کے نام سے پکارا تو دراصل میرے دل میں اسی شریف النفس انسان کا خیال جاگزیں تھا۔

دسواں باب

سمندر کا غسل اور بحری مخلوق

مدرسہ پرکنز انسٹیٹیوشن، تعطیلات موسم گرما کے لئے بند ہونے ہی کو تھا۔ جبکہ یہ اہتمام کیا گیا کہ میں اور اُستانی صاحبہ تعطیلات کا زمانہ بروسٹر میں جو راس کوڈ پر واقع ہے۔ اپنی محب مسز ہوپکنز کے ساتھ ساحل سمندر پر بسر کریں۔ میں نہایت خوش ہوئی۔ کیونکہ میرا دل آنے والی خوشیوں اور عجیب وغریب بحری کہانیوں کے خیال سے لبریز ہو گیا۔ اس موسم گرما میں میری نہایت ہی روشن یاد سمندر کے متعلق ہے۔ میں ہمیشہ سے

اندرونِ ملک میں رہی۔ اور مجھے نمکین ہوا کی بو تک بھی میسّر نہ ہوئی تھی۔ لیکن مَیں نے ایک بڑی کتاب "ہماری دُنیا" میں سمندر کا حال پڑھا تھا۔ جس سے مجھے عظیم الشان سمندر کو چھوتے اور اس کی گرج کو محسوس کرنیکا اشتیاق اور حیرت پیدا ہو چکی تھی۔ پس جب مجھے معلوم ہُوا کہ آخر کار میری خواہش پُوری ہونے والی ہے۔ تو میرا ننّھا سا دِل شوق، مسرت اور گرمجوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ جب مجھے غُسل کا لباس پہنایا گیا۔ تو مَیں گرم ریت پر دوڑتی ہُوئی بلاخوف وہراس ٹھنڈے پانی میں کود پڑی۔ مجھے بڑی بڑی لہریں اُوپر اور نیچے کی طرف حرکت کرتی محسوس ہُوئیں پانی کا سہارا دینے والی حرکت نے مجھے لطف و مسرت سے گدگدایا اور یکایک میری وارفتگی دہشت سے تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ میرا پاؤں ایک چٹان سے ٹکرایا۔ اور لحظے بھر میں پانی میرے سر پر سے گزر گیا۔ مَیں نے اپنے ہاتھوں کو کسی سہارے کی تلاش میں پھیلایا۔ اور مَیں نے پانی اور بحری پودوں کو جنہیں لہروں نے میرے منہ پر دے مارا تھا۔ اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ لیکن میری تمام دیوانہ وار جدوجہد بے سود تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لہریں میرے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں۔ اور ایک لہر مجھے اُٹھا کر اپنے وحشیانہ کھیل میں دوسری لہر کے سپرد کئے دیتی تھی۔ یہ ایک خوفناک نظارہ تھا۔ . . . .

مضبوط زمین میرے پاؤں تلے سے نکل چکی تھی۔ اور اس عجیب اور ہمہ گیر عنصر (سمندر) سے ہر ایک چیز یعنی زندگی، ہوا، حرارت اور محبت، دور افتادہ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بالآخر سمندر نے گویا اپنے نئے کھلونے سے اکتا کر مجھے دوبارہ ساحل پر دے مارا۔ اور دوسرے ہی لحظے میں مجھے اُستانی نے بغلگیر کر لیا۔ اس طرح دیر تک محبت کے ساتھ بغلگیر ہونے کی تسکین کا کیا کہنا ہے! جب میرا ہراس دُور ہُوا اور مَیں کچھ بولنے کے قابل ہُوئی تو میرا پہلا سوال یہ تھا کہ "پانی میں نمک کس نے ملا دیا ہے؟"

پانی کے پہلے تجربے کے بعد مجھے ہوش آیا، تو مجھے ایک بڑی سی چٹان پر غسل کا لباس پہنکر بیٹھنے اور اس کے ساتھ لہروں کا یکے بعد دیگرے ساحل سے ٹکر کھانے اور چھینٹے اُڑانے میں تمام شرابور ہو گئی۔ جن سے بے حد لطف آتا تھا۔ جب لہریں اپنا بھاری بوجھ ساحل پر ڈالتی تھیں تو مجھے پتھروں کی کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ تمام ساحل ان کے خوفناک حملے سے ہل جاتا تھا۔ اور ہوا پانی کے تموّج سے متحرک ہو جاتی تھی۔ ٹکرانے والی لہریں ایک اور طاقتور چھلانگ لگانے کے لئے پیچھے ہٹتی تھیں اور جب مجھے دوڑتی ہُوئی لہروں کی ٹکّر اور گڑگڑاہٹ محسوس ہوتی تھی

تو میں چٹان کے ساتھ مضبوطی سے چمٹ کر محو تماشہ ہو جاتی تھی میں ساحل پر کافی دیر نہیں ٹھہر سکی۔ سمندر کی تازہ اور آزادی کی بے لوث ہوا کا ذائقہ ایک سرد مسکن خیال کی مانند تھا۔ اور پتھروں کے ٹکڑوں، گھونگوں اور بحری پودوں کے ساتھ چمٹی ہوئی ننھی مخلوق نے مجھے ایسا لبھایا کہ اس کے متعلق میری دلچسپی کبھی زائل نہیں ہوئی۔ ایک دن مس سلیون صاحبہ نے ایک عجیب جانور کی طرف مجھے متوجہ کیا۔ جسے اُنھوں نے پایاب پانی میں دھوپ تاپتے ہوئے پکڑا تھا۔ یہ ایک بڑا گھوڑے کی نعل سے مشابہ کیکڑا تھا۔ جسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ میں نے اسے چھوا تو مجھے ازحد تعجب ہوا۔ کہ وہ اپنا گھر اپنی پیٹھ پر اُٹھائے پھرتا ہے۔ مجھے یکایک یہ سوجھی کہ وہ ایک پُر لطف پالتو جانور بن سکتا ہے۔ پس میں اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھر لے آئی۔ مجھے اس کرتب میں بہت لطف حاصل ہوا۔

کیونکہ اس کا جسم بہت بوجھل تھا۔ اور مجھے اس کو نصف میل تک اُٹھا کر لے جانے میں اپنی تمام طاقت صرف کرنی پڑی۔ میں نے اُستانی کو دم نہ لینے دیا۔ جبتک کہ اُنھوں نے اسے کنوئیں کے نزدیک ایک چہ بچہ میں نہ ڈال دیا۔ جسے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوگیا کہ اب وہ محفوظ رہیگا۔ لیکن اگلی صبح کو جب میں اسے حوض پر دیکھنے گئی۔ تو وہ غائب تھا! کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیونکر چلا گیا۔ اس وقت تو میری ناامیدی بہت شدید تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے سمجھ آئی کہ اس غریب، بے زبان مخلوق کو اپنے عنصر سے باہر نکالنے پر مجبور کرنا قرینِ دانشمندی نہیں، بلکہ تقاضائے محبت کے خلاف ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ شاید وہ سمندر میں واپس چلا گیا ہوگا۔

(باقی پھر)

خادم محی الدین

تصحیح

اگست ۱۹۲۵ء کے ہزارداستان میں حفیظ صاحب جالندھری کی ایک غزل چھپی تھی جس میں ایک یہ شعر تھا ؎

ارادے باندھتا ہوں باندھ کر پھر توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

لیکن شعر اصل میں اس طرح تھا:۔

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
. . . . الخ

قارئین تصحیح کرلیں۔

علم ہیئت تاریخی زمانہ سے قبل

قاعدے کی بات ہے، گرمی کے موسم میں گھنگھور گھٹاؤں کا تصور جسقدر دلچسپ اور خوش آیند ہوتا ہے اسی قدر ساون بھادوں کی جھڑی اور گرد و نواح کے جل تھل کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ ستاروں کو حسن پرست شاعروں اور ماہرین نجوم کے سوا کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن اگر یہی ستارے ہزار سال میں ایک مرتبہ دکھائی دیا کرتے تو لوگ اس جگمگاتے ہوئے آسمان کو شاید فرشتوں کا شہر سمجھتے۔ اور اس مقدس منظر کی زیارت انسان کی بڑی خوش نصیبی خیال کی جاتی۔ لیکن یہ بے اعتنائی ہمیشہ ان کے ساتھ نہیں برتی گئی علم ہیئت کو اگر ابوالعلوم کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ کائنات میں اجرام فلکی ہی وہ شے ہیں۔ جس نے دنیا کے سب سے پہلے انسان کو مشاہدہ اور غور و فکر پر مجبور کیا۔

ایک زمانہ تھا جبکہ انسان علم ہیئت سے بالکل بے بہرہ تھا۔ تمام دیگر علوم کی طرح اس کی ابتدا بھی صفر سے ہوئی۔ لیکن یہ امر ہرگز قرین قیاس نہیں ہے کہ یہ صورت بہت عرصہ تک قائم رہی ہو۔ لوگوں نے آسمان میں دو بڑی روشنیاں دیکھی ہونگی۔ ایک زیادہ تیز روشنی (سورج) اور دوسری اس سے کم (چاند) ان کے علاوہ اور بہت سی روشنیاں تھیں، جن میں بعض تیز اور بعض مدھم تھیں۔ کسی کا رنگ سفید اور کسی کا زردی مائل تھا۔ اور بعض میں اچھی خاصی سرخی جھلکتی تھی۔ پس یہ امر یقینی ہے۔ کہ ایک تاروں بھری رات کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوئے ہونگے۔ کہ آخر یہ روشنیاں کیا ہیں؟ کہاں ہیں اور کتنے فاصلہ پر ہیں؟"

ان سوالات کے بہت سے جوابات دیئے گئے۔ جن میں بعض بالکل احمقانہ تھے بعض دانشمندانہ مگر غلط تھے۔ چند جوابات گو غلط تھے مگر حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے تھے۔ بہت سے دلفریب اور عجیب و غریب فسانے گھڑے گئے۔ مگر ہم کو یہاں صرف ان خیالات سے بحث ہے جنہوں نے رفتہ رفتہ حقیقت کا انکشاف کر دیا۔

سورج، چاند اور ستاروں کے مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ یہ صرف روشنیاں ہی نہیں ہیں بلکہ حرکت بھی

کرتے ہیں۔ ان کی رفتار بہت سست تھی مگر نہایت باقاعدہ، ستارے فوج کے دستوں کی طرح آگے بڑھتے تھے۔ اور کوئی اپنی صف سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے پاتا تھا۔ چاند ستاروں کے درمیان چلتا تھا۔ اور یہ اکثر اوقات دن میں بھی نظر آتا تھا۔ مگر سورج ستاروں کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ پس نتیجہ نکالا گیا کہ ستارے آفتاب کی غیر موجودگی ہی میں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک وقت آیا کہ لوگوں نے اس قیاس کے قرینِ صحت ہونے پر زور دیا۔ کہ ستارے جس طرح رات کو روشن ہوتے ہیں، اُسی طرح دن کے وقت بھی ضرور چمکتے رہتے ہیں یہ اُس زمانہ کے لئے بڑا اور اہم انکشاف تھا۔ کیونکہ یہ ایک ان دیکھی چیز کے متعلق سب سے پہلا قیاس تھا۔ لوگوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ اس کی بنا براہِ راست مشاہدۂ حواس پر نہ تھی۔ بلکہ یہ تمام تر غور و فکر اور تعقّل کا نتیجہ تھی۔ دُنیا کی کوئی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اس انکشاف کا سہرا کس کے سر ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اُس وقت سے اِنسان جب مظاہرِ قدرت پر نظر ڈالتا تھا تو وہ اُسے جسمانی آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

غرض یہ استنباط کیا گیا کہ آفتاب بھی چاند کے مانند ستاروں کے درمیان چلتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مقررہ جگہ سے کسی روشن ستارہ کو شبانہ طلوع و غروب ہوتے دیکھے تو اُس کو معلوم ہوگا کہ وہ ستارہ ہمیشہ ایک ہی مقام سے طلوع اور ایک ہی مقام پر غروب ہوتا ہے لیکن سُورج کی یہ کیفیت نہیں ہے اسکنے کو تو ہم کہتے ہیں۔ کہ سُورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں چھپتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سمت جس سے سورج موسم سرما میں طلوع ہوتا ہے مشرق سے کسی قدر جنوب کی طرف ہٹی ہُوئی ہے۔ اسی طرح موسم گرما میں شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ پس جبکہ سورج جنوب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو غروب بھی جنوب مغرب میں ہوتا ہے۔ اور دوپہر کے وقت جنوب کی طرف جُھکا ہوتا ہے۔ اس لئے زمین پر پُوری طاقت سے روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس کی مسافت دن کے دوران میں کم ہوتی ہے۔ جس سے دن رات کی بہ نسبت چھوٹے اور موسم سرد ہو جاتا ہے۔ اور جب سُورج شمال مشرق سے نکلتا ہے تو یہ تمام حالات منقلب ہو جاتے ہیں۔

پس یہ معلوم ہُوا کہ سُورج کی حرکات براہِ راست موسم کی تبدیلیوں سے متعلق ہیں لیکن ستارے بھی موسموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم سال بھر آسمان کو بغور دیکھتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ستارے جو موسمِ سرما

کی طویل راتوں کو نظر آیا کرتے ہیں۔ موسم گرما میں صرف ایک کونے میں دکھائی دیتے ہیں۔ بعض کو سرد آب و ہوا پسند ہے اور بعض گرما کے غبار آلود مطلع کو پسند کرتے ہیں۔ موسم سرما کے ستارے دیگر موسموں کے ستاروں سے زیادہ خوبصورت اور روشن ہوتے ہیں۔ ایک ہیئت داں نے خوب کہا ہے کہ قدرت ہر موقعہ پر ہمیں ایک معقول معاوضہ دیتی ہے۔ جب وہ ہمارے چھوٹے اور سرد دنوں کو تاریک بنا دیتی ہے تو ہمیں ایک خوبصورت اور روشن ستاروں سے مالامال آسمان دیتی ہے۔"

آسمان کے شمالی حصہ میں بہت سے ستارے ہیں۔ جو سال کے دوران میں ہر شب نظر آتے ہیں اگر ہم رات بھر آسمان کو بغور دیکھتے رہیں۔ تو تمام آسمان آہستہ آہستہ گردش کرتا ہوا معلوم ہوگا۔ وہ محور جس کے گرد آسمان گردش کرتا ہے۔ شمال کی جانب بہت بلندی پر ہے۔ اس لحاظ سے ستارے دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ ایک وہ جو اس غیر مرئی محور کے قریب ہیں۔ اور اپنی حرکت سے پورا دائرہ بناتے ہیں، ان میں سے بعض تھوڑی دیر کے لئے اس وقت نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ جب افق کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں دوسرے وہ جو اس محور کے گرد منحنی راستوں میں حرکت کرتے ہیں۔ یہ راستے دوائر کے مختلف حصے ہوتے ہیں۔ جن کا پورا محیط ہم نہیں دیکھ سکتے، یہ ستارے آفتاب کی طرح مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتے ہیں۔ اور کم وبیش مدت کے لئے افق کے نیچے غائب ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ ستارے ہیں، جو سال کے مختلف موقعوں پر نظر آتے ہیں۔ ستاروں کی یہ تمیز اور موسموں کے ساتھ ان کا تعلق زمین پر ہزاروں سال پیشتر معلوم کرلیا گیا تھا۔ اور اس کی طرف قدیم مذہبی کتابوں اور دیگر تحریرات میں جابجا اشارات ملتے ہیں۔

آفتاب کی مکانی تبدیلیوں نے انسانی توجہ کو نہایت قدیم زمانہ میں اپنی طرف منعطف کیا ہوگا کیونکہ ان تبدیلیوں کا تعلق موسموں سے براہِ راست ہے۔ چاند بھی سورج کی طرح اپنے مقامات تبدیل کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی انسان پر بلاواسطہ کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی۔ البتہ چاند کی مختلف شکلیں اور روشنی گھٹتے بڑھتے دیکھے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک دن شام کو افق کے قریب ایک پھانک سی نظر آئی ہوگی، اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ بلند اور روشن ہوتا ہوگا۔ آخر کار چودھویں رات کو بالکل گول ہوگیا ہوگا پھر گھٹتے گھٹتے ایک دن غائب ہوجاتا ہوگا۔ اور ۲۹ دن کے بعد پھر

اُسی جگہ نمودار ہوتا ہوگا۔ اس زمانہ میں چونکہ مصنوعی روشنی
حاصل کرنی دشوار تھی۔ لوگ اس کا بے چینی سے انتظار
کرتے ہونگے۔ دُنیا کی بہت سی قدیم زبانوں میں چاند
کے لغوی معنی "پیمائش یا اندازۂ وقت" ہیں۔ ظاہر ہے
کہ اُس زمانہ میں چاند کی مسلسل تبدیلیاں قدرت
کی کُھلی جنتری کا کام دیتی ہونگی۔

یہ قدیم فلکی مشاہدات گو سیدھے سادے
اور آسان تھے۔ لیکن اُس وقت کے لحاظ سے جب کہ
انسان علم کے مبادی اکتساب کر رہا تھا بہت قدر و قیمت
رکھتے تھے۔ دن، مہینہ اور سال اندازۂ وقت کے
بہترین ذرائع تھے۔ سُورج اور ستاروں کے مشاہدہ
سے یہ معلوم کرنا کہ سال کا کتنا حصّہ گزر چکا ہے کسانوں
کے لئے بے انتہا ضروری تھا۔ کیونکہ انہیں اپنے کھیت
بونے جوتنے کی فکر رہتی تھی۔ یہ مشاہدات یقیناً مختلف
مقامات پر مختلف قوموں نے آزاد نہ کئے، اور بعد کو
ایک جگہ ترقی ہوگئی۔ سُورج اور چاند کے شناخت کرنے
میں تو کوئی دقّت نہیں پیش آتی لیکن ستارے تقریباً
سب، ایک ہی سانچہ میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔ ان کو
ایک دوسرے سے تمیز کیا گیا۔ پس تمام ستارے
بروج میں تقسیم کئے گئے۔ اور شناخت کے لئے ان
کی عجیب اور انوکھی شکلیں مقرر کی گئیں۔ ان میں سے
بارہ بروج ایک خاص ترتیب کے ساتھ تعین کئے
جن سے سُورج کا سال بھر کا راستہ معلوم ہوتا تھا۔ باقی
آسمان کو تقریباً ۳۶ برجوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن میں
"دب اکبر" سب سے بڑا اور روشن تھا۔ یہ شمالی
آسمان میں ہے۔ اور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔
بُرجوں کی شناخت کے لئے دب اکبر کو آسمان کی
کُنجی کہنا چاہئے۔ کیونکہ ہر شخص جو سرسری طور سے آسمان
کو دیکھے اُس سے ضرور دو چار ہوگا۔

تقسیم بروج علمِ ہیئت میں ترقی کا پہلا قدم
تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ پہلا قدم کہاں اور کب
اُٹھایا گیا۔ مصری، کلدانی، چینی اور ہندی غرض متعدد
قومیں اس افتخار کا دعویٰ رکھتی ہیں۔ لیکن تاریخ عالم
اس بارہ میں خاموش ہے۔ اس متنازعہ فیہ مبحث کا
جواب خود ان ستاروں نے دیا ہے۔ اور جواب بھی ایسا
دیا ہے کہ سب کو خاموش کر دیا۔ یہ قدیم بروج تمام
آسمان پر محیط نہیں ہیں بلکہ جنوبی آسمان کا ایک بہت
بڑا رقبہ ان کی حدود سے خارج ہے۔ یہ جنوبی طبقہ
تقریباً ۴۰۰۰ سال پیشتر ۴۰ درجہ شمالی عرض بلد پر
افق سے نیچے تھا۔ اس لئے یقینی ہے کہ وہ قدیم
ہیئت دان جنھوں نے مہتم بالشان کام (تقسیم بروج)
انجام دیا۔ ۲۷۰۰ سال قبل مسیح کے لوگ تھے۔ اور

تقریباً ۳۰ درجہ عرض بلد شمالی پر رہتے تھے۔

قدیم زمانہ کا ایک اور انکشاف جس کا مکتشف اور زمانہ دونوں تاریکی میں ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ تمام مشرقی افق پر، شمال سے جنوب تک، سیارے طلوع ہوتے ہیں اور مغربی افق کے ساتھ ساتھ شمال سے جنوب تک غروب ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات میں کہیں کوئی مزاحمت نہیں ہے۔ یعنی زمین کے نیچے بھی کوئی چیز ان کے راستہ میں حائل نہیں ہے۔ پس اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا۔ کہ زمین خلا میں معلق ہے۔

عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ناموں میں کیا رکھا ہے؟ یہ اعتراض ہیئت میں بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نام کیسے کثیر فایدے کے حامل ہیں۔ مثلاً جب ہم کو کسی ستارے یا سیارے کا نام معلوم ہو جاتا ہے تو اُس سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہیئت دان نے خوب کہا ہے کہ ستارے معلوم کرنے کا کام ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ وُہ خاموش مخلوق جو آسمان کے پردے میں سے ہمیں شب و روز دیکھتی ہے۔ ہم سے ایک رشتہ میں مربوط ہو جاتی ہے۔ اور کسی شخص کا اس طریقہ پر غور کرنا جو قدرت کے اوّلین طالبانِ علم اختیار کر چکے ہیں عجیب لطف رکھتا ہے۔"

ستاروں کے اس باقاعدہ مشاہدہ کا نتیجہ ایک بہت بڑے انکشاف کی صورت میں ظاہر ہُوا یعنی معلوم ہُوا کہ ان ستاروں میں سے پانچ سیارے ہیں جو ان آسمانی مسافروں کے ساتھ باقاعدہ نہیں چلتے یہ حرکات میں سُورج اور چاند سے مشابہ تھے۔ اور موخرالذکر سے تو بہت ہی ملتے جُلتے تھے۔ اگرچہ فرق بہت خفیف تھا مگر ان کی روشنی میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ اور دیگر اجسام فلکی کی نسبت ان کی حرکات بہت پیچیدہ تھیں۔ یہ پانچوں سیلانی کبھی تو ستاروں کی بہ نسبت سستی سے چلتے تھے کبھی تیزی سے، اور کبھی ان کے قدم بقدم۔ ان میں سے دو جن کو ہم عطارد اور زہرہ کہتے ہیں۔ سُورج سے کچھ زیادہ دُور نہیں جاتے، کبھی وہ مشرق میں طلوعِ آفتاب سے قبل اور کبھی مغرب میں غروب آفتاب کے بعد دکھائی دیتے ہیں۔ عطارد سورج سے قریب ہے۔ اور زیادہ تیزی سے حرکت کرتا ہے زہرہ کی روشنی میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ بھی سورج سے بہت دُور نہیں جاتا۔ لیکن مریخ مشتری اور زحل کی رفتار بہت بے قاعدہ تھی۔ خصوصاً مریخ نے ان قدیم ہیئت دانوں کو بہت پریشان کیا۔ یہ سیارہ کبھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کبھی ایک مقام پر رُک کر پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد

پھر آگے بڑھنے لگتا، یہ ایک معما تھا جو کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتا تھا!

سیّاروں کی یہ باقاعدہ حرکات اور رجعت قہقری سُورج، چاند اور دیگر ستاروں کے مانند انسان پر براہ راست کوئی اثر نہیں ڈالتی تھیں۔ لوگوں کے لئے یہ معلوم کرنا نہایت ضروری تھا کہ انہیں چاندنی راتیں کب میسّر آئیں گی۔ اسی طرح موسموں کے انتظار میں بھی دن گنا کرتے تھے۔ لیکن زہرہ کی روشنی گھٹنے بڑھنے یا اُس کے غائب ہو جانے سے ان کو ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ باوصف اس کے سیاروں کا مشاہدہ استقلال کے ساتھ جاری رہا۔ یہ کام زیادہ صبر آزما تھا۔ مگر لوگ ان کی پیچیدہ اور عجیب حرکات کا راز معلوم کرنے پر اڑ گئے۔

اس سے قبل جسقدر معلومات ہوتیں، یہ اُن سب سے اعلےٰ تھی۔ کیونکہ لوگ اپنا وقت، محنت اور مسلسل فکر اُن امور پر صرف کرتے رہے۔ جن سے اُن کو کسی مادی فایدہ کی توقع نہ تھی۔ لیکن اس سے جو حقیقی منفعت ان کو حاصل ہوئی، وہ اپنی نوعیت میں نہایت ارفع و اعلےٰ تھی۔ اس نے انسان کے دماغی قویٰ کو ترقی دی۔ آلات مشاہدہ کے ایجاد کی راہیں سجھائیں، ریاضی کی بُنیاد رکھی۔ جس پر آخرکار جدید علم جرثقیل کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی، اور انسان باقاعدہ مشاہدہ اور استخراج کا عادی ہُوا۔

غلام ربانی

(اورنگ آباد دکن)

مٹ کے اُلفت میں تری مجھ کو ملا لطف حیات
کس قدر موت کا شرمندۂ احساں ہوں میں

لاکھوں خوں کردہ امیدوں کا مزارِ دل ہے مرا
عمر بھر دل سے نہ نکلا جو وہ ارماں ہوں میں

ظلمتِ شب میں فلک سے یہ ندا آتی ہے
غمزدوں کے دل بیتاب میں پنہاں ہوں میں

برق

یہ انتظام کروں اپنی داستاں کے لئے
زبان اپنی میں قاصد کو دوں بیاں کے لئے

بہار آتے ہی شاید یہ پھر ہرے ہو جائیں
میں رکھ لوں خار اُٹھا کر کچھ آشیاں کے لئے

شامی

"میری داستانِ حیات" کی مصنّفہ کی شخصیت اور طریقۂ تصنیف[1]

کتاب کیونکر تصنیف کی گئی

اصل نسخہ کے ایڈیٹر مسٹر جان البرٹ میکی نے جو مصنّفہ کی اُستانی کے خاوند ہیں۔ اپنی طرف سے تمہید میں اس امر کی تصدیق کی ہے۔ کہ کتاب ہذا مصنّفہ نے خود تصنیف کی اور اپنے ہاتھوں سے لکھی۔ بادی النظر میں ناظرین کو شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی مخلوق نے، جو دیکھنے سُننے اور بولنے سے معذور ہے، تعلیمی ایجادوں اور طریقوں کی مدد سے سکول اور کالج کا کورس تو پُورا کر لیا۔ لیکن اس میں یہ قدرت کہاں سے پیدا ہو گئی کہ وہ کتاب بھی تصنیف کر سکے لیکن اگر اس کے علم حاصل کرنے کے طریقوں اور اس کی کامیابی پر غور کیا جائے تو اس کے لئے ایک کتاب کا لکھ ڈالنا بھی چنداں مشکل کام معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کام میں مصنّفہ کو خاص دقّتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بینا اشخاص کے لئے بھی یہ کام بہت زیادہ مشکلات و مصائب سے مملو ہے۔ ہنگام تصنیف مصنفین کی عام حالت یہ ہوتی ہے کہ جب بینا اشخاص کوئی تحریر لکھتے ہیں، کبھی وہ اپنے مضامین کے اوراق کو اُلٹ پلٹ کر پڑھتے ہیں۔ کہیں صفحات کو مرتب کرتے ہیں۔ کہیں عبارت کو خط کشیدہ کرتے اور پروف دیکھتے ہیں۔ غرضکہ تمام تصنیف کو ایک معمار کی طرح جو مکان کا نقشہ تیار کر کے اس کے بموجب کام شروع کرتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک مرتب کرتے جاتے ہیں۔ لیکن مس کیلر جیسی معذور ہستی جو پروف پڑھنے اعادہ کرنے، ردوبدل اور اصلاح و ترمیم غرضکہ ہر ایک قدم پر دوسرے شخص کی رہنمائی کی محتاج ہے اس دشوار گزار مرحلے سے کیونکر بعافیت پار ہو سکی؛ واقعہ

[1] "میری داستانِ حیات" کے دیباچہ سے ماخوذ۔

یہ ہے کہ مصنّفہ نے ابتداً کتاب کا کچھ حصّہ اپنی بریل کے ذریعے لکھا۔ اس کا ذکر سرگزشت میں اشارۃً آ چکا ہے لیکن اس طرز تحریر نے الجھن پیدا کی۔ اور علاوہ ازیں اس کے بعض نوٹ اور یادداشتیں کتاب کا ایک سو صفحہ لکھنے کے بعد مصنّفہ کی اپنی فروگزاشت اور غفلت سے ضائع ہو گئیں اس لئے اس نے کتاب کا ایک کثیر حصّہ اپنی خاص ٹائپ کی مشین پر لکھ کر تیار کر لیا۔ دوران تحریر میں اگرچہ مصنّفہ کی اُستانی مس سلیون صاحبہ نے مختلف امور نکات اور عبارات میں تصحیح اعادہ اور اصلاح کا کام انجام دیا۔ تاہم اصل کتاب مُصنّفہ ہی کے دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کسی اور شخص کا مطلق دخل نہیں۔

ہیلن کیلر کی شخصیت

مسٹر ریکی لکھتے ہیں کہ مس کیلر ایک بلند قامت، قوی الجثہ اور تندرست عورت ہے۔ اظہارِ خیالات کے دوران میں بہروں کی مانند اشارات سے بہت مدد لیتی ہے۔ تقریر کرتے وقت اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے مس کیلر کی قوت حافظہ بلا کی ہے اور وہ لوگوں کے ہاتھ اور اُنگلیوں کو ٹٹول کر فوراً انہیں شناخت کر لیتی ہے۔ اس کا ایک خاص وصف ظرافتِ طبع بھی ہے۔ مہذب لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں خوب مشاق ہے۔ لطیفہ۔ ایک دفعہ کسی نے مس کیلر سے پُوچھا۔ "کیا آپ مطالعہ کو پسند کرتی ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "ہاں لیکن مجھے کھیل بھی بہت بھاتا ہے۔ بعض اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں باجے کا ایک ایسا بکس ہوں جس میں بہت سے کھیل، اور بہت سے راگ پوشیدہ ہوں۔"

لطیفہ:۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر فرینس نے، جو شیکسپیر کے عالم ہیں مس کیلر سے ملاقات کرتے ہوئے کہا کہ "کالج کے پروفیسر تم کو شیکسپیر کے متعلق بہت سی دُور از کار باتیں بتائینگے۔ تم ان کی طرف متوجہ مت ہونا۔ ہمیں شیکسپیر کے متعلق اس سے زیادہ کوئی صحیح علم نہیں ہے کہ وہ پیدا ہوا اس نے شادی کی اور وفات پائی" اس پر مس کیلر نے جوابدیا "پھر تو اس نے زندگی کے تمام ضروری کام انجام دیدیئے۔"

لطیفہ:۔ ایک دفعہ مس کیلر ایک رفیق کو دستی حروف تہجّی کے استعمال کی مشق کرا رہی تھیں۔ وہ بار بار حرف "ج" (جی) کی علامت کی مشق ان کے ہاتھ پر کر رہا تھا۔ یہ علامت انگشت شہادت کو آگے بڑھا کر اور دوسری اُنگلیوں کو سمیٹ کر بنائی جاتی ہے۔ جس طرح ہم کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے وقت اپنے ہاتھ کی انگلی باہر نکال لیتے ہیں یا جیسے راستہ کا نشان کسی سڑک پر ہاتھ کی شکل سے بنایا جاتا ہے۔ "اب" (ایچ) کی علامت تھی

اس طرح ظاہر کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ اس میں
انگشتِ شہادت کے علاوہ درمیانی انگلی بھی شامل کی
جاتی ہے۔ جب مس کیلر اپنے ہاتھ پر ایک ہی حرف یعنی
"G" (جی) کے احساس سے اکتا گئیں، تو انھوں نے
اپنے رفیق سے اگلا حرف "H" (ایچ) کی علامت
ظاہر کرنے کے لئے یہ الفاظ کہے۔ "کبھی اب بندوق
کی دونوں نالیاں چلا ڈالو نا"

لطیفہ۔ ایک دفعہ مسٹر جیفرسن، مس کیلر کے سر کو ٹٹول
ٹٹول کر اس کے ابھاروں کی تشریح از روئے سائنس
کر رہے تھے۔ ایک ابھار پر ان کا ہاتھ جو ٹھہرا۔ تو انھوں
نے دل لگی کی غرض سے یہ فقرہ چست کیا "مس کیلر!
کیا یہ تمہارا انعام جیتنے کے لئے جنگ کرنے کا ابھار ہے"
اس نے جواب دیا۔ "جناب میں کبھی کسی سے لڑائی نہیں
کرتی۔ البتہ مشکلات کے ساتھ میری جنگ ہمیشہ چلی
جاتی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مس کیلر کی ظرافت
ایک گہری قسم کی ہے۔ جیسے شجاعت کہیں تو بے جا
نہیں۔ کیونکہ اس کی تمام زندگی مشکلات پر غالب آنے
اور ان کاموں میں صرف ہوئی ہے۔ جو دوسرے لوگ
کر سکتے ہیں۔ وہ کسی مشکل سے ہار جانے پر تو رضامند
ہو ہی نہیں سکتی۔ الوالعزمی اور خطرات کا مقابلہ اس کی

طبیعت کا جزو ہے۔ مجلس میں مس کیلر اس کا جزو ہو کر
رہنا چاہتی ہے نہ کہ اس سے الگ تھلگ۔ اگر کوئی شخص
دوسرے سے مذاق کرے تو وہ بھی حتی الوسع اس میں
شریک ہوتی ہے۔ وہ موسیقی کا حظ دوسروں کی طرح
اُٹھانا چاہتی ہے۔ چونکہ اس کی قوتِ لامسہ بے حد تیز
ہے۔ اس لئے وہ آواز کے تموج کے ذریعے سے
راگ کا لطف اُٹھا سکتی ہے۔ یہ اس طرح کہ وہ گویے
کے حلق یا پیانو باجے پر اپنا ہاتھ رکھ کر گلے کے عضلاتی
تشنج اور لکڑی کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر لیتی ہے۔
مجلس میں روزمرہ میل جول سے کچھ نہ کچھ اخذ کر لیتی ہے
لیکن وہ بہت سی اشیاء کا علم بلا واسطہ بھی حاصل کرتی
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے تذکرے بہت سی
حد تک مبالغہ آمیز ہوتے ہیں۔ تاہم ان میں روشن خیالی
کی جھلک پائی جاتی ہے۔

قوتِ لامسہ کے علاوہ جس کی مدد سے وہ
کشیدہ کاری اور کروشیا تک کر لیتی ہے۔ مس کیلر کے
دوسرے حواس بھی ترقی یافتہ ہیں۔ اگرچہ اس کی سمت
دریافت کرنے کی حس کافی تیز نہیں۔ وہ دستی حروف تہجی
کے استعمال سے اُبھرے ہوئے حروف کی کتب کا مطالعہ
کرتی رہتی ہے۔ اندھوں کے لئے نہایت سہولیت کی
مطبوعات بریل کی ہیں۔ اس طرزِ تحریر کی کئی اقسام ہیں

یعنی انگریزی، امریکن، نیویارک وغیرہ مس کیلر ان سب کے
ذریعے نوشت وخواند کرسکتی ہے۔ ان میں انگریزی بریل۔
بہترین اور آرام دہ ہے۔ ذیل کے نمونے سے اس
طرزِ تحریر کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

the | left | g

- h ouse | w e l l

to l (ea) r n | ea ger

(ترجمہ) "میں کنوئیں والے مکان سے علم حاصل
کرنے کے اشتیاق میں روانہ ہوئی۔"

اس تحریر میں ہر انگریزی حرف کے لئے ایک
جداگانہ نشان مقرر ہے۔ ہر حرف یا حروف کا مختصر
مرکب علامات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جو کسی موٹے
کاغذ یا مقوے کے آر پار ایک موٹے سوزن نما اوزار
سے بنایا جاتا ہے۔ کاغذ کی دوسری طرف ابھرے ہوئے
شفاف نقطے بنتے جاتے ہیں۔ جو انگشت گردی کے
ذریعے پڑھے جاتے ہیں۔ مس کیلر کے ہاں ایک سلیٹ
کی طرح کا چوکھٹا بنا ہوا ہے۔ اس میں کاغذ لگا لیا جاتا
ہے۔ چوکھٹے کے ایک سرے پر ہارمونیم کے سروں کی
کمانیوں کی طرح چھ مختلف چابیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان
میں یہ سہولت ہے کہ مختلف سوراخوں کے مجموعوں کو
جو ہر ایک چابی کے سرے پر بنے ہوتے ہیں، ایک
ہی ضرب سے لکھ سکتے ہیں۔ اور حسب معمول مختلف
حروف کو ملا کر الفاظ بناتے جاتے ہیں۔ یہ "چوکھٹا" یا
"طرزِ تحریر" اس کے موجد مسٹر بریل کے نام سے موسوم ہے
مذکورہ بالا نمونے میں ہم نے ہر لفظ کے ارد گرد ایک
مستطیل اس لئے بنا دیا ہے۔ تاکہ ان مرکبات کی
صورت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ نابینا لوگوں کے لئے کتابیں
ہوتی ہیں۔ جو خاص طور پر ابھرے ہوئے حروف میں
تیار کرائی جاتی ہیں۔ اس قسم کی کتب پر زرِ کثیر صرف کیا
جاتا ہے۔ یہ خرچ یا تو خاص خاص معطی ادا کرتے ہیں۔
جنہیں نابیناؤں کی تعلیم میں دلچسپی ہوتی ہے۔ یا بعض
کمیٹیاں امریکہ میں موجود ہیں۔ جو اپنے ہاں یہ فنڈ رکھتی
ہیں۔ خوش قسمتی سے مس کیلر کو اپنی تعلیم کے دوران میں
اس قسم کی مالی دقتوں کا سامنا مطلق نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے
کہ اس کی پڑھائی کی رفتار دوسرے اندھوں کے مقابلے میں

نسبتاً بہت سست ہے۔ اس کی عادت ہے کہ پڑھتے وقت بہت آہستہ آہستہ انگلی پھراتی ہے۔ کیونکہ وہ اطمینان کے ساتھ اس عمل کے دوران میں بہت غور و فکر کرتی ہے اس کی قوتِ حافظہ میں بھی قوت لامسہ کی مدد سے کسی آواز یا نظارے کی یاد کی بجائے چھوٹی ہوئی اشیاء کی یاد کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کی قوت شامہ اسقدر تیز ہے کہ وہ اسی کی مدد سے مختلف اشخاص اور اشیاء کو پہچان لیتی ہے۔ وہ وقت کا اندازہ بھی بخوبی کرسکتی ہے۔ کیونکہ سات سال کی عمر سے وہ اپنے پاس گھڑی رکھتی ہے۔ اور اب تو اس کے پاس دو گھڑیاں رہتی ہیں۔ ایک عام اور دوسری خاص قسم کی ہے۔ جو امریکہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی پشت پر ایک چپٹی سنہری سوئی لگی ہوئی ہے۔ جسے بائیں سے دائیں طرف گھما کر ایک پن کے ذریعے گھنٹے کی سوئی کے ساتھ اٹکا سکتے ہیں۔ اس طریق سے یہ چپٹی سوئی وہی نشان اختیار کرلیتی ہے۔ جس پر گھنٹے کی سوئی ہو۔ اسوقت چپٹی سنہری سوئی کا سرا کیس کے کنارے پر کے بنائے ہوئے گھنٹوں کے نشانات پر مڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور انگلی سے ٹٹول پر وقت معلوم ہو جاتا ہے۔ یہی گھڑی دیکھنے والے کے لئے عام گھڑیوں کی مانند ہے لیکن صرف ایک زائد پرزے کی مدد سے نابینا مس کیلر کے حق میں ویسی ہی کارآمد شے بن گئی ہے جیسی عام اشخاص کے لئے وہ اس کی مدد سے بالکل صحیح وقت بتا سکتی ہے۔ مس کیلر کی سیرت کے نفیس پہلوؤں میں سے پاکیزگی نفس خوش مذاقی خوش طبعی اور تخیّل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسٹر وارنر نے (جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے) ہارپر میگزین میں تذکرۂ مس کیلر کے متعلق مفصلہ ذیل رائے تحریر کی تھی:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ نفس کی پاکیزگی کا ایک بہترین مجسمہ ہے۔ وہ دنیا کو اپنی پاک سرشت کی روشنی میں پاک ہی دیکھتی ہے۔ اس میں بدی کی نسبت نیکی کا بہت زیادہ علم ہے۔ ایک دفعہ کسی پولیس والے نے اس کے کتے کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ مس کیلر کو اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا۔ تو اس نے کہا۔ "اگر اس سپاہی کو یہ علم ہوتا کہ میرا کتا کتنا نیک ہے، تو وہ اسے کبھی نہ مارتا۔"

"مس کیلر کو شریفانہ جذبات اور شریف آدمیوں سے دلی اُنس ہے۔"

مس سلیون اپنے ایک خط میں بیان کرتی ہیں کہ "ایک دفعہ میں نے مس کیلر کو شیکسپیئر کا ناٹک میکبتھ قصّے کی صورت میں (جیسا کہ چارلس لیمب نے لکھا ہے) پڑھ کر سنایا۔ جس سے اس میں اس قدر ہیجان پیدا ہوا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "اُف!

یہ کیسی ہولناک داستان ہے! میرے تو بدن میں اس سے کپکپی پیدا ہونے لگی۔ شاید شیکسپیر نے یہ بھیانک قصّہ اس لئے لکھا ہے۔ کہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو۔ اور وہ بُرائی سے باز آئیں۔"

مس کیلر کی سرشت فیاضی، ہمدردی، عدل پسندی رسومات سے نفرت اور اور خصائص حسنہ سے مالامال ہے۔ وہ ایک کامل روشن نظر خاتون ہے۔ اور مایوسی کبھی اس کے نزدیک نہیں پھٹکتی۔ جس زمانے میں وہ رائٹ ہیومیسن اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اس نے اپنے روزنامچہ مورخہ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۹۶ء میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے:۔

"مجھے یہاں کی متعلمانہ زندگی میں چار چیزیں حاصل کرنا ہیں۔ بلکہ اپنی زندگی میں بھی یہی باتیں سیکھنا ہیں۔

(۱) جلد بازی اور گھبراہٹ کو بالائے طاق رکھ کر ہر شے کے متعلق صاف صاف غور وفکر کرنا۔

(۲) ہر شخص کے ساتھ خلوص دلی سے انس رکھنا۔

(۳) ہر کام کو بہترین منشا اور نیت کے ساتھ انجام دینا۔

(۴) خدائے عزیز و برتر پر بلا تامل بھروسہ کرنا۔

محمد اقبال

افکارِ خلیل

کعبہ نہیں آتا کہ کلیسا نہیں آتا　　راہِ طلبِ شوق میں کیا کیا نہیں آتا

مَیں تیرگیِ ہجر کا خوگر سہی لیکن　　کیا تیری تجلّی کو برسنا نہیں آتا

صد میکدہ در بر ہیں خلیل ان کی نگاہیں
لیکن مجھے اِک جام بھی دینا نہیں آتا

خلیل

حسیات عابد

(۱)

حسنِ شیریں ادا کسی کا　　پیکر ہے فروغ دلکشی کا
اُس رشکِ بہار کا تبسّم　　نقشہ ہے کھلی ہوئی کلی کا
اُس میکدۂ نگاہ کا حُسن　　عالم ہے بہار کی ہنسی کا
کیا بات ہے اس کی دلکشی کی　　اک حشر بپا ہے دلبری کا
تصویر ہے وہ شگفتگی کی　　گلزار کھلا ہے تازگی کا
بیتابیٔ غم کی بیکسی دیکھ　　انجام نہ پوچھ عاشقی کا
اک روزِ وصال عمر بھر ہجر　　یہ رنگ ہے میری زندگی کا
عاشق کے کنار میں نہیں دل　　اک جام بھرا ہے بیخودی کا

نقشہ ہے غزل یہ میری عابد
صہبائیؔ کے رنگِ شاعری کا[1]

---

(۲)

زمانِ وصلِ یار آیا دفا بر روئے کار آئی　　بہار آئی چمن زارِ محبّت پر بہار آئی
تصوّر میں کسی کے حسن کا نقشہ اُتر آنا　　وُہ عالم تھا کہ میری رُوح کو خوشبوئے یار آئی
محبت میں جب آیا آہ دردِ انتظار آیا　　نہ روزِ شادماں آیا نہ شام کامگار آئی

عابد

---

[1] مکرمی اثر صہبائی

تنقید و تبصرہ

دکن میں اُردو یعنی جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی۔ مؤلفہ نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل

آزاد مرحوم نے ولی دکنی کو جن کی تاریخ ولادت ۱۰۸۰ھ ہجری اور تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ ہجری ہے۔ اُردو کا ابو الآبائے شاعری قرار دیا تھا۔ جدید انکشافات اس فیصلے کی تردید کرتے ہیں۔ اور ولی کی بجائے اُس سے بہت پہلے کے ایک شخص وجدی دکنی کے سر اولیت کا سہرا باندھتے ہیں۔ جس نے ۱۰۸۰ھ ہجری میں ایک مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کے نام سے لکھی۔ بہر حال جو نتیجہ آزاد کے دعوے سے مترتب ہوتا تھا یعنی نظمِ اُردو دکن میں پیدا ہوئی۔ وہ آج بھی بدستور قائم ہے۔ خواہ ولی اُردو کا پہلا شاعر ہو، خواہ وجدی، اس سے اس قول کی صداقت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کہ نظمِ اُردو کا ظہور پہلے پہل دکن میں ہوا، اور چونکہ یہ مسلمات سے ہے کہ ہر زبان کی ابتدا نظم سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہم با دنے تغیر الفاظ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کا مولد و منشا دکن ہے۔

آزاد نے آبِ حیات میں یہ امر بالتصریح نہیں بیان کیا۔ انہوں نے صرف اتنا کہنا کافی سمجھا، کہ ولی عہد محمد شاہی میں ترکِ وطن کر کے دلی آئے۔ اور اپنے ساتھ ایک دیوان لائے۔ اس سے انہوں نے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ شاید انہوں نے یہ سوچ کر کہ ابھی اُردو کی نسبت تحقیق و تدقیق ابتدائی مدارج میں ہے کوئی حکم لگانے سے احتراز کیا ہو۔ بہر حال یہ امر کہ ولی دلی آنے سے پیشتر ایک دیوان ترتیب دے چکے تھے۔ جو آزاد کے نزدیک نظمِ اُردو کے میدان میں پہلا کارنامہ ہے۔ اس بات پر صریحاً دلالت کرتا ہے کہ نظمِ اردو کی بنیاد دکن میں پڑی۔ اور جدید تحقیقات سے اس کی بہت حد تک تائید ہوتی ہے۔ بلکہ نظم ہی پر کیا منحصر ہے۔ خود زبانِ اردو کی اصل کی نسبت یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جس طرح آجکل اُردو کا مرکز وسطِ ہند سے بتدریج جنوبی ہند میں منتقل ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایک زمانے میں اُس نے جنوبی ہند میں پیدا ہو کر اور اپنی نشو و نما کے ابتدائی مدارج طے کر کے رفتہ رفتہ شمال کیجانب رُخ کیا۔

گزشتہ چند سال کے عرصے میں مندرجہ بالا امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے مختلف رسالوں

میں مضامین نکلتے رہے ہیں، جن میں سے اکثر ایسی معلومات سے پُر ہیں۔ جن سے عام لوگ ہنوز بے بہرہ ہیں نصیرالدین صاحب ہاشمی کی یہ کاوش شکریے کی مستحق ہے کہ انہوں نے اس شیرازۂ پریشاں کو مجتمع کر کے ایک مدلل اور منضبط پیرائے میں بیان کیا امید ہے اس سے اُردو کی اصل کی نسبت بہت سی غلط فہمیاں جو عوام میں رائج ہیں۔ رفع ہو جائینگی۔ مثلاً یہ کہ اُردو عساکر شاہجہانی کے خیموں میں پیدا ہوئی۔ اور اُس کا مرکز ہمیشہ سے دلّی میں چلا آیا ہے۔

آزاد مرحوم نے یوں تو آبحیات کی تمہید میں اُردو کے عناصر ترکیبی کو جُدا جُدا بیان کیا، اور جس طریقے سے آج سے صدیوں پہلے ان عناصر کا امتزاج ہُوا، اُس کو بھی ایسے طور سے واضح کر دیا کہ اُس کے متعلق شک وشبہ یا غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اُن کی یہ بات کہ اُردو نے اپنی موجودہ صورت شاہجہان کے عہد میں اختیار کرنا شروع کی۔ تازہ انکشافات کی رُو سے خلافِ واقعہ تھی۔ اُسے تسلیم کر لیا جائے، تو بہت سے نام جو متقدمینِ اُردو کی فہرست میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، خارج از بحث ہو جاتے ہیں۔

ہاشمی صاحب نے جن الفاظ میں اُردو کی ابتدا بیان کی ہے۔ ہم اُن کا ملخص ذیل میں درج کرتے ہیں :-

"تیمور کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی۔ جسے دکھنی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (یہی دکھنی ۔ زبان مؤلف کی تحقیق کے مطابق اُردو کی اصل ہے) .... جو نتیجہ آپس کے میل جول سے شمالی ہند میں رونما ہُوا اُس کا اثر رفتہ رفتہ جنوبی ہند میں بھی ہوتا گیا۔ جب دکن میں پہلے پہل اسلامی سلطنتِ بہمنیہ قائم ہوئی، تو چونکہ اس خاندان کا بانی حسن تورانی النسل تھا۔ اور اس کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لئے یہاں کی سرکاری زبان فارسی قرار دی گئی۔ لیکن عام طور پر اُردو خانگی زبان کے طور پر مستعمل تھی .... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکھنی یا اُردو کا آغاز شاہجہان کے دور کی یادگار نہیں، بلکہ اس کے بہت پہلے اس کی ابتدا ہو چکی تھی .... جب دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ شکست ہو کر بیجا پور، گولکنڈہ اور احمد نگر وغیرہ میں سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ تو یہاں اُردو کو اور زیادہ ترقی نصیب ہوئی ...... ابراہیم عادل شاہ متوفی

۹۶۵ھ کے زمانے میں شاہی دفتر فارسی سے
دکھنی زبان میں آگیا۔ آخر کچھ دنوں بعد عام زبان
ہونے کا شرف حاصل کر لینے کے علاوہ اہل علم
ادب کے اظہار خیالات کا آلہ بھی بنی۔۔۔۔۔۔
مولانا محمد حسین آزاد نے ولی کو شاعری کا آدم
قرار دیا تھا۔ اب مزید معلومات کی بنا پر سلطان
محمد قلی کو پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ جس کا کلیات
۱۰۲۵ھ ہجری کا مرتبہ ہے۔ لیکن خود اس
کلیات سے اس امر کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ
اُردو کا بالکل ابتدائی کلام نہیں ہے۔ ہمارے
نزدیک وجدی اس سے پہلا شاعر ہے۔۔۔۔
کلام کا نمونہ (مثنوی تحفۂ عاشقاں میں سے)
درج کیا جاتا ہے:- ؎

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں
ثنا پاک اس عاشق پاک سوں
کہ جس سے ہوا ہے اوگم عشق کا
اجوں لگ ابلتا ہے خم عشق کا
پڑیا عکس اس نور کا جس رخن
جھلکنے لگا آرسی کے نمن"

اس کے بعد سلطان محمد قلی کے کلیات مرتبہ ۱۰۲۵ھ
کا اور اُن کے بعض معاصرین کے دستیاب شدہ کلام کا انتخاب
پیش کیا ہے مثلاً ؎

"پیا باج پیالا پیا جاتے نا
پیا باج یک تل جیا جاتے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے
کدھیں اس سے مل بیسیا جاتے نا
قطب شاہ نہ دے مُجھ دوانے کو پند
دوانے کو کُچھ پند دیا جاتے نا

چند ہور سکندر چلیا رین کے ظلمات میں
شمع دیپک مشعلاں روشن ہوتے اثار
نثر کی ابتدا بالفاظ ذیل بیان کرتے ہیں:-
مولانا آزاد نے آبحیات میں تصریح کی ہے
کہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ میں ایک بزرگ
تھے جن کا تخلص فضلی تھا۔ وہ مجلس نام ایک
کتاب لکھی تھی۔ غالباً یہی اُردو کی پہلی تصنیف[۱]
ہوگی ۔۔۔۔۔۔ لیکن جس طرح ولی کے بہت
پہلے شاعری کا وجود اور کلیات اور دیوان ستیاب
ہو کر مولانا کی تحقیق کو غلط ثابت کر چکے ہیں اسی
طرح ایک صدی پہلے کی نثر کا پتہ چل چکا ہے
۔۔۔۔۔ چنانچہ عہد قطب شاہی کی ایک کتاب
احکام الصلوٰۃ ہے (۱۰۳۲ کی مرتبہ ہے)۔۔۔۔

[۱] یعنی نثر کی تصنیف۔ "ہ"

نمونہ کی عبارت حسب ذیل ہے :۔

"........ بات کرنے سوں نماز جاتا ہے
نماز میں آدمیوں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا
ہے۔ ہی داہ کینے سوں نماز جاتا ہے۔ دردسوں
یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے سوں یا
دنیا نگی مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں
کسی کی موت کی خبر سُنکر قالوا انا للہ وانا الیہ
راجعون۔ بولتی سوں نماز جاتا ہے ....."

ایک اور کتاب مفتاح الخیرات نام ہے .....
(اُس میں سے نمونہ درج ہے :۔

"ایمان کی حکماں کا معرفت ہور نماز
احکام ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمانان پر فرض
ہے۔ کہ سب کوں اس کی پچھان نے چھٹکارا
ہے ہور۔ آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار
ہونا ہوویگا ......"

ان نمونوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ
اس وقت تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تھا۔
یائے معروف و مجہول کا فرق نہ تھا۔ اور کے
بجائے ہور، سے کے بجائے سوں، مُنہ کے
بجائے مکھ، کو کے بجائے کوں وغیرہ الفاظ
استعمال کیے جاتے تھے۔"

طوالت کے خوف سے ہم تغیر و انقلاب
کے درمیانی مدارج کو جن میں سے اُردو کی نظم و نثر موجودہ
صورت اختیار کرنے سے پیشتر گزری، حذف کرتے ہیں
اور مذکورۃ الصدر دور کے دو سال بعد کے چند مصنفین کی
نظم و نثر کا نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ
اس عرصے میں اُردو کی کیسی قلب ماہیت ہو چکی تھی۔

مولانا باقر آگاہ جن کی تاریخ وفات ۱۲۲۰ھ
ہے۔ اور جو نظم و نثر دونوں شعبوں میں متعدد تصانیف
کے مالک ہیں۔ اُن کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔ ۵

ناتوانی سے یہ عالم ہے ترے رنجور کا
ہر قدم بانگ جرس ہے کاروان مور کا
تاک لے یکبار گر اُس چشم میگوں کو تو پھر
کیا عجب ہے پانی پانی ہو جو دل انگور کا

عشق میں یار کے دل اتنا لگا کر دیکھا
خوب اس شمع کو میں نے بھی جلا کر دیکھا
سلسلہ برق کو پہنچا ہے دل سوزاں سے
دفتر داغ کے میں نے جو اُٹھا کر دیکھا
دشت میں وادیِ فرقت کے مریضوں کو تپے
سانس ٹھنڈی سی بھری برق جو اکثر دیکھا

نثر کا نمونہ :۔

"بعض علمائے متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں۔ تاکہ وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ ان سے فایدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام اتیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے یہ عاصی طلب قسم اوّل کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصّہ شروع ہوتا ہے جس میں "اردو اور سلطنتِ آصفیہ" کے عنوان کے تحت میں ۱۱۳۲ ھ ہجری سے لیکر دورِ حاضرہ تک کی نظم و نثر کی ترقیوں کا تذکرہ ہے۔ جس میں صرف دکنی نژاد شعراء کو جگہ نہیں دی گئی۔ بلکہ بہت سے ایسے اکابر مصنفین کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جنہوں نے دکن میں بود و باش اختیار کر لی۔ اور دکن ہی کے ہو رہے۔ یا والیِ دکن کے زیر سرپرستی اُردو کی خدمات انجام دیں۔ مثلاً داغ، امیر، جلیل، نظم، طباطبائی، ضامن، یہاں تک کہ ذوق و غالب کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے۔

کتاب کا آخری حصّہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ کیونکہ جنوبی ہند کی موجودہ ادبی حالت کا آئینہ ہے۔ اور آجکل کے بیشتر مشاہیرِ ادب کے حالات اور اُن کے متعلق بحث و تنقید پر مشتمل ہے۔

ان آخری صفحوں میں ایک اور ملاحظہ طلب بات دکن کے اخباروں، رسالوں، اور انجمنوں کا تذکرہ ہے۔ جو نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ اخبار رسالے اور انجمنیں ہر زندہ زبان کا رکن رکین ہیں اور اُن کا ذکر کئے بغیر کسی زبان کی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس کتاب کے سب سے زیادہ مفید، اور قابلِ توجہ صفحات اور اس کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز وہ صفحات ہیں جن پر تاجدارِ دکن اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع مدظلہٗ و خلد اللہ ملکہٗ کا کلام ملک الکلام اور اُن کا وہ منشور خسروی جو "جامعہ عثمانیہ" کے قیام کے متعلق صادر ہوا زیب رقم ہے۔

فصول و ابواب کی تقسیم اگرچہ ایسے عمدہ طریقے سے کی گئی ہے کہ اُردو پر تغیّر و تبدّل کے جو دور گزرے وہ بخوبی واضح ہو گئے ہیں۔ تاہم ایک ضروری امر کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے اُن کے درمیان اشتباہ کی بہت گنجائش رہ گئی ہے۔ یعنی ہر دور کی خصوصیات کو یکجا نہیں شمار کیا گیا۔ بلکہ جہاں جہاں ضمناً اُن کا ذکر آگیا۔ وہیں فرداً فرداً بیان کر دی ہیں۔ یہ بیشک درست ہے کہ ہر دور کے اسقدر مختلف و متفرق نمونے پیش کئے گئے ہیں کہ اُنسے اُسکے خصائصِ امتیازی

کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاہم پڑھنے والے کی قوت اخذ پر اتنا کچھ چھوڑ دینے سے بہتر یہ ہوتا کہ فاضل مؤلف خود ہر دور کے اخیر میں خلاصہ کے طور پر اُس کے لفظی اختراعات اور معنوی اجتہادات مخصوص مضامین، مخصوص اسالیب سخن وغیرہ جمع کر دیتے۔ امید ہے کہ وہ دوسرے ایڈیشن میں یہ اضافہ کر کے کتاب کو بہمہ وجوہ کامل بنا دینگے۔

لکھائی چھپائی ایسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیئے۔ حجم ۸۰ صفحات تقطیع　　　قیمت فیجلد دو روپیہ (عـ۲) ملنے کا پتہ:۔ نصیر الدین ہاشمی خلف مولوی عبدالقادر صاحب رجسٹرار بلدہ ترپ بازار حیدر آباد دکن

شطرنج اخبار لکھنؤ کا حکومت اور ہندوستان اسپیشل نمبر ۱۹۲۳ و ۱۹۲۴ء

ہم اس اخبار کی نسبت اظہار رائے سے قاصر ہیں کیونکہ اس کے مقاصد سیاسی ہیں۔ اور ہزار داستان صرف ادب اور متعلقات ادب کے لئے وقف ہے۔ البتہ معاصرانہ فرض کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے قارئین سے اسے کم از کم روشناس کرا دیں۔

ایک مختصر مقالہ افتتاحیہ ہیں جس کا عنوان ہے "اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے" اس کے اغراض و مقاصد بالفاظ ذیل بیان کئے گئے ہیں:۔

"...... اخبار شطرنج جہاں انگریزی سلطنت کا وفادار اور زبردست آرگن ہے۔ وہاں اہل ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جائز پالٹیکس کی تعلیم دینے کے واسطے جاری ہوا ہے۔ اس نے ابتدائی اشاعت سے اکابیوں کے نقائص اور کمزوریوں کا سچا فوٹو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔"

اس امر کا صحیح صحیح اندازہ کرنا کہ مندرجہ بالا مقاصد میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے یا اس نے جو طریق کار اُن کے حصول کے لئے اختیار کیا ہے وہ کہانتک موزون و مناسب ہے۔ ہمارے بس کی بات نہیں، قارئین خود مطالعہ کر کے معلوم کر لیں۔

ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اس کی صورت ظاہری کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ کیونکہ مضمون کے لحاظ سے یہ از سرتاپا سیاسی نظم و نثر سے مملو ہے۔ اور اگر کہیں کہیں کوئی چیز اس دائرے سے خارج بھی جاتی ہے، تو اسمیں بھی ادبی عنصر اتنا ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔

بیشتر صفحات مشاہیر کی عکسی تصویروں سے مزین ہیں اور جہاں تصویریں نہیں وہاں یا اشتہار ہیں یا عظائم حکومت کی شان میں مدحیہ قصاید ہیں۔ جن میں سے عشر عشیر ایسے ہیں جن میں کچھ ادبیت کی چاشنی پائی جاتی ہے

حجم ۱۷۶ صفحے تقطیع　　　قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:۔ "اخبار شطرنج لکھنؤ۔"　　　"۵"

نوائے راز

مَیں کون ہوں، کس جگہ ہوں، کیا ہوں
رہ رہ کے یہ دل سے پُوچھتا ہوں

مَیں راہ طلب میں کھو گیا ہوں
حیرت سے ہر اِک کو دیکھتا ہوں

ہمدرد ہوں، درد آشنا ہوں
اچھا ہوں بُرا ہوں یا بھلا ہوں

مظہر ہوں کسی کے حُسن کا مَیں
جلووں کا کسی کے آئینا ہوں

ہر آہ کے لب پہ یہ صدا ہے
ٹوٹے ہُوئے دل کا آسرا ہوں

بیکار ہے فکرِ چارہ سازی
مَیں اپنے مرض کی خود دوا ہوں

کس مُنہ سے کروں مَیں اُس کا شکوہ
اپنے ہی کئے کو رو رہا ہوں

اِک راز ہے حال و قال میرا
کس دُھن میں ہوں، کیا میں کہہ رہا ہوں

مٹ جاؤں اگر تو کیا شکایت
آخر تو مَیں خاک سے بنا ہوں

صدقے تری بے نیازیوں کے
کب سے ترے در پہ سجدہ سا ہوں

ہے کوئی یہاں نگاہ والا؟
بندہ ہوں مگر خُدا نما ہوں

کیوں آئے زباں پہ حرفِ شکوہ
اے رازؔ مَیں بندۂ رضا ہوں

رازؔ چاندپوری

جانِ ظرافت ایک نہایت پُرلطف ڈراما ہے۔ جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ اصل کتاب مولیر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مسنوں ہیں۔ جو جرمنی کے مشہور ڈراما نگار لیسنگ اور فارس میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنفین کی طبع آزاد ہیں۔ غرضیکہ اس زعفران زار کی بالیدگی کیلئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اسکی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہوسکتی ہے۔ کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے قیمت ۸ / فی جلد۔

قزاق جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی۔ شاعر اور ڈراما نگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھالکر دنیا کے نشیب و فراز اعمال بد کے مآل کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو رلاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصور کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ گنپت سین صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا چیف جسٹس ہائی کورٹ کشمیر اسے انتہا دلچسپ خیال فرماتے ہیں۔ قیمت فی جلد آٹھ آنے .... (۸)

ظفر کی موت بلجیم کے چابکدست اور مجیر العقول ڈراما نگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جس میں ایک بہن کی محبت کا جلوہ دکھا کر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جن کا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا۔ انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیت ہے۔ عجب پر تاثیر کتاب ہے جس کے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے۔ قیمت فی جلد .... (۴)

بگڑے دل فرانس کے مسلم ظریف ڈراما نگار مولیر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ میصروں کی رائے میں حسن زبان انداز بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیات عالم میں ناپید ہے اور شعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے۔ اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن الجھنوں میں پھنستا ہے قیمت فی جلد ۸ / ۔ **تین ٹوپیاں** :۔ جو دور جدید کی ایک فرانسیسی فارس کا عکس ہے۔ قیمت فی جلد (۸ /)۔

ملنے کا پتہ :۔ **مینیجر دی اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور**

گھر بیٹھے تمام ملکوں کی سیر کرانے والا آلہ!
جامِ جہاں نما
(دُنیا بھر کی نئی ایجاد)
خوشی کا مقام ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ہندؔ میں کبھی کبھی کوئی نہ کوئی نئی ایجاد ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ حال میں ہم نے ایک ایسی ایجاد نکالی ہے۔ جس کو ہر شخص رات کو سوتے وقت سرہانے کے نیچے رکھکر عالمِ خواب میں تمام دُنیا کی سیر کر سکتا ہے۔ تم آلہ جامِ جہاں نما کو سرہانے رکھکر سو جاؤ۔ اور حسبِ منشا آبشار نیاگرہ یا کشمیر کی پُر فضا سرسبز وادیوں یا سوئٹزرلینڈ کے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں کی سیر کا ارادہ کرو۔ بس جونہی آپ کی آنکھ لگے گی۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہاں کی سیر کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر یا ہوا میں اُڑتے اُڑتے کر رہے ہو۔ ان مزیدار طلسمی سیروں سے آپکو ایسی خوشی حاصل ہوگی کہ سارے جہاں کی خوشیاں اس کے مقابل میں ہیچ سمجھو گے۔ نیز دنیا بھر کی متبرک جگوں کے علاوہ فرانس۔ اٹلی۔ یورپ۔ انگلستان۔ افریقہ۔ امریکہ وغیرہ کی سیر و نظارہ قدرت کی دلچسپیوں کا مشاہدہ کرنے سے فی الواقع سیلانی کو ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہفت اقلیم کا بادشاہ سمجھنے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا عامل نہ صرف گھر بیٹھے تمام دنیا کے گوشے گوشے کی جی بھر کر سیر ہی کر سکتا ہے۔ بلکہ آفاتِ ارضی و سماوی سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ اور دنیا کا کوئی غم اس کے پاس پھٹکنے نہیں پاتا۔
ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ مرد۔ عورت۔ بچہ بوڑھا جوان ہر مذہب و ہر عمر کا شخص بلا کسی دقت کے استعمال کر سکتا ہے۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف چار روپے۔ محصولڈاک ۵؍ پرچہ ترکیب ہمراہ ملے گا۔ بموجب اشتہار نہ نکلنے غلط ثابت ہونے پر واپسی کی شرط ہے۔
پتہ:۔ سپرنٹنڈنٹ دی جامِ جہاں نما آفس بہاولپور۔ (پنجاب)
نور البصر کی تازہ تصدیق
عالیجناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر جھنگ کی قلم سے۔ جہاں تک میں نے اس کا استعمال کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سرمہ ان سب سرموں سے بہتر اور مفید معلوم ہوتا ہے
عالیجناب کپتان ڈاکٹر مکرم صاحب
احمد لاج۔ گجرات۔ (پنجاب)

مکتبہ اردو لاہور
کی دلچسپ مفید کتابیں
اردو لطیف
دردادو (مصنفہ حکیم احمد شجاع صاحب ایڈیٹر نونہال و ہزار داستان) شہنشاہ بابر کے بچپن کے رفیق کی زبانی نہایت آسان اور دلچسپ عبارت میں بابر کی زندگی کے حالات درج ہیں قیمت ۸/
شہر شہری اور شہریت (مصنفہ حکیم احمد شجاع صاحب بی - اے علیگ ایڈیٹر نونہال) نہایت دلچسپ پیرایہ میں شہروں اور شہریوں کی ترقی کا بیان درج ہے قیمت ۶/
جنگ فرنگ (حکیم احمد شجاع صاحب بی - اے علیگ ایڈیٹر نونہال نے جنگ یورپ کے واقعات کو ایک دلچسپ ڈرامے کی صورت میں لکھا ہے - تقریباً تمام ہندوستان کے تعلیمی محکموں نے اسکولوں کے کتبخانوں اور انعامی کتابوں کے لئے تجویز کیا ہے - اتنی خوبیاں ہونے کے علاوہ قیمت بالکل تھوڑی صرف ۸/
حجاب زندگی - موثر اور دلکش مختصر افسانوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے - جس میں فطرت انسانی کے مختلف غوامض و رموز کو ایک جدید اور رنگین انداز بیان میں منکشف کیا گیا ہے - گناہ کی پر اسرار حقیقت اور اس کے تمام لوازمات کا اثر جس طرح انسانی خصائل کو متاثر کرتا ہے - اس کی مکمل تشریح ہے جو افراد قصہ کی زبانی فصیح و بلیغ عبارت میں کی گئی ہے - زندگی کے حقائق و دقائق کا مرقع دیکھنا چاہو - تو حجاب زندگی پڑھو جو سنہ ۱۹۲۳ء کی کامیاب ترین تصنیف ہے کاغذ اعلیٰ کتابت و طباعت عمدہ قیمت عہ
ملنے کا پتہ
مینیجر دی اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

کف و کھانسی کی دوا۔

کھانسی ام الامراض ہے۔ یہ مثل بالکل درست ہے۔ کیونکہ کھانسی کی وجہ سے مختلف مرض پیدا ہوتا ہے۔ سردی سے ابتدا میں کھانسی ہوتی ہے۔ اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو سانس کی نلیوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ دم کی رکاوٹ اور پسلیوں میں درد۔ بخار۔ دق۔ سل۔ مراق وغیرہ مختلف امراض میں مریض مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہذا سردی یا کھانسی شروع ہوتے ہی مناسب دوا استعمال کرنا لازم ہے۔ ایسے مہلک مرض کا قلع قمع کرنے کیلئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی ایجاد کردہ کف و کھانسی کی دوا از حد مفید ہے۔ وقت ضرورت کیلئے ہر گھر میں اس کی ایک شیشی موجود رکھنی چاہیئے۔ قیمت فی شیشی کلان عہ ایک روپیہ چار آنہ خورد ۱۰ دس آنہ محصولڈاک و پیکنگ ۸ آٹھ آنہ و ۶ چھ آنہ۔

دمہ دم کے ساتھ ہے۔ یہ بات صریح غلط ہے

کیونکہ ڈاکٹر برمن کی ایجاد کردہ "دمہ کی دوا" عرصہ ۴۲ سال سے ہندوستان کے ہر حصہ میں شہرت کیساتھ مفید ثابت ہوئی اور لاکھوں مریض ہر سال شفا پا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مریض بازاری زیادہ تر نشیلی اجزا دہتورہ بھنگ۔ بلاڈونا۔ پوٹاس وغیرہ مفر اشیاء آمیز دوا استعمال کر کے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھا کر مایوس ہو بیٹھتے ہیں۔ اور عمر غیر طبعی میں مارے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی کیمیائی اصول سے بنائی ہوئی "دمہ کی دوا" ایک بیش قیمت جوہر ہے۔ اس کی ایک ہی خوراک سے دمہ کا دورہ نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ آزما کر دیکھئے۔ قیمت فی شیشی (عہ) ایک روپیہ آٹھ آنہ محصولڈاک چھ آنہ۔

مفصل حال دریافت کرنے کے لئے بڑی فہرست مفت منگا کر دیکھو۔

(نوٹ)

ہماری دوائیں ہر جگہ ہر ایک دوکاندار اور ہمارے ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں۔ دوا منگانے سے پہلے آپ اپنے مقام کے دوکانداروں سے دریافت کیجئے۔

ڈاکٹر ایس کے برمن پوسٹ بکس ۵۵۴ نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ منیجر پیسہ اخبار لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے | رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ | قیمت ششماہی ۳؎ فی پرچہ ۸؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر:-

سید عابد علی عابد بی-اے ایل ایل بی وکیل | حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

ایڈیٹر:-

محمد اسمٰعیل | محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)

جلد | فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء | نمبر (۶)

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	صفحۂ ادارت	اسسٹنٹ ایڈیٹر	۲
۲	پری	جناب عبدالستار خاں	۳
۳	راجکمار	" " "	۷
۴	کیفیات	جناب پنڈت برجموہن کیفی دتاتریہ	۹
۵	میری داستانِ حیات	جناب خادم محی الدین بی اے بی ٹی	۱۰
۶	آوارۂ محبت	جناب راز چاندپوری	۲۹
۷	رباعیات	جناب اثر صہبائی بی اے ایل ایل بی	۳۱
۸	جرعات	" " "	۳۱
۹	آئینۂ دل	جناب احسن	۳۲
۱۰	عشقِ غیور	جناب سراج الدین احمد نظامی	۳۳
۱۱	کلامِ یگانہ	جناب مرزا یاس عظیم آبادی	۴۵
۱۲	تربینی	جناب حامد اللہ افسر بی-اے	۴۶
۱۳	نوائے راز	جناب راز چاندپوری	۴۸
۱۴	سچی خوشی	جناب "ہ"	۴۹
۱۵	شاعر کا دل	جناب حسرت	۵۷
۱۶	قند مکرر	حضرت سُہا (علیگ)	۵۸
۱۷	خطاب بہ لالۂ صحرا	جناب میر ولی اللہ وکیل	۵۹
۱۸	وجدانیات	جناب عابد	۶۰
۱۹	عورت اور حسنِ تدبیر	جناب محمد عظیم الدین بی اے (آنرز)	۶۱
۲۰	گلزارِ خلیل	جناب محمد عبدالاحد خاں خلیل	۶۶
۲۱	تجلیات	جناب عابد	۶۷
۲۲	تبصرے	جناب "ڈرامی"	۶۸
۲۳	میں تجھ کو دیکھتا ہوں	جناب فگار	۷۰
۲۴	داستانِ آرزو	جناب تاج محمد خیال بی اے (آنرز)	۷۱
۲۵	غزل	جناب جلال الدین اکبر	۷۱
۲۶	اشتہارات	مشتہرین	۷۲

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام گوپال داس پرنٹر چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کیلئے محمد اسمٰعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

صفحۂ ادارت

جناب حفیظؔ جالندھری کی غزل "ایسا نہ ہو جاتے" اور "دیوانہ ہو جاتے" کی بحث کے سلسلے میں نیرنگ خیال میں موصوف کا ایک خط شائع ہُوا ہے۔ جو تمامتر بے سروپا باتوں پر مبنی ہے پچھلے نمبر میں ہم اس ناگوار واقعے کی حقیقت کافی توضیح سے بیان کر چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مدیر نیرنگ خیال اور جناب حفیظؔ جالندھری مسلسل غلط بیانیوں پر تُلے ہُوتے ہیں۔ نہ تو جناب حفیظؔ کی شاعری کو کچھ وقعت حاصل ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس پر خامہ فرسائی کرتے رہیں۔ اور نہ یہ مناسب ہے کہ ہزارداستان کے صفحات کو نیرنگِ خیال کے پادر ہوا مضامین کے جواب کے لئے وقف کر دیا جائے۔

اس لئے ہم اس ماہ سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم جناب حفیظؔ جالندھری اور جناب مدیر نیرنگ خیال کو اپنا مخاطب صحیح نہیں تصوّر کرتے۔ اور آئندہ اس ضمن میں ہم کوئی تحریر شائع نہیں کرینگے۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر

تصحیح۔ اسی پرچے کے صفحہ ۵۹ پر "خطاب بہ لالۂ صحرا" کے ساتویں سطر کے مصرعۂ اوّل میں "نرسی" کے بجائے "نرسد" کر لیجئے۔

پری

(۱)

راجکمار بیس سال کا ہو گیا۔ ملک ملک سے شادی کے پیغام آنے لگے۔ جوتشی نے کہا۔ "بالھیک کی راجکماری نہایت حسین ہے۔ جیسے گلاب کا پھول ہو۔" راجکمار نے مُنہ پھیر لیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔

سفیر نے حاضر ہو کر عرض کی۔ "قندھار کی شاہزادی کے ہر عضو سے حسن پھوٹا پڑتا ہے گویا انگور کی بیل ہے جس سے خوشہ ٹپکے پڑتے ہیں۔" راجکمار اسی روز شکار کو چلا گیا۔ کئی دن ہو گئے واپس نہ آیا۔

دوسرے سفیر نے کہا۔ "کمبوج کی راجکماری کو دیکھ آیا ہوں۔"

راجکمار بھرتھری کے کلام کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا کتاب سے نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

راجہ نے کہا۔ "بات کیا ہے؟ وزیر زادہ کو بلواؤ۔"

وزیر زادہ حاضر ہوا۔ اس کے باریاب ہوتے ہی بادشاہ نے دریافت کیا۔ "تم شاہزادے کے دوست ہو یہ بتاؤ کہ شادی سے اُسے نفرت کیوں ہے؟"

وزیر زادے نے عرض کی۔ "حضور! شاہزادے نے جب سے پرستان کا قصہ سُنا ہے۔ اُنہوں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ اگر میں شادی کرونگا تو پری سے کرونگا۔"

(۲)

بادشاہ نے حکم دیا کہ پرستان کا پتہ لگایا جائے۔ بڑے بڑے پنڈت اور ماہرینِ فن حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے ضخیم جلدوں کی ورق گردانی کی۔ مگر سب نے یہی کہا کہ ان کتابوں میں پرستان کا اشارہ تک نہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور سیاح طلب ہوئے۔ اُنہوں نے عرض کیا۔ "خشکی اور تری کا سفر ہم نے کیا۔ خوبصورت سے خوبصورت جزیرے ہم نے دیکھے۔ مگر پرستان ہمیں کہیں نہ مِلا۔" اب حکم ہوا۔ کہ وزیر زادہ حاضر کیا جائے۔ اس کے حاضر ہوتے ہی ارشاد ہوا۔ "پرستان کا قصہ شاہزادے نے کس سے سُنا ہے؟"

وزیر زادے نے دست بستہ عرض کی۔ "ایک پاگل سے جو ہاتھ میں بانسری لئے جنگلوں میں پھرا کرتا ہے۔ اسی نے شاہزادے کو پرستان کی کہانی سُنائی تھی۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا! اسی پاگل کو بلواؤ۔"

پاگل، بادشاہ کے نذرانہ کے لئے ایک مُٹھی میں جنگلی پھول

لئے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے دریافت کیا "کیا تم پرستان کا حال جانتے ہو؟"

اس نے کہا "جی ہاں! میں تو روز وہاں آیا جایا کرتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا "کہاں ہے؟"

پاگل نے جواب دیا۔ "یہیں آپ کے راج میں۔ چترگری پہاڑ کے نیچے کاسیک جھیل کے کنارے۔"

"کیا وہاں پریاں دکھائی دیتی ہیں۔"

پاگل "دکھائی تو دیتی ہیں لیکن اُن کا پہچاننا مشکل ہے وہ اپنا بھیس بدلے رہتی ہیں۔ بعض وقت جب وہ چلی جاتی ہیں، تو بتاتی ہیں کہ ہم پریاں ہیں۔ پھر وہ کسی کو نہیں مل سکتیں۔"

بادشاہ "تم انہیں کیسے پہچانتے ہو؟"

پاگل "کبھی نغمہ سُنکر اور کبھی نور دیکھ کر۔"

بادشاہ نے خفا ہوکر کہا۔ "پاگل ہے۔ پاگل پن کی باتیں کرتا ہے۔ نکالو یہاں سے۔"

(۳)

مگر پاگل کی باتیں شاہزادے کے دل پر نقش ہوگئی تھیں پھاگن میں بسنت آئی۔ درختوں کی ٹہنیاں شگوفوں سے لدگئیں۔ جنگل میں پھولوں کا فرش بچھ گیا۔ راجکمار چترگری پہاڑ کی طرف تن تنہا چل کھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟" اس نے کسی کو جواب نہ دیا۔

غار کے مُنہ سے ایک چشمہ اُبلتا تھا۔ جو کاسیک جھیل میں جاملا تھا۔ لوگ اس چشمہ کو "حسرتوں کا چشمہ" کہا کرتے تھے۔ اسی چشمہ کے کنارے ایک منہدم شدہ مندر میں شاہزادہ رہنے لگا۔

مہینہ ختم ہوگیا۔ شاخوں میں جو سُرخ کونپلیں پھوٹی تھیں اب ہری پتیاں ہوگئیں۔ ان کا رنگ گہرا ہوگیا۔ پھول جھڑ گئے۔ اور ان پھولوں سے جنگل کا راستہ پٹ گیا۔ ایک دن صبح صبح شاہزادے نے بانسری کی ایک لے سُنی۔ اُس نے خوشی سے اُچھل کر کہا "آج میں ضرور پری کو دیکھ لونگا۔"

(۴)

گھوڑے پر سوار ہوکر راجکمار اسی دریا کے کنارے کنارے چل کھڑا ہوا۔ اور کاسیک جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی لڑکی کنول کے جنگل میں بیٹھی ہے۔ اُس کا گھڑا پانی سے بھرا رکھا ہے۔ مگر وہ وہاں سے اُٹھتی نہیں۔ وہ سیاہ فام لڑکی اپنے سیاہ بالوں میں سرس کا پھول کھونسے ہوئے ہے گویا شام کی سیاہی میں کوئی تارا چمکتا ہو۔

راجکمار نے اپنے گھوڑے پر جھک کر کہا۔ "تم اپنے جوڑے کا پھول مجھے دوگی؟"

وہ ہرنی تھی۔ خوف سے ناآشنا ہرنی تھی۔ اُس نے مڑکر شاہزادے کی طرف دیکھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں پر کسی کا سایہ

پڑا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ گویا نیند میں خواب ہے یا آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہے۔

لڑکی نے اپنے جوڑے سے پھول نکال کر راجکمار کے ہاتھ میں دیا اور کہا۔ "یہ لو۔"

راجکمار نے اس سے پوچھا۔ "سچ بتاؤ تم کونسی پری ہو۔"

پہلے تو اس سوال سے لڑکی کے چہرہ پر تعجب کے آثار نظر آئے لیکن پھر کنوار کی بارش اور بجلی کی طرح اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کی یہ ہنسی رکتی ہی نہ تھی۔

راجکمار نے اپنے دل میں کہا۔ "خواب مبارک نکلا۔ اس قہقہہ میں بانسری کی لے ہے۔" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "آؤ"

لڑکی اس کے ہاتھوں کے سہارے گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اس نے مطلق نہ سوچا۔ کہ میرا گھڑا پڑا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سریش کی شاخ سے کویل کوک اٹھی۔ "کُو۔ اُو"

راجکمار نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "کجلی"

دونوں چشمہ کے کنارے ٹوٹے مندر میں لوٹ آئے۔

شاہزادے نے کہا۔ "اب اپنا بھیس اتار پھینکو۔"

کجلی نے کہا۔ "میں تو جنگلی لڑکی ہوں۔ بھیس ویس نہیں جانتی۔"

شاہزادے نے کہا۔ "تم پری ہو۔ اپنی اصلی صورت دکھاؤ۔"

پری کی شکل! یہ سنتے ہی لڑکی ہنسنے لگی۔ راجکمار سوچنے لگا۔ "اس قہقہے کی لے جھرنے کی لے سے ملتی ہے۔ اس لئے یہ جھرنے کی پری ہے۔"

(۵)

ادھر راجہ کو خبر پہنچی کہ شاہزادے نے پری سے شادی کر لی ہے۔ شاہی محلوں سے ہاتھی گھوڑے اور پالکی آئی۔

کجلی نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

راجکمار نے کہا۔ "اب تمہیں شاہی محلوں کو چلنا پڑے گا۔"

کجلی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ سوچنے لگی۔ "آنگن میں سوکھنے کے لئے جو غلہ پھیلایا تھا۔ وہ ویسا ہی پڑا ہے۔ میرے باپ اور بھائی شکار کو گئے تھے۔ ان کے لوٹنے کا بھی وقت ہوگیا ہے۔" پھر اسے یاد آیا۔ "میری ماں شادی کے وقت جو کپڑا دینا چاہتی ہے۔ وہ بن رہی ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں نہ جاؤنگی۔"

نقاروں پر چوبیں پڑنے لگیں۔ ڈھول بجنے لگے نقاروں کے شور اور ڈھول کی آواز میں اس کی بات کسی نے نہ سنی۔

جب اس کی پالکی محل کے دروازہ پر پہنچی۔ اور وہ نیچے

اُتری تورانی نے اپنے سر پر دو ہتھڑ مار لئے۔ کہا۔ "یہ کیسی پری ہے؟"

شاہزادیاں کہنے لگیں۔ "توبہ! کتنی شرم کی بات ہے۔"

کنیزوں نے کہا: "پری کی صورت کیسی ہے؟"

راجکمار نے کہا: "چپ رہو۔ پری تمہارے یہاں بھیس بدل کر آئی ہے۔"

(۶)

دن گزرتے گئے۔ چاندنی راتوں میں شاہزادہ اُٹھ اُٹھ کر تکتا۔ کہ کہیں پری نے اپنا بھیس اُتار تو نہیں ڈالا۔ مگر چاند کی روشنی میں اُس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا سنگ موسے کا بنا ہوا ہے۔ شاہزادہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ "اے پری تو رات کی تاریکی میں صبح کی سپیدی کی طرح کہیں چھپی ہوئی ہے۔"

شاہزادے کو اپنے گھر والوں سے شرم آنے لگی۔ ایک دن غصہ بھی آگیا۔ صبح کو کجلی جب اپنے بستر سے اٹھی تو شاہزادے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آج تمہیں نہ چھوڑونگا۔ اب تم اپنی اصلی شکل دکھاؤ۔"

پہلے یہ سُنکر کجلی کی ہنسی نہ رُکتی تھی۔ لیکن آج اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

شاہزادے نے کہا: "کیا تم ہمیشہ ہم کو دھوکے میں رکھوگی۔"

کجلی۔ "نہیں۔ اب نہ رکھونگی۔"

شاہزادے نے کہا۔ "ابکی چاند کی چودھویں کو ہم تمہاری اصلی شکل دیکھیں گے۔"

(۷)

چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ شاہی محلوں میں نوبت بج رہی تھی۔ شاہزادہ دُولھے کے کپڑے زیب تن کئے خوابگاہ میں داخل ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "پری کے نظارے سے آج میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔"

خوابگاہ میں پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اس پر جوہی کے سفید پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چاند کی سفید روشنی سے سارا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ مگر کجلی کہاں؟

رات کے تین پہر گزر گئے۔ لیکن پری کہاں ہے؟

شاہزادے نے کہا:۔

"جب پری غائب ہو جاتی ہے۔ تو وہ یہ ثابت کر دیتی ہے۔ کہ میں پری ہوں۔ اور پھر اُسے کوئی نہیں پا سکتا۔"

ٹیگور

عبد الستار خاں

راجکمار

(۱)

راجکمار چلا جا رہا ہے۔ اپنا راج چھوڑ کر سات راجاؤں کا راج پار کرکے اُس مُلک میں چلا جا رہا ہے۔ جہاں کسی راجہ کا راج نہیں۔ راجکمار چلا جا رہا ہے۔ یہ اُس زمانہ کا قصّہ ہے جس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔

شہروں میں اور گاؤں میں لوگ ہاٹ بازار جاتے ہیں گھر کا کام دھندا کرتے ہیں۔ دُنیا کے جھگڑوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارا پُرانے زمانے کا راجکمار ہے۔ کہ راج پاٹ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

مگر وہ کیوں جاتا ہے؟

کنوئیں کا پانی کنوئیں میں رہتا ہے۔ تالاب کا پانی تالاب میں۔ لیکن پہاڑ کا پانی پہاڑ میں رُکا نہیں رہتا۔ اور نہ مینہ بادل میں رُکا رہتا ہے۔ راجکمار کو اپنے راج میں کوئی روک کر نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایسے مُلک کی تلاش میں نکلا ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ وہ اُسے دیکھے بغیر نہیں لوٹے گا۔ سات سمندر اور تیرہ دریاؤں کو پار کرکے اُسے جانا ہوگا۔

آدمی بار بار جنم لیتا ہے اور بار بار وہی پُرانی کہانی دُہراتا ہے۔ شام کو چراغ کی پُرسکون روشنی میں لڑکے چپ چاپ گال پر ہاتھ رکھے ہُوئے سوچتے ہیں۔ "کیا ہم ہی وہ راجکمار ہیں؟" جہاں وہ نامعلوم مُلک ختم ہوتا ہے۔ وہیں ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس سمندر کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ ہے اور جزیرہ میں دیوؤں کا مسکن ہے۔ جہاں راجکماری قید ہے۔

دُنیا میں کوئی دولت کا طالب ہے، کوئی نام کا خواہاں ہے۔ اور کوئی راحت کا متلاشی۔ لیکن ہمارا راجکمار دیوؤں کے اس مسکن سے راجکماری کو چھڑالانا چاہتا ہے۔ طوفان اُٹھ رہا ہے۔ کشتی ناپید ہے۔ پھر بھی راجکمار اپنا راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔

یہی انسان کا ازلی افسانہ ہے۔ اور عاقبت کا حال خدا جانے۔ دُنیا میں جو پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھ کر یہی لاانتہا افسانہ سُننا چاہتے ہیں۔ راجکماری قید ہے۔ سمندر عبور کرنا مشکل، دیوؤں کا تسخیر کرنا محال۔ بیچارہ راجکمار تنِ تنہا یہ عہد کرتا ہے۔ "میں اکیلا راجکماری کو قید سے چھڑالاؤنگا۔"

باہر تاریک جنگلوں میں بارش ہو رہی تھی۔ جھینگر بول

رہے ہیں۔ اور لڑکے گال پر ہاتھ دھرے سوچ رہے ہیں۔ کہ ہمیں راجکماری کو دیوؤں کی قید سے چھڑا کر لانا ہوگا۔

(۲)

سامنے ایک ناپیدا کنار سمندر آیا۔ اس سمندر کی طرح جو خواب کی لطیف موجوں سے بنا ہو۔ یہاں راجکمار گھوڑے سے اُتر پڑا۔ مگر زمین پر پیر رکھتے ہی یہ کیا ہُوا؟ یہ کس جادو کا طلسم ہے؟

ہیں یہ تو شہر ہے! ٹرام دوڑ رہی ہے۔ دفتر جانیوالی گاڑیوں سے راستہ رُکا ہُوا ہے۔ سڑک کے ایک کنارے تاڑ کے پتّوں کی بانسری بنانے والا لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بانسری بجاتا ہُوا چلا جارہا ہے۔

راجکمار کی یہ کیا ہیئت ہے! گلے میں سادا کُرتا ہے دھوتی بھی صاف نہیں۔ پیروں میں ٹُوٹا جوتا ہے۔

دیہاتی لڑکا ہے شہر میں پڑھتا ہے۔ لڑکوں کو پڑھاکر اپنا خرچ چلاتا ہے۔

راجکماری کہاں ہے؟

اُسی کے مکان کے قریب ایک مکان میں۔

اُس کی رنگت چمپے کے پھول کی طرح نہیں۔ اور نہ اُس کے ہنسنے سے موتی جھڑتے ہیں۔ آسمان کے تاروں سے اُس کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

سال نو کے آغاز میں گھاس کی آڑ میں جو گمنام پھول کھلتا ہے صرف اُس سے اس کو تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اُس کی ماں تو مرہی چکی تھی۔ باپ اس کی عزّت کیا کرتا تھا لیکن وہ غریب تھا نادار تھا۔ کسی نالائق یا مفلس سے لڑکی کو بیاہنا نہیں چاہتا تھا۔ یونہی لڑکی کی عمر زیادہ ہوتی گئی۔ اور لوگ بُرائیاں کرنے لگے۔ باپ بھی مرگیا۔ اور لڑکی اپنے چچا کے یہاں آئی۔

لائق دولہے کی تلاش ہُوئی۔ دُولھا جتنا دولتمند تھا۔ اتنا ہی معمر بھی تھا۔ اس کے پوتوں پوتیوں کی تعداد کم نہ تھی اس کا رعب اور دبدبہ بھی کم نہ تھا۔

چچا نے کہا۔ "لڑکی بختاور ہے۔"

لیکن ہلدی چڑھنے کے دن لڑکی کا پتہ نہ چلا۔ اور پڑوس کے لڑکے کا بھی۔

پھر خبر ملی دونوں نے چھپ کر شادی کر لی ہے۔ دونوں میں ذات کا اختلاف تھا۔ مگر دل ملے ہوئے تھے سب نے کہا۔ "بُرا ہُوا۔"

لکھ پتی نے اپنے دیوتا کو سونے کے تخت پر بٹھانے کا عہد کرکے کہا۔ "دیکھوں اس لڑکے کو کون بچا سکتا ہے؟"

لڑکے کو عدالت میں لا کھڑا کیا۔ قابل وکیل نے شہادت کے دیوتا کی مدد سے دن کو رات ثابت کر دیا۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔

اسی دن دیوتا پر دو بکرے چڑھائے گئے باشا دیانے

بجنے لگے۔ سب خوش ہوتے اور کہنے لگے "ہے تو کلجگ لیکن ابھی دھرم اٹھ نہیں گیا۔

(۳)

اس کے بعد۔۔۔ طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ جیل سے لڑکا لوٹ آیا۔ لیکن طویل شاہراہ کا خاتمہ نہیں ہوا۔ یہ راستہ نامعلوم ملک سے بھی زیادہ سنسان اور لانبا تھا۔ اُس نے تاریکی میں آدم خور دیو کی کئی مرتبہ آوازیں سُنیں۔ اُف! آدم خوری کا انتا ہوگا! راستہ کی حد نہ ہو۔ لیکن چلنے کی انتہا تو ہوتی ہے۔ ایک دن اُسے بھی رُکنا پڑا۔

اُس دن اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ سرہانے ایک مہربان دیوتا نظر آیا۔ وہ موت کا فرشتہ تھا۔

موت کے فرشتہ نے جونہی اُسے اپنی طلائی چھڑی سے چھوا۔ وہ کچھ کا کچھ ہوگیا—— شہر غائب ہوگیا۔ نیند ٹوٹ گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ "راجکمار" دکھائی دیا۔ اس کی پیشانی پر ایک شاہی ٹیکا تھا۔ ازلی ٹیکا تھا۔ وہ دیووں کے شہر کا پھاٹک توڑیگا۔ اور راجکماری کو آزاد کریگا۔

ہر زمانہ میں بچے اپنی ماؤں کی گود میں بیٹھکر یہی کہانی سُنا کرتے ہیں۔ کہ انسان اپنا گھربار چھوڑکر ایک اجنبی اور نامعلوم ملک کو چلا جارہا ہے۔ اُس کے سامنے سات سمندر ہیں۔ اور اُن کی موجوں سے شور مچا ہوا ہے

تاریخ میں اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن تاریخ کے اُس طرف اس کی ایک ہی شکل ہے۔ وہ راجکمار۔

ٹیگور

کیفیات

نالے آہوں کے سشرر کو دیکھیں　　آنکھیں اشکوں کے گھر کو دیکھیں

ہم ہیں اس سوچ میں کیفی حیراں　　اپنے عابد کہ اثر کو دیکھیں

میں اُن کو کہ آج اپنے گھر کو دیکھوں　　خورشید کو دیکھوں کہ قمر کو دیکھوں

کیوں عالم بالا پہ ہو میرا نہ دماغ　　عابد کو اِدھر۔ اُدھر اثر کو دیکھوں

قدرت ہے یہ کیا تیری مرے ربِ ودود　　اب ہوگئی تاثیر اثر بھی مفقود

آنا تھا مگر نہ آئے وعدہ کرکے　　کیا بن گیا عابد کا کوئی بُت معبود

کیفی کا بھرے آج نہ کیوں پیمانہ　　کیوں ہو نہ اثر سے اب اثر بیگانہ

چلتے تو پہنچتے۔ مل گیا ہے شاید　　دلکش کوئی رستہ میں عبادت خانہ

برجموہن کیفی دتاتریہ

سلے ہمارے آنریری اڈیٹر کا ارادہ جموں جانے کا تھا۔ لیکن بعض نامساعد واقعات کی مجبوریوں کی وجہ سے ارادہ ملتوی ہوگیا۔ اب کیفی صاحب شکایت کو نظم کرتے ہیں۔

میری داستان حیات

(مسلسل)

پندرھواں باب

نیاگرا کی آبشار۔ صنعتی نمائش کی سیر

میں نے اس واقعہ کے بعد آیندہ موسم گرما و سرما اپنے گھر الآباما میں بسر کئے۔ میرے سفر وطن کی دلخوش کن یاد ابھی تک تازہ ہے ہر شے میں ایک تازگی پائی جاتی تھی۔ میں مسرور و شاداں تھی۔ "برفانی بادشاہ کا واقعہ" یاد سے محو ہو چکا تھا۔ جب زمین پر خزاں کے قرمزی اور سنہری پتّوں کا فرش بچھا۔ اور کستوری جیسی خوشبو والے انگور، باغ کے سرے والی آرامگاہ کو ڈھانپے لیتے تھے۔ تو میں نے "برفانی بادشاہ" کی تصنیف کے ایک سال بعد، اپنی زندگی کے واقعات کا خلاصہ لکھنا شروع کیا۔ میں جو کچھ لکھتی تھی۔ اس کے متعلق اب بھی غایت درجہ محتاط تھی۔ یہ خیال اب بھی مجھے تکلیف دیتا تھا۔ کہ میں جو کچھ لکھ رہی ہوں۔ وہ تمامتر میرے اصلی خیالات نہیں۔ میرے ان خدشوں سے اُستانی صاحبہ کے سوا اور کوئی واقف نہ تھا۔ "برفانی بادشاہ" کی طرف اشارہ کرنے اور اس کا (ضرورتاً) حوالہ دیتے وقت ایک عجیب سا احساس میرے مانع آتا تھا۔ اور بسا اوقات دوران گفتگو میں جبکہ میں کوئی نادر خیال سرعت کے ساتھ ظاہر کرتی تھی۔ میں اُستانی صاحبہ سے آہستگی کے ساتھ اپنی اُنگلی سے ان کے ہاتھ پر ہجا کر کے کہتی تھی۔ "یقیناً یہ میرا نہیں ہے۔" دوسرے اوقات میں دوران تحریر میں رُک کر میں دل میں کہتی "فرض کرو کہ بعد میں یہ معلوم ہو کہ یہ تمام عبارت جو میں لکھ رہی ہوں۔ مُدت سے کسی اور کی تصنیف شدہ ہے تو میرا کیا حشر ہو۔" ایک شیطانی وسوسہ میرا ہاتھ جکڑ لیتا ہے۔ اور میں اس دن اور کچھ نہیں لکھ سکتی تھی۔ اب بھی میرا یہ حال ہے کہ میں بعض اوقات وہی بے چینی اور بے اطمینانی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ مس سلیون صاحبہ مجھے ہر طرح سے تسلّی اور امداد دیتی تھیں لیکن میرے اس خوفناک تجربے سے میرے قلب پر ایک دائمی اثر پڑ چکا تھا جس کی اہمیّت مجھے حال ہی میں آشکارا ہوئی ہے۔ میرے ذاتی اعتماد کو بحال کرنے کے خیال ہی سے

اُستانی صاحبہ نے مجھے ترغیب دی تھی۔ کہ مَیں رسالہ "رفیق نوجواناں" میں اپنی زندگی کا مختصر حال لکھوں۔ میری عمر اس وقت بارہ برس کی تھی۔ جب مَیں اس چھوٹی سی سرگزشت کو لکھنے کی کشمکش کو یاد کرتی ہوں۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے اس آنیوالی سودمندی کا ایک خواب پیشینگوئی کے طور پر دکھائی دیا تھا۔ جو اس نئی تصنیف کے ذریعہ سے پیدا ہُوئی۔ ورنہ مَیں تحریر میں یقیناً ناکام ہو جاتی۔ اُستانی کی ترغیب سے ڈر ڈر کر سعی ہُوئی۔ لیکن استقلال کے ساتھ مَیں نے اپنی مشقِ تحریر کو جاری رکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر مَیں مستقل مزاج رہی تو مَیں اپنے ذہن کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے اپنے دماغی قوا کو گرفت میں لاسکونگی۔ "برفانی بادشاہ" والے واقعہ تک مَیں نے ایک چھوٹے بچے کی سی بے علمی کی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن اب اس کے بعد میرے خیالات اندرون نفس کی طرف پھرے۔ اور مجھے ناقابلِ دید چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ مَیں رفتہ رفتہ اس ناگوار تجربے کی تاریکی میں سے ایک آزمائش کے بعد زندگی کے متعلق پہلے سے بہتر علم لیکر باہر نکلی۔

۱۸۹۳ء کے بڑے بڑے واقعات میں صدر جمہوریہ مسٹر کلیولینڈ کے جلوس عہدہ داری کے دوران میں میرا شہر واشنگٹن جانا اور سفر میں نیاگرا کی آبشار اور "دُنیا کی نمائش" دیکھنا شامل ہیں۔ ان حالات میں میرا مطالعہ بسا اوقات ہفتوں تک متواتر مختل رہا۔ پس مَیں اپنی پڑھائی کا مسلسل حال لکھنے سے قاصر ہوں۔ ہم مارچ ۱۸۹۳ء میں نیاگرا دیکھنے گئیں۔ جب مَیں اس مقام پر کھڑی ہُوئی۔ جو امریکن آبشار کے عین اُوپر ہے۔ اور مجھے ہوا کی تھرتھراہٹ اور زمین کی جنبش محسوس ہُوئی۔ تو اُس وقت کے جذبات ناقابلِ بیان معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے۔ کہ نیاگرا کے عجائبات سے مجھ جیسا معذور وجود کیونکر متاثر ہو سکتا ہے؟ وہ مجھ سے ہمیشہ یہ سوال کرتے ہیں۔ "یہ قدرتی خوبصورتی اور موسیقی تمہارے لئے کیا معنی رکھتی ہے؟ تم ان لہروں کو کنارِ آب کے ساتھ ہم آغوش ہوتے ہُوتے نہیں دیکھ سکتی ہو۔ اور نہ ان کی گرج کو سُن سکتی ہو۔ پس تمہارے لئے تو یہ بے معنی چیزیں ہیں۔" بیشک ہوش و حواس رکھنے والوں کے لئے یہ چیزیں ہر طرح سے بامعنی ہیں۔ مَیں ان کا مطلب سمجھنے سے ویسے ہی قاصر ہوں جیسا میرے لئے محبت مذہب یا خیر و شر کے عمیق تصوّر تک پُہنچنا دشوار ہے۔

۱۸۹۳ء کے دوران میں مَیں اور مس سلیون صاحبہ ڈاکٹر الگزینڈر گراہم بیل کے ہمراہ "دنیا کی نمائش" دیکھنے کے لئے گئیں۔ مجھے وہ خالص مسرت کے ایام یاد آتے ہیں جبکہ ہزارہا بچپن کے تصورات ایک خوشنما اصلیت میں ظاہر ہوتے تھے مَیں عالم خیال میں ہر روز دُنیا کے گرد چکر لگاتی تھی اور دُنیا

کے دور دراز حصّوں میں بہت سے عجائبات دیکھا کرتی تھی چنانچہ ایجاد و اختراع کی نادریات محنت اور کاریگری کے خزانے اور انسانی زندگی کے تمام مشاغل اپنی اصلی شکل میں میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

مجھے مڈوے پلیزانس (نمائش کا ایک حصہ) میں جانے کا اشتیاق تھا۔ یہ حصۂ نمائش الف لیلہ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ دلچسپی اور عجائبات سے پُر تھا۔ ایک جگہ ہندوستان کا وہ منظر موجود تھا۔ جس کا حال مَیں کتابوں میں پڑھ چکی تھی۔ یہاں بازاروں میں عجیب نظارہ تھا۔ اور ان میں شوجی، گنیش اور اور دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی ہُوئی تھیں۔ دوسری جگہ اہرام مصری کی سرزمین کو قاہرہ کے چھوٹے سے نمونے میں مسجدوں اور اُونٹوں کے جلوس کے ساتھ ظاہر کیا ہُوا تھا کہیں شہر وینس کی کھاڑیاں تھیں۔ جہاں ہم ہر روز شام کے وقت کشتی میں بیٹھکر جاتے ،جبکہ شہر اور فوّارے روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ مَیں ایک قدیم بحری لٹیروں کے جہاز پر چڑھی۔ جو ہماری کشتی سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس سے پیشتر مَیں بوسٹن میں ایک جنگی جہاز پر سوار ہُوئی تھی۔ اور اُس لٹیروں کے جنگی جہاز پر چڑھنا میرے لئے دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ مجھے خیال آیا۔ کہ قدیم زمانے میں کس طرح اس جہاز کا ملاح سمندر میں خودمختار حکومت کرتا ہوگا۔ وہ طوفان اور سکون کی حالت میں ایک دلیر دل کے ساتھ اس میں سفر کرتا ہوگا۔ اور وہ ہر اُس جہاز کا تعاقب کرتا ہوگا۔ جو اس کی طرح یہ نعرہ لگاتا ہو۔ "ہم سمندر کے بادشاہ ہیں۔" پھر کس طرح ذاتی اعتماد پر اپنی تمام جسمانی اور دماغی قوت کے ساتھ جنگ کرتا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ موجودہ دخانی جہاز کی طرح بے دماغ کل کے ذریعے پسپا ہوکر ایک کونے میں دھکیل دیا جائے یہی حال ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ کہ خواہ رزم اور بزم میں، فقط انسان ہی انسان کے واسطے وابستگی اور دِلچسپی کا موجب ہے۔

اس جہاز سے کچھ فاصلے پر کولمبس[۱۵] کے جہاز سینٹا میریا کا نمونہ رکھا تھا۔ مَیں نے اس کا بھی معائنہ کیا۔ کپتان نے مجھے کولمبس کا کمرہ اور وہ میز دکھائی۔ جس پر اس کی ریت گھڑی رکھی تھی۔ اس چھوٹے سے آلے کو دیکھ کر مَیں بہت متاثر ہُوئی۔ کیونکہ اس سے مجھے خیال پیدا ہُوا۔ کہ اس بہادر جہازران کے محسوسات کی اس وقت کیا کیفیت

---

۱۵ اٹلی کا باشندہ تھا۔ اُس نے ۱۴۹۲ء میں شاہ ہسپانیہ کی مدد سے ہندوستان دریافت کرنے کی غرض سے بحری سفر کیا۔ سات ماہ کے بعد ہندوستان کی بجائے شمالی امریکہ دریافت کیا۔ اس تمام سفر میں اس کے ساتھی اپنی مرضی کے خلاف سفر کرنے پر مجبور کئے گئے تھے۔ اس لئے مطلوبہ سرزمین معلوم نہ ہونے پر وہ اس کے قتل کے درپے ہُوئے۔ لیکن کولمبس کے استقلال سے نئی دُنیا دریافت ہُوئی (مترجم)

ہوگی۔ جبکہ وہ گھڑی میں ریت کا ایک ایک ذرّہ گرتا ہوا دیکھ رہا ہوگا۔ اور دوسری طرف جہاز والے خشمناک ہوکر اس کے مار ڈالنے کی سازش کر رہے تھے۔ اس نمائش کے صدر ہگن بوتم نے ازراہِ عنایت مجھے نمونوں کو چھونے کی اجازت دیدی۔ ایک ایسے حریصانہ اشتیاق کیساتھ جیسے پزارو[۵۱] نے ملک پیرو کے خزانوں پر قبضہ کیا تھا۔ مَیں اس نمائش کی شاندار چیزوں کو اپنی انگلیوں میں پکڑتی تھی۔ مغربی امریکہ کا یہ نورانی شہر ایک قابلِ گرفت، رنگ برنگی سیر بین کی مانند تھا۔ ہر شے مجھے محوِ حیرت کئے دیتی تھی بالخصوص فرانسیسی کانسی کی گلکاریوں والے مجسمے تو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا وہ فرشتوں کی مورتیں ہیں۔ جنہیں صنّاع نے پکڑ کر انسانی جسم میں مقید کر دیا تھا۔

راس امید کے نمونہ کو دیکھ کر مجھے ہیروں کو کانوں سے کھودنے کے تمام عمل کی بہت سی واقفیت حاصل ہُوئی۔ جب کبھی ممکن ہوتا مَیں اس کی کلوں کی حرکت کو دیکھ کر معلوم کرتی تاکہ مَیں صاف طور پر یہ دریافت کر سکوں کہ ہیروں کو کس طرح وزن کر کے تراشتے اور پالش کرتے ہیں۔ مَیں نے دھووں میں ایک ہیرے کی تلاش کی۔ اور اسے پالیا۔ لوگ کہتے تھے۔ کہ ریاستہائے متحدہ میں یہی ایک اصلی ہیرا تھا۔ جو میرے ہاتھ لگا۔ ڈاکٹر بیل ہر طرف ہمارے ساتھ جاتے تھے۔ اور اپنے پُرلطف طریق میں سب سے زیادہ دلچسپی کی اشیاء ہمیں دکھاتے جاتے تھے بجلی کی عمارت میں ہم نے ٹیلیفون، فونوگراف اور اور ایجادوں کا معائنہ کیا۔ اور ڈاکٹر موصوف نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان تاروں کے ذریعے سے جو وقت اور جگہ کو چٹکیوں میں اُڑا دیتی ہیں۔ ہم کیونکر پیغام بھیج سکتے ہیں۔ اور یہ تاریں پرامتھیس[۵۲] کی طرح آسمان سے آگ تک کھینچ لاتی ہیں۔ ہم نے علم الانسان کے حصہ نمائش کا بھی

۵۱ فرانسسکو پزارو (۱۴۷۱ء تا ۱۵۴۱ء) ہسپانیہ کا اولوالعزم سیّاح جب کولمبس نئی دُنیا دریافت کر چکا تو اُس نے مہم تیار کی۔ اور جنوبی امریکہ کو روانہ ہُوا۔ اس نے پیرو کا مُلک فتح کیا۔ لیکن اس فتح میں اس نے بیحد مظالم کئے۔ بالآخر اسی کی سپاہ نے اسے قتل کر دیا۔ (مترجم)

۵۲ یونانی علم الاصنام میں تہذیب انسانی کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ اُس نے آسمان سے آگ چُرا کر انسان کو عطا کی۔ تاکہ وہ اس کی مدد سے جملہ فنون (کھانا پکانا، اشیاء کو پگھلا کر ان سے اور چیزیں تیار کرنا) سیکھے اس پر آسمانی دیوتاؤں کے سردار زوس دیوتا نے اسے یہ سزا دی کہ ایک گدھ کو روز مرّہ اس کا جگر نوچ کر کھانے پر تعینات کیا۔ جتنا جگر نوچا جاتا تھا اُتنا ہی رات کو پھر بڑھ جاتا تھا۔ بالآخر ہرقل (قوت کے دیوتا) نے اس کی قید کے بند کھول کر اسے آزاد کیا اور گدھ کو قتل کر دیا۔ (مترجم)

معاینہ کیا۔ اور مَیں نے قدیم میکسیکو کی یادگاروں کو بہت دلچسپ پایا۔ مثلاً پتھر کے اوزار جو عہد قدیم کی واحد نشانی ہے۔ جب مَیں نے ان پر انگشت گردی کی، تو مجھے خیال آیا۔ کہ یہ قدرت کے اَن پڑھ بچوں کی ہمیشہ قائم رہنے والی سیدھی سادی یادگاریں ہیں۔ حالانکہ بادشاہوں اور ولیوں کی یادگاریں خاک میں ملکر فنا ہو جاتی ہیں۔ وہاں مومیائے مصری بھی رکھی تھیں۔ جنہیں میں نے خوف کے مارے نہیں چھوا۔ ان یادگاروں سے میں نے انسانی ترقی کے متعلق بہت کچھ علم حاصل کیا۔ اگر مَیں ان کا حال سُنتی یا کتابوں میں پڑھتی تو شاید مجھے اتنی واقفیت نہ ہوتی۔ ان تمام مشاہدوں نے میرے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سا اضافہ کیا۔ اور ان تین ہفتوں میں جو مَیں نے نمائش میں صرف کئے مَیں اس دلچسپی سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ جو ایک بچہ کھلونوں یا پریوں کی کہانیوں کے متعلق محسوس کرتا ہے۔ مَیں نے اس عملی دُنیا کی حقیقت اور اس قدر و قیمت کا اندازہ کیا۔

سولھواں باب

تحصیل لاطینی۔ فرانسیسی مشق گویائی

اکتوبر ۱۸۹۳ء سے پیشتر میں از خود چند مضامین کا کم و بیش بے قاعدہ طریق پر مطالعہ کر چکی تھی۔ مَیں نے یونان۔ روما اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ پڑھ لی تھی۔ میرے پاس اُبھرے ہُوئے حروف کی چھپی ہُوئی ایک فرانسیسی گرامر تھی۔ اور چونکہ مجھے کچھ فرانسیسی پہلے سے آتی تھی اس لئے مَیں اکثر اپنے ذہن میں چھوٹی چھوٹی مشقوں کے ذریعہ سے اپنی تفریح کیا کرتی تھی۔ جو نئے الفاظ پڑھنے میں آتے تھے۔ مَیں ان کو استعمال کرنے کے دوران میں قواعد اور دیگر اصطلاحی امور کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ مَیں نے یہاں تک بھی کوشش کی کہ کسی کی مدد کے بغیر کتاب کے بیان کردہ حروف اور اصوات کے بموجب فرانسیسی الفاظ کے تلفظ پر حاوی ہو جاؤں۔ یہ کوشش "چھوٹا مُنہ بڑی بات" کا مصداق اور اپنی کمزور قوتوں کو مقاصد عظمہ کے لئے شکنجے میں ڈالنے سے کم نہ تھی۔ لیکن اس سے اتنا ضرور ہُوا۔ کہ برسات کے کئی دنوں میں مجھے ایک مشغلہ مل جاتا تھا۔ مَیں نے فرانسیسی میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی۔ کہ مَیں لافونٹین کی "حکایات" اور امیلی ڈِن کی تصانیف اور کتاب الطبائع کے بعض بعض حصص کا حظ اُٹھا سکتی تھی مَیں نے اپنی تقریر کی ترقی پر بھی بہت سا وقت صرف کیا۔ مَیں مس سلیون صاحبہ کو بلند آواز سے پڑھکر سُنایا کرتی تھی اور اپنے مرغوب شعراء کے بعض حصص کلام کو تحت اللفظ پڑھا کرتی تھی۔ جنہیں مَیں نے حفظ یاد کر رکھا تھا۔ وہ میرے تلفظ کی تصحیح کر کے مجھے شعر کی تقطیع اور الفاظ کی گردان میں

مدد دیا کرتی تھیں۔ مجھے خاص مضامین میں مقررہ اوقات
پر جبتک کہ مجھے "دنیا کی نمائش" کے معائنہ کے بعد اس کی
پیدا کردہ تکان اور ہیجان سے افاقہ نہیں ہوا۔ ۷۔ اکتوبر
۱۸۹۳ء تک کوئی نئے اسباق نہیں پڑھائے گئے اس
زمانہ میں میں اور مس سلیون صاحبہ ریاست پنسلونیا کے
شہر ہلٹن میں مسٹر ولیم ویڈ کے کنبے میں ملاقات کے لئے
گئی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک ہمسایہ مسٹر آئرنز، لاطینی کا
اچھا عالم تھا۔ چنانچہ یہ بندوبست کیا گیا۔ کہ میں اس کی
نگرانی میں مطالعہ کروں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ شخص ایک
لاجواب، شیریں طبیعت اور وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ اس
نے مجھے زیادہ تر لاطینی کی گرامر پڑھائی۔ لیکن وہ اکثر مجھے
حساب میں بھی مدد دیا کرتا تھا۔ جو میرے لئے اتنا ہی
تکلیف دہ مضمون تھا۔ جتنا کہ وہ دلچسپی سے خالی تھا۔
مسٹر آئرنز نے مجھے ٹینی سن کی مشہور نظم "مرثیہ دوست"
بھی پڑھائی۔ میں نے اس سے پیشتر بہت سی کتب پڑھی
تھیں۔ لیکن کسی کو تنقیدی نقطہ خیال سے نہیں پڑھا تھا۔
اب میں نے پہلی مرتبہ ایک مصنف کی حقیقت کو سمجھنا اور
اس کے طرز کلام کو اسی طرح پہچاننا سیکھا۔ جیسے کہ میں کسی
دوست سے ہاتھ ملا کر اس کی گرفت کو پہچان لیتی ہوں۔

میں اول اول میں لاطینی پڑھنے پر رضامند نہ تھی۔ مجھے
ہر لفظ کی ترکیب کرنے پر تضیع اوقات کرنا بے معنی سا معلوم
ہوتا تھا۔ یعنی یہ بیان کرنا کہ یہ اسم ہے۔ مضاف یا مضاف الیہ
ہے۔ واحد ہے مونث ہے وغیرہ حالانکہ اس کے معنی بالکل
عیاں ہوتے تھے میں نے یہ خیال کیا۔ کہ اس سے تو
علم الحیات کی رو سے اپنی پالتو بلی کا تذکرہ بطور تحلیل بہتر
ہوگا۔ تاکہ دوسرے حیوانات سے اس کی تمیز یوں کی جائے
مثلاً نوع ریڑھ دار حیوان قسم چوپایہ۔ گروہ۔ دودھ پلانیوالا
جنس بشیر سے مشابہ۔ قسم ادنےٰ یعنی بلی۔ نام ٹیبی لیکن
جوں جوں میں نے اس مضمون کا غائر نظر سے مطالعہ کیا۔
میں اس کو دلچسپ پانے لگی۔ اور اس زبان کی خوبیوں سے
محظوظ ہونے لگی۔ میں اکثر لاطینی عبارت پڑھ کر اپنی دل لگی کیا
کرتی تھی۔ اور ان الفاظ کو جنہیں میں سمجھتی تھی چن کر ان کا مطلب
سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب تک مجھے اس تفریح میں
حظ آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے خیالات اور حسیات
سے بڑھ کر کوئی منظر دلفریب نہیں ہو سکتا۔ جو جلد صفحۂ دل
سے محو ہو جانے والے ہوں۔ اور اس زبان سے علاقہ
رکھتے ہوں۔ جیسے کوئی شخص ابھی ابھی سمجھنے لگا ہو۔ وہ
تصورات ذہن کے آسمان پر ادھر سے ادھر گشت لگاتے
رہتے ہیں۔ اور ایک متلون قوت متخیلہ ان میں رنگ آمیزی
کرکے ان کی صورت قائم کرتی رہتی ہے۔ ان اسباق کی تحصیل
میں مس سلیون صاحبہ میرے ساتھ موجود ہوتی تھیں۔ اور جو
کچھ مسٹر آئرنز بیان کرتا تھا۔ اس کا میرے ہاتھ پر ہجا کرتی

جاتی تھیں۔ اور ساتھ ہی میرے لئے نئے الفاظ تلاش کرتی جاتی تھیں۔ اپنے وطن ایلا باما کو لوٹتے وقت میں سیزر[۵۱] کا تذکرہ موسوم بہ "جنگ فرانس" پڑھنے لگی تھی۔

سترھواں باب

جرمن کی تحصیل لب خوانی کے ذریعے گفتگو سیکھنا نیویارک میں قیام حساب اور طبعی جغرافیہ کی تعلیم

میں ۱۸۹۴ء کے موسم گرما میں اس مجلس میں شریک ہوئی۔ جو شوٹو کوا میں منعقد ہوئی۔ اس انجمن کا مقصد گونگوں اور بہروں کو تقریر سکھانا تھا۔ وہاں یہ انتظام کیا گیا۔ کہ میں شہر نیو یارک کے بہروں کے مدرسے میں جس کا نام رائٹ ہیومین سکول تھا داخل ہو جاؤں، میں وہاں مس سلیون صاحبہ کے ہمراہ اکتوبر ۱۸۹۴ء میں گئی۔ اس مدرسے کا انتخاب خاص طور پر اس مقصد کے لئے کیا گیا۔ کہ وہاں آواز کی تربیت اور لبوں کو چھو کر گفتگو کا مفہوم سمجھنے کے بہترین فایدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں کام کرنے کے علاوہ میں نے اس سکول میں دو سال تک حساب۔ جغرافیہ طبعی۔ فرانسیسی اور جرمن زبان کا مطالعہ بھی کیا میری جرمن کی اُستانی مس ریمی دستی حروف تہجی کا استعمال جانتی تھیں۔ جب میں نے اس زبان کا تھوڑا سا ذخیرۂ الفاظ حاصل کر لیا۔ تو ہم دونوں موقع پا کر جرمن زبان میں اظہار خیالات کیا کرتی تھیں۔ اس مشق سے چند مہینوں ہی میں اس قابل ہو گئی۔ کہ ان کی ہر ایک بات کا مطلب سمجھنے لگی۔ پہلے سال کے اختتام سے پیشتر ہی میں جرمن مصنف ولیم ٹیل کا کلام نہایت لطف کے ساتھ پڑھ لیتی تھی۔ میرا خیال ہے۔ کہ درحقیقت میں نے دوسرے مضامین کی نسبت جرمن میں بہت زیادہ ترقی کی تھی۔ مجھے اس کے مقابلے میں فرانسیسی بہت مشکل معلوم ہوئی۔ میں نے میڈم آلیویر ایک فرانسیسی خاتون سے یہ زبان پڑھی تھی۔ جو دستی حروف تہجی کا استعمال نہیں جانتی تھیں۔ اور اپنی تعلیم زبانی ہی دے سکتی تھیں میں اس کے لبوں کی حرکات بآسانی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ پس اس زبان میں بمقابلہ جرمن، میری ترقی بہت ہی کم تھی۔ تاہم میں نے فرانسیسی کتاب "لا میڈیسن مالگری لوئی" کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ کافی دلچسپ تھی لیکن مجھے یہ اتنی مرغوب نہ تھی

---

[۵۱] (سنہ ۱۰۰ سے سنہ ۴۴ قبل مسیح) جولیس سیزر۔ روما الکبریٰ کا فاتح عظیم۔ اس کی فتوحات اٹلی سے فرانس اور انگلستان تک شامل ہیں۔ آخر کار روما کا بے تاج بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ لیکن امرا کے حسد کا شکار ہو کر قتل کیا گیا۔ (مترجم)

جتنی کہ ولیم ٹیل کی کتاب۔

لب خوانی اور گفتگو کرنے میں میری ترقی اس درجہ نہیں ہوئی۔ جتنا کہ میرے اُستاد اور خود مجھے اس کی توقع تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح بات چیت کروں اور میرے معلمین کو یہ یقین تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے لیکن اگرچہ ہم نے دلی توجہ سے اس پر محنت صرف کی۔ تاہم وہ مقصد پوری طرح حاصل نہ ہوسکا۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہمارا مقصد بہت بلند تھا۔ اس لئے ناامیدی کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ حساب کو اب بھی میں اب بھی چور گڑھوں کا ایک نظام تصوّر کرتی تھی۔ جس میں جا بجا ٹھوکروں کے سوائے کچھ نہ تھا۔ میں اس کی مشق کے دوران میں قیاس کی خطرناک سرحد پر کھڑی رہتی۔ اور استدلال کی وسیع وادی سے بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ جس سے مجھے اور دوسروں کو بے انتہا تکلیف ہوتی تھی۔ جب میں قیاس سے بچتی تو نتائج پر سرعت کے ساتھ اچھل کر پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ نقص علاوہ میری کند ذہنی کے میری مشکلات میں اور بھی ضرورت سے زیادہ اضافہ کرتا تھا۔ اگرچہ یہ ناامیدی کی حالتیں بسا اوقات مجھے نہایت افسردہ خاطر کر دیتی تھیں۔ تاہم میں نے دوسرے مضامین بالخصوص طبعی جغرافیہ کا مطالعہ اَن تھک دلچسپی کے ساتھ جاری رکھا۔ قدرت کے اسرار کا حال معلوم کرنا موجب مسرت تھا۔ جیسا کہ توریت کی پُر لطف زبان میں مذکور ہے۔ کہ "ہوائیں آسمانوں[51] کے چاروں کونوں سے چلنے کیلئے بنی ہیں بخارات زمین کے سوتوں پر سے اُوپر چڑھتے ہیں۔ دریا چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں اور پہاڑ[52] انکی جڑوں سے اُکھاڑ کر نصب کر دئے گئے ہیں" ان طریقوں کا معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ تھا کہ کس طرح انسان بہت سی ایسی قوتوں پر جو اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں (عقل کے زور سے) قبضہ حاصل کرسکتا ہے۔ نیویارک میں دو سال نہایت خوشی سے بسر ہوئے۔ اور مجھے ان کی یاد سے حقیقی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے بالخصوص وہ سیر بخوبی یاد ہے۔ جو ہم سب مل کر ہر روز مرکزی پارک (باغ) میں کیا کرتے تھے۔ اس شہر کا یہی ایک حصّہ مجھے بہت مرغوب تھا۔ اس وسیع پارک میں اپنی مسرت کو رتی بھر ضائع نہ ہونے دیتی تھی۔ میں ہر دفعہ اس میں داخل ہو کر اس کا حال دوسروں سے معلوم کرنا پسند کرتی تھی۔ کیونکہ یہ ہر پہلو سے خوشنما معلوم ہوتا تھا اور اس کے یہ پہلو اتنے تھے۔ کہ ان کے ذریعے سے میرے نیویارک کے نو ماہ کے قیام کا ہر ایک دن اس سبزہ زار

---

۵۱ انّ فی خلق السموٰات والارض یعقلون

قرآن مجید پارہ ۲۔ رکوع ۱۹

۵۲ افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت .... والی الجبال کیف نصبت۔ پارہ ۳۰۔ سورہ غاشیہ

کو ایک نرالی دلفریبی کی صورت میں میرے روبرو پیش کرتا تھا۔

موسم بہار میں ہم مختلف دلچسپ مقامات کی گشت کو نکل جاتی تھیں۔ دریائے ہڈسن میں جہاز رانی کرنا اس کے سرسبز کناروں پر گشت لگانا جس کے متعلق برائنٹ[1] نے نظمیں لکھی ہیں۔ ہمارا دلخوش کن شغل تھا۔ مجھے کنٹروں کی سادگی اور جنگلی عظمت بہت پسند تھی۔ جن مقامات کی میں نے سیر کی ان میں ویسٹ پوائنٹ، ٹیری ٹون، واشنگٹن ارونگ کا گھر جہاں میں پیدل چل کر گئی قابل ذکر ہیں۔ رائٹ ہیومین سکول کے معلمین ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی تجاویز سوچتے رہتے تھے۔ جن سے وہ اپنے بہرے شاگردوں کو ہر قسم کا فایدہ پہنچا سکیں۔ جو گوش ہوش رکھنے والوں کو حاصل تھا۔ اور جن سے وہ چھوٹے بچوں کے چند میلانات اور مجہول یادداشتوں کو ان کے حق میں مفید اور کارآمد بنا سکتے تھے۔ تاکہ انہیں ان کٹھن حالات سے جن میں ان کی زندگیاں گھری ہوئی تھیں۔ باہر نکال سکیں۔ نیویارک سے روانہ ہونے سے پیشتر مجھے ایک صدمۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ جو میرے والد مرحوم کی موت کے صدمہ سے کم نہ تھا۔ اور اس طرح ان مسرت کے چمکیلے ایام میں ایک تاریکی پیدا ہو گئی۔ یعنی بوسٹن کے مسٹر جان سپالڈنگ فروری ۱۸۹۶ء میں اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ صرف وہی احباب جنہیں ان سے گہری محبت تھی سمجھ سکتے ہیں۔ کہ میرے نزدیک ان کی دوستی کیا وقعت رکھتی تھی۔ وہ بزرگ جو ہر شخص کی راحت کا سامان نہایت عمدگی اور بغیر کسی مزاحمت کے مہیا کرتے تھے مجھ سے اور مس سلیون صاحبہ سے بے حد انس رکھتے تھے۔ جب تک کہ ہم ان کی محبت بھری موجودگی کو محسوس کرتی رہیں اور یہ جانتی تھیں کہ وہ ہمارے کام میں جو بہت سی مشکلات سے پر تھا ایک نگہبان کی سی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہم کبھی ہمت نہیں ہارتی تھیں۔ ان کے انتقال سے ہماری زندگی میں ایک ایسی خالی جگہ پیدا ہو گئی۔ جو آج تک کبھی پر نہیں ہوئی۔

اٹھارھواں باب

کالج کی تیاری کیلئے کیمبرج سکول میں داخلہ

تعلیم کی شاہراہ طریق امتحان

اکتوبر ۱۸۹۶ء میں میرا داخلہ زنانہ کیمبرج سکول میں اس غرض سے ہوا کہ میں ریڈکلف کالج کی اعلٰے تعلیم کے لئے تیار کی جاؤں۔ جب میں چھوٹی سی لڑکی تھی۔ تو ایک مرتبہ مجھے ولزلے کالج میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت

---

[1] پورا نام ولیم کولن برائنٹ ہے۔ امریکہ کا مشہور شاعر اور مدیر تھا۔
تاریخ پیدائش ۱۷۹۴ء تاریخ وفات ۱۸۷۸ء (مترجم)

میں نے اپنے احباب کو اپنے اس اعلان سے حیرت زدہ کیا
تھا۔ کہ " دیکھ لینا، میں کسی دن کالج میں داخل ہونگی۔ لیکن میں
کسی معمولی کالج میں نہیں۔ بلکہ ہیرورڈ یونیورسٹی میں داخل ہونگی۔"
جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا۔ کہ " تم ولزے میں کیوں داخل
نہیں ہونا پسند کرتی ہو؟" تو میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا
" اس لئے کہ وہاں صرف لڑکیاں ہی تعلیم پاتی ہیں۔" کالج
میں داخل ہونے کے خیال نے اس وقت سے میرے دل
میں جڑ پکڑ لی تھی۔ اور وہ خیال ایک شدید خواہش میں منتقل
ہو چکا تھا۔ جس نے مجھے یہ ترغیب دی کہ باوجود بہت سے
مخلص اور دانا احباب کی مخالفت کے میں ڈگری حاصل کرنے
کے لئے بینا اور سامع لڑکیوں کے ساتھ میدان مقابلہ
میں نکلوں۔ جب میں نے نیویارک کو خیرباد کہی تو یہ خیال
میرا ایک نصب العین بن چکا تھا۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا
کہ میں کیمبرج میں داخل ہوجاؤں۔ یہاں کا داخلہ ہیرورڈ
تک پہنچنے کے لئے ایک نہایت قریبی زینہ اور میرے بچپن
کے دعوے کو عمل میں لانے کا ایک ذریعہ تھا۔ کیمبرج میں
یہ تدبیر اختیار کی گئی۔ کہ مس سلیون صاحبہ میرے ساتھ
جماعت میں بیٹھا کریں۔ اور جو تعلیم دیجائے۔ اس کی میرے
لئے تشریح کرتی جائیں۔ میرے معلمین کو صحیح و سالم قوار کے
شاگردوں کے سوا اور کسی مجھ جیسے شاگرد کو تعلیم دینے کا
تجربہ حاصل نہ تھا۔ اور میرے لئے ان سے گفتگو کرنے کا
کوئی اور ذریعہ سوائے ان کی لب خوانی کے نہ تھا۔ پہلے سال
میں نے انگریزی، تاریخ، علم ادب، جرمن، لاطینی ادب
حساب، لاطینی مضمون نویسی اور گاہے گاہے مقدمات
مضامین کا مطالعہ کیا۔ اُس وقت تک میں نے مطالعہ کا
کوئی کورس اس خیال سے اختیار نہیں کیا تھا۔ کہ میں کالج
کی تیاری کرونگی۔ لیکن مس سلیون صاحبہ نے مجھے انگریزی
کی بخوبی مشق کرا رکھی تھی۔ اور میرے مدرسین پر یہ حقیقت
جلد ہی آشکارا ہو گئی۔ کہ میں اس مضمون (انگریزی) میں
کسی خاص توجہ کی محتاج نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان
کتب کا تنقیدی طور پر مطالعہ کر لیا کروں۔ جو کالج کی طرف
سے مقرر کر دیجائیں۔ مزید براں میں نے فرانسیسی میں اچھی
ابتدا کی تھی۔ چھ ماہ تک لاطینی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور
جرمن تو وہ مضمون تھا۔ جس پر میں سب مضامین سے زیادہ
حاوی تھی۔ باوجود ان فواید کے جو مجھے حاصل تھے میری ترقی
میں بعض شدید رکاوٹیں حائل تھیں۔ مس سلیون صاحبہ میرے
ہاتھ پر اتنا مواد، جو کتب میں تھا، ہجا کے ذریعے کیسے رکھ سکتی
تھیں۔ اور یہ بھی بہت مشکل تھا۔ کہ تمام درسی کتب اُبھرے
ہوئے حروف کی شکل میں تیار ہو سکیں۔ جو وقت پر کار آمد
ہوں۔ اگرچہ لنڈن اور فلاڈلفیا میں ایسے احباب تھے۔ جو
اس کام کو بسرعت تمام تیار کرا دینے کے لئے رضامند تھے۔
تاہم کچھ عرصہ تک مجھے اپنی لاطینی کو بریل کے طریق پر لکھ کر

محفوظ کرنا پڑا۔ اور اس طرح میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ لاطینی میں نظم خوانی کر سکتی تھی۔ معلمین جلد ہی میری نامکمل تقریر سے آشنا ہو گئے تھے۔ اور اب وہ میرے سوالات کا جواب معاً دیکر میری اغلاط کو درست کرنے لگے تھے۔ میں جماعت میں نوٹ اور مشقیں نہیں لکھ سکتی تھی۔ لیکن میں اپنے تمام مضامین اور تراجم کو گھر پر اپنی ٹائپ رائٹر مشین پر لکھ لیتی تھی۔ مس سلیون روزمرہ میرے ساتھ جماعت میں جایا کرتی تھیں اور اُس تمام تعلیم کا جو مدرسین زبانی دیتے تھے۔ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ میرے ہاتھ پر ہجا کر دیتی تھیں۔ مطالعہ کے اوقات میں انہیں میری خاطر الفاظ کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ اور انہیں ان یادداشتوں اور کتب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ جو مجھے ابھری تحریر میں میسر نہ تھیں۔ اس کام کی کلفت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

فراو گرو ٹی (میری جرمن کی اُستانی) اور مسٹر گلمین پرنسپل مدرسہ یہی دو اساتذہ تھے۔ جنھوں نے مجھے تعلیم دینے کی خاطر دستی حروف تہجی کا استعمال سیکھا تھا۔ فراو گرو ٹی سے بڑھ کر کسی اور نے اس امر کو بخوبی نہیں سمجھا۔ کہ اس کا طریقِ ہجا کسقدر سست رفتار اور ناکافی ہے۔ تاہم اس نے نیک نیتی کے خیال سے نہایت محنت کے ساتھ اپنی ہدایات ہفتہ میں دو مرتبہ اپنے خاص اسباق میں مس سلیون کو آرام دینے کے لئے دستی ہجا کے ذریعے دینا شروع کیں

اگرچہ وہاں ہر شخص ہماری امداد کے لئے تیار اور ہم پر مہربان تھا۔ پھر بھی ایک اور صرف ایک ہاتھ میں اتنی قدرت تھی کہ وہ اس بے لطف محنت کے کام کو مسرت میں تبدیل کر دیتا تھا۔ یہ دستِ قدرت مس سلیون ہی کو عطا ہوا تھا۔ اس سال میں نے حساب کو ختم کر کے لاطینی گرامر کو دہرایا۔ اور سیزر کی لاطینی کتاب "جنگ فرانس" کے تین ابواب پڑھے جرمن زبان میں کچھ تو مس سلیون کی امداد اور کچھ اپنی انگشت گردی کے ذریعے میں نے جرمن مصنفین شلر۔ ہائین۔ فریٹیگ۔ راجیل۔ بیسنگ اور گوئیٹے کی ایک ایک تصنیف کا مطالعہ کیا۔ مجھے ان جرمن کتب کے مطالعہ نے بیحد محظوظ کیا۔ بالخصوص شلر کی نادر نظمیں، شہنشاہ فریڈرک اعظم کی سرگزشت اور اس کے عظیم الشان کارنامے اور گوئیٹے کی سوانحعمری موجب مسرت تھی۔ مجھے کتاب ڈائی ہرز رینر کو ختم کر کے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ یہ کتاب انگور پوش پہاڑیوں کے دلآویز تذکروں اور پُر لطف ظرافت سے معمور تھی۔ اسی میں اُن ندیوں کا ذکر تھا۔ جو سورج کی روشنی میں اپنی لہروں کے ترنم سے سوز و ساز پیدا کرتی ہیں۔ ان جنگلی خطوں کا بیان تھا۔ جو روایتاً متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطوں کا تذکرہ ایک ایسے عہدِ قدیم کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ جس کو ختم ہوئے مدت دراز گزر چکی تھی۔ اور جس کا وجود محض عالمِ خیال میں تھا۔ اس قسم کی طرزِ تحریر کچھ انہیں

لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ جو نظام قدرت کے ساتھ ایک خاص لگاؤ جذبۂ الفت اور عشق رکھتے ہوں۔ مسٹر گلبین نے اس سال کے کچھ حصے میں مجھے انگریزی علم ادب کی تعلیم دی۔ ہم دونوں نے ملکر شیکسپیر کا ناٹک "ایز یو لائیک اِٹ" (جس طرح چاہو پسند کرو) برک[۵۱] کی تقریر "امریکہ کے ساتھ صلح" اور میکالے کی تصنیف "سیموئیل جانسن کی سوانحعمری" کا مطالعہ کیا۔ تاریخ اور ادب کے متعلق پرنسپل گلبین کے وسیع اظہارات اور اُن کی تیز طرار تشریحات کی مدد سے میرا کام بہت سی حد تک آسان اور پُرلطف ہوگیا تھا۔ اگر میں فقط یادداشتوں ہی کو ایک مشین کی طرح پڑھ کر اُن کے ساتھ جماعت میں حاصل کی ہوئی ضروری اور مختصر تشریحات پر کفایت کر لیتی، تو اس سے وہ مدعا کبھی حاصل نہ ہوتا۔ جو پرنسپل صاحب کی مدد سے ہوا۔ کسی اور کتاب کے مقابلے میں جو میں نے سیاست مدن کے موضوع پر پڑھی۔ برک کی تقریر زیادہ علم بخش تھی میرا قلب اُن شوریدہ ایام کے ساتھ متحرک ہو رہا تھا۔ جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا تھا۔ اور وہ اشخاص جن کے ارد گرد متخاصم قومیں چکر لگا رہی تھیں۔ عین میری آنکھوں کے سامنے حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ جب میں نے برک کی تقریر کو پڑھا۔ جو فصیح البیانی کے سمندر میں موجیں مار رہی تھی۔ تو میں پہلے سے زیادہ حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی۔ کہ شاہ انگلستان جارج سوم اور اس کے وزراء کی سمجھ میں اتنی سی بات کیوں نہ آئی۔ کہ اُنہوں نے ہماری (امریکہ والوں کی) فتح اور اپنی شکست کے متعلق اس کی (برک کی) تنبیہ کن پیشینگوئی کی طرف سے اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی[۵۳]۔ اس کا سبب اس وقت میری سمجھ میں آیا۔ جبکہ میں نے اس مدبرِ اعظم کے افسوسناک تعلقات کی تفصیل معلوم کی۔ جو اس کے اور اس کی جماعت اور لوگوں کے نمائندوں کے مابین قائم تھے۔ مجھے

---

۵۱ ایڈمنڈ برک۔ تاریخ پیدائش ۱۷۲۹ء تاریخ وفات ۱۷۹۷ء ڈبلن کے ایک وکیل کا لڑکا تھا۔ ۱۷۵۰ء میں لندن آیا اور پارلیمنٹ میں داخل ہوکر رفتہ رفتہ وزیر ہوگیا۔ بہت بڑا لسان اور فصیح البیان تھا۔ (مترجم)

۵۲ ٹامس بنیگٹن میکالے۔ تاریخ پیدائش ۱۸۰۰ء تاریخ وفات ۱۸۵۹ء ملکہ وکٹوریہ کے عہد کا بلند پایہ تاریخ دان تھا۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کے بعد ہندوستان میں بنگال کونسل کا رکن ہوکر آیا۔ انگلستان واپس جاکر دوبارہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ پھر وزیر جنگ رہا اور "لارڈ" کا خطاب حاصل کیا۔ (مترجم)

۵۳ امریکہ کی جنگِ خودمختاری ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۳ء تک جاری رہی۔ جبکہ امریکہ والوں نے انگریزوں کی دست برد سے نجات اور آزادی حاصل کی۔ برک نے شاہ انگلستان کو امریکہ کے خلاف فوج کشی سے منع کیا تھا۔ (مترجم)

یہ خیال کر کے تعجب اور افسوس ہوا۔ کہ حکمت اور صداقت کے قیمتی بیج جہالت اور بربادی کے خس و خاشاک میں پڑ کر ضائع ہو گئے! میکالے کی کتاب "سیموئیل جانسن کی سوانحعمری" ایک مختلف طریق سے دلچسپ تھی۔ میرا دل اس تنہا انسان[۵۱] کے ساتھ ہمدردی سے معمور ہو گیا۔ جسے لندن کے بازار گرب سٹریٹ میں سو مصیبتیں اُٹھا کر روٹی کا ٹکڑا میسر آتا تھا۔ لیکن اس تمام مشقت جسمانی اور روحانی تکلیف کے باوجود وہ ہمیشہ ملائمت کے ساتھ گفتگو کرتا اور غریب اور نفرت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے ہر وقت اپنا ہاتھ بڑھاتا تھا۔ میں اس کی تمام کامیابیوں پر خوش و خرم ہوتی تھی۔ اس کے نقائص سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ اور میں اس لئے متعجب نہیں ہوتی تھی۔ کہ اس میں وہ نقائص موجود تھے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے باوجود اس نے اپنی رُوح کو کچلنے یا پست ہونے سے بچائے رکھا۔ لیکن میکالے کی روشن اور واضح طرز تحریر اور معمولی واقعات کو تازگی اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرنے کے قابل تعریف وصف کے باوجود میں اس کے حد سے زیادہ تیقن اور اعتماد سے بسا اوقات اُکتا جاتی تھی۔ اور اکثر اوقات حقیقت کو اپنے انداز بیان کی اثر نمائی پر قربان کر دینا مجھ پر ایک ایسی حالت استفسار طاری کر دیتا تھا۔ جو اس احترام اور توقیر کی حالت سے مختلف ہوتی تھی۔ جسے دل میں لئے ہوئے میں برطانیہ کلاں کے اس ڈیما تھینز[۵۲] (یعنی برک) کی تقریر کو اپنے تخیل میں سنتی تھی۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں نے کیمبرج سکول میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی رفاقت کا حظ اُٹھایا۔ میں چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ سکول کے ملحق خوشنما مکانات میں سے ایک میں رہتی تھی۔ یہی وہ مکان تھا جہاں مسٹر ہاویلز[۵۳] رہا کرتے تھے۔ اور ہم سب کو خانگی زندگی کے فواید میسر تھے۔ میں بہت سی کھیلوں میں ان لڑکیوں کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ حتےٰ کہ "اندھے کے تھپڑ"[۵۴]

---

[۵۱] ڈاکٹر سیموئیل جانسن سے مراد ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۷۰۹ء تاریخ وفات ۱۷۸۴ء انگلستان کا بہت قابل لغت نویس، اور مصنف تھا۔ اس نے ابتدا میں نہایت مفلسی اور غربت میں زندگی بسر کی تھی۔ (مترجم)

[۵۲] تاریخ پیدائش ۳۸۵ قبل مسیح تاریخ وفات ۳۲۲ قبل مسیح یونان کا بہت بڑا مقرر اور فصیح البیان مدبر تھا۔ اس کی اکسٹھ[۶۱] تقریریں اب تک محفوظ ہیں۔ جوش تقریر کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

[۵۳] ولیم ڈین ہاویلز۔ تاریخ پیدائش ۱۸۳۷ء تاریخ وفات ۱۹۲۰ء امریکہ کے موجودہ بہترین افسانہ نویسوں میں سے تھا۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک اٹلی کے شہر وینس میں امریکہ کی طرف سے کونسل کے عہدے پر تعینات رہا۔

[۵۴] بچوں کا ایک کھیل ہے جس میں ایک بچے کی آنکھیں باندھ دیتے ہیں اور اگر وہ کسی اور بچے کو پکڑ کر اس کا نام بتا دے تو اس کی باری اندھا بننے کی آجاتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں باندھی جاتی ہیں۔ (مترجم)

اور بعض برف پر کھیلنے کی تفریحوں میں بھی حصّہ لیتی تھی۔ میں ان کے ساتھ دور تک سیر کرنے کو نکل جاتی تھی۔ اس سیر کے دوران میں ہم سب اپنے مضامین درسی پر بحث کرتیں۔ اور وہ لڑکیاں ان چیزوں کو جو ہمیں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں باآواز بلند پڑھایا کرتی تھیں۔ بعض لڑکیوں نے مجھ سے کلام کرنا سیکھ لیا تھا۔ پس مس سلیون کو ان کی گفتگو کے اعادہ کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی تھی۔ کرسمس کے ایام میں اماں جان اور ہمشیرہ نے میرے ساتھ تعطیلات کا زمانہ بسر کیا۔ اور مسٹر گلمین نے ازراہِ کرم ملڈریڈ کو اپنے سکول میں پڑھنے کی اجازت عطا کی۔ پس وہ کیمبرج میں میرے ساتھ رہی۔ اور مسرت کے چھ مہینوں میں ہم لحظہ بھر کو بھی جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میں ان اوقات کو یاد کرکے بیحد مسرور ہوتی ہوں۔ جو ہم نے ایک دوسرے کی پڑھائی میں امداد کرتے ہوئے اور تفریح میں شریک ہوتے ہوئے بسر کئے تھے۔ میں ریڈکلف کے تیاری کے امتحان میں ۲۹- جون سے ۳- جولائی ۱۸۹۷ء تک شریک ہوئی۔ میرے مضامین یہ تھے۔ ابتدائی اور اعلےٰ جرمن، فرانسیسی، لاطینی، یونانی، انگریزی اور روما کی تاریخ ان تمام مضامین کے امتحان میں ۹ گھنٹے صرف ہوئے میں ان میں کامیاب ہوئی۔ اور جرمن اور انگریزی میں اعزاز کے ساتھ پاس ہوئی۔ اس مقام پر اس طریقِ امتحان کی تشریح بے محل نہ ہوگی۔ جو اس وقت رائج تھا۔ ہر امیدوار کو سولہ[19] گھنٹوں کے امتحان میں پاس ہونا لازمی تھا۔ ان میں بارہ گھنٹے ابتدائی مضامین اور چار اعلےٰ مضامین کے مقرر تھے۔ ان کا شمار اُس وقت کیا جاتا تھا۔ جبکہ وہ بیک وقت پانچ گھنٹوں کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے۔ سوالات کے پرچے ہیرورڈ یونیورسٹی میں نو بجے تقسیم ہوتے تھے۔ اور ایک خاص قاصد کے ذریعے ریڈکلف میں پہنچائے جاتے تھے۔ ہر امیدوار کو نام لکھنے کی بجائے اپنا رول نمبر لکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ میرا رول نمبر ۲۳۳ تھا۔ لیکن چونکہ مجھے جوابات لکھنے میں اپنا ٹائپ رائٹر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے میری اصلیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ مناسب سمجھا گیا کہ مجھے ایک علیحدہ کمرۂ امتحان دیا جائے۔ کیونکہ ٹائپ رائٹر کی آواز دوسری لڑکیوں کے کام میں مخل ہوتی تھی۔ مسٹر گلمین سوالات کے تمام پرچوں کو دستی حروفِ تہجی کے ذریعے مجھے پڑھ کر بتا دیتے تھے۔ کمرے کے دروازہ پر ایک پہرہ دار مقرر تھا۔ تاکہ وہ ہر قسم کی مزاحمت کا سدِّباب کرتا رہے۔ پہلے دن جرمن کا امتحان ہوا۔ مسٹر گلمین نے میرے پاس بیٹھ کر پہلے تمام پرچے کو مجھے آخر تک پڑھ کر بتایا۔ اس کے بعد جملہ بہ جملہ سُنایا۔ اسی اثناء میں میں ان کے الفاظ کو بلند آہنگی سے دُہراتی جاتی تھی۔ تاکہ اس امر کا یقین ہو جائے کہ میں ان کا مفہوم بخوبی سمجھ رہی ہوں۔ پرچے مشکل تھے۔ اور میں اپنے جوابات ٹائپ رائٹر پر لکھنے کے دوران

میں بہت فکرمند رہی۔ مَیں جو کچھ لکھتی تھی۔ مسٹر گلیسن اُس کا اعادہ بذریعہ دستی حروف تہجی کرتے جاتے تھے۔ اس اثناً میں ' مَیں ضرورتاً بعض تبدیلیاں بتاتی جاتی تھی۔ جنہیں وہ پرچۂ جوابات میں درج کر دیتے تھے۔ مَیں یہاں بتا دینا چاہتی ہوں۔ کہ مجھے جو یہ رعایت دی گئی' وہ اس سے قبل کسی امتحان میں نصیب نہیں ہُوئی تھی۔ ریڈکلف میں کسی نے مجھے پرچۂ جوابات لکھے جانے کے بعد دوبارہ نہیں سُنایا اور جب تک کہ مَیں وقت ختم ہونے سے پیشتر پرچہ ختم نہ کر دوں۔ مجھے اپنی اغلاط کو درست کرنے کا موقع کبھی نہیں دیا گیا۔ اس صورت میں مَیں فقط اُن اغلاط کو درست کر سکتی تھی۔ جو مجھے ان چند منٹوں میں یاد آ سکیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی درستیوں کے متعلق مجھے پرچے کے آخر میں فقط ایک نوٹ لکھنے کی اجازت تھی۔ اگر مَیں ابتدائی امتحانات میں سے آخری امتحان کی نسبت زیادہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہُوئی' تو اس کی دو وجوہات تھیں۔ آخری امتحان میں کسی نے میرے جوابات مجھے پڑھ کر نہیں سُنائے۔ جس سے مَیں انکی اصلاح کر سکتی۔ اور ابتدائی امتحانات کے مضامین ایسے تھے جن سے کیمبرج سکول کے کام کی ابتدا سے پیشتر مجھے زیادہ واقفیت تھی۔ کیونکہ سال کی ابتدا میں انگریزی' تاریخ' فرانسیسی اور جرمن میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مجھے ان مضامین کی مشق مسٹر گلیسن نے ہیروڈ کے سابقہ پرچہ ہائے سوالات کے ذریعے سے کرا دی تھی۔ مسٹر گلیسن میرا تحریری کام ممتحن صاحبان کو اپنی ایک تصدیق کے ساتھ بھیج دیتے تھے۔ جو یہ تھی۔ کہ "رول نمبر ۲۳۳ نے پرچوں کے جوابات خود لکھے ہیں۔ کسی اور نے لکھ کر نہیں دیئے۔ تمام دوسرے ابتدائی امتحانات اسی طریق سے لئے گئے تھے۔ ان میں کوئی امتحان بھی اتنا مشکل نہ تھا۔ جتنا کہ پہلا امتحان تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جبکہ ہمیں لاطینی کا پرچۂ سوالات دیا گیا۔ پروفیسر شلنگ میرے کمرے میں آئے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مَیں جرمن میں تسلّی بخش طور پر پاس ہوگئی ہوں۔ اس سے میرا حوصلہ اتنا بڑھا کہ مَیں اس تمام کٹھن امتحانی آفت میں سے مستقل مزاجی اور سبک رفتاری اور سلامتی کے ساتھ گزر گئی۔

انیسواں باب

اعلیٰ تعلیم کی تیاری کا دوسرا سال تعلیم اور امتحان کی پیچیدگیاں مشکلات پر غالب آنا

جب گلیسن سکول میں میری تعلیم کے دوسرے سال کا آغاز ہُوا تو مَیں کامیاب ہونے کے لئے اور قوتِ ارادہ سے بھرپور تھی۔ لیکن ابتدائی چند ہفتوں میں مجھے ایسی دقتوں کا سامنا ہُوا۔ جن کی مجھے توقع نہ تھی۔ مسٹر گلیسن نے یہ فیصلہ کیا۔

کہ مَیں اس سال ریاضی کا خاص طور پر مطالعہ کروں۔ اس سال میرے مضامین طبیعات جبر و مقابلہ، جیومیٹری، علم ہیئت، یونانی اور لاطینی تھے۔ بدقسمتی سے میری بہت سی کتب مطلوبہ اُبھرے ہُوئے حروف میں وقت پر تیار نہ ہو سکیں، جنہیں مَیں اپنی جماعت میں شروع کرنا چاہتی تھی۔ اور میرے بعض مضامین کے لئے ضروری سامان کے مہیّا ہونے میں کمی رہی۔ میری جماعت بہت بڑی تھی اور مدرسین کے لئے یہ ناممکن تھا۔ کہ وہ مجھے خاص طور پر جُداگانہ تعلیم دیں۔ مس سلیون کو مجھے تمام کتب پڑھ کر سُنانے اور مدرسین کو میرے حسب حال ان کی تشریح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس تمام گیارہ برس کے عرصے میں پہلی مرتبہ مجھے یہ اندیشہ ہونے لگا۔ کہ شاید اسکا دستِ شفیق اس تمام محنت کے مقابلہ میں پُورا نہیں اُتر سکیگا۔ میرے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ مَیں جماعت میں الجبرا اور جیومیٹری کی پڑھائی کو تحریر میں لاؤں۔ اور طبیعات کے سوالات حل کروں۔ یہ اس وقت تک ناممکن تھا۔ جبتک کہ مَیں بریل کا[۵] آلۂ تحریر نہ خریدوں، جس کے ذریعے سے مَیں اپنے کام کا حل اور اس کی منازل کو لکھ سکتی تھی۔ مَیں تختۂ سیاہ پر کھینچی ہوئی اشکالِ اقلیدس کو تو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ البتہ اُن کو واضح طور پر سمجھنے کی غرض سے میرا واحد ذریعہ تصوّر یہ تھا کہ مَیں ان کو مستقیم اور منحنی تاروں کے ساتھ، جن کے سرے خمیدہ اور نوکدار تھے۔ ایک گدیلے یا تکیے پر بنا لیتی تھی۔ جیسا کہ مسٹر مرٹن کیتھ معلم ریاضی نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے مجھے ان اشکال کے حروف، دعویٰ، نتیجہ، ثبوت اور شکل کی بناوٹ کا عمل ذہن میں رکھنا پڑتا تھا غرض ہر مضمون میں دقتوں کا سامنا تھا۔ بعض اوقات میں ہمیں ہار دیتی تھی۔ اور اپنے محسوسات کو ایسے طریق سے ظاہر کرتی تھی کہ انہیں یاد کرتے ہُوئے بھی مجھے شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ میری پریشانی کی علامت سے مس سلیون کو بعد میں موردِ الزام بنایا جاتا تھا۔ یعنی ایسی خاتون کو جو وہاں کے تمام احباب میں ایک ہی ایسی ہستی تھی کہ میرے لئے پیچیدہ معاملات اور اُلجھنوں کو صاف اور سیدھا کر کے واضح کر سکتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ میری تمام مشکلات رفع ہونی شروع ہوئیں۔ مناسب وقت پر اُبھرے ہُوئے حروف کی کتابیں اور دوسرا سامان میسّر آگیا اور مَیں از سرِ نو اعتماد کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔ جبر و مقابلہ اور جیومیٹری فقط یہی دو مضامین تھے جن پر حاوی ہونے کے لئے میری تمام مساعی کو لگاتار مشکلات کا سامنا رہا۔ جیسا کہ مَیں نے اس سے قبل بیان کیا ہے۔ مجھے ریاضی کی طرف مطلق میلان نہ تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کے مختلف نکات میری حسب منشاء مجھے سمجھائے نہیں جاتے تھے۔ جیومیٹری کی اشکال بالخصوص پریشان کن تھیں۔ کیونکہ گدیلے پر بھی مَیں شکل کے مختلف حصّوں کا باہمی تعلق سمجھنے سے قاصر

[۵] دیکھو دیباچہ (مترجم)

رہی۔ تاوقتیکہ مسٹر کیتھ نے مجھے تعلیم دینے کا آغاز نہیں کیا۔ مجھے ریاضی کا تصور کبھی صاف طور پر نہیں ہوتا۔ میں ان مشکلات پر غالب آنے ہی کو تھی جبکہ ایک واقعہ ایسا پیش آیا۔ جس سے سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ کتب کے موصول ہونے سے بہت تھوڑا عرصہ پیشتر مسٹر گلیمن نے مس سلیون سے اس بنا پر کہ میں بہت سخت محنت کر رہی ہوں۔ بہت رد و قدح اور شکایت شروع کر رکھی تھی۔ اور باوجود میری صدائے احتجاج کے اُنہوں نے میری نظم خوانی کی مقدار میں کمی کر دی۔ ابتدا میں ہم اس امر پر متفق ہوتے۔ کہ مجھے کالج کی تیاری پر پانچ سال صرف کرنے چاہئیں لیکن پہلے سال کے اختتام پر میرے امتحان کی کامیابی سے مس سلیون اور اس سکول کی اوّل معلمہ مس ہاربرو پر یہ امر ثابت اور واضح ہو گیا کہ میں بغیر کسی خاص کوشش کے اپنی تیاری کو دو مزید سالوں میں مکمل کر سکتی ہوں۔ پہلے پہل مسٹر گلیمن بھی اس پر متفق تھے۔ لیکن جب میری مشقت قدرے سراسیمگی کا موجب ہوئی، تو انہوں نے اصرار کیا۔ کہ چونکہ مجھ پر کام کا بوجھ حد سے زیادہ پڑ گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان کے مدرسے میں تین سال مزید قیام کرنا چاہیئے۔ میں ان کی تجویز کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ میں اپنی جماعت کے ساتھ کالج میں داخل ہونا چاہتی تھی۔

۱۷۔ نومبر کو میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ اور میں اُس دن سکول نہیں گئی۔ اگرچہ مس سلیون کو معلوم تھا۔ کہ میری ناسازگیِ طبع چنداں شدید نہیں، تاہم جب مسٹر گلیمن کو علم ہُوا، تو انھوں نے کہا۔ کہ میری صحت میں انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے میرے مضامین میں ایسی تبدیلیاں کر دیں جن کے باعث میرے لئے اپنی جماعت کے ساتھ آخری امتحان میں شامل ہونا ناممکن ہو گیا۔ بالآخر مسٹر گلیمن اور مس سلیون میں اختلاف رائے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ امّاں جان نے مجھے اور میری ہمشیرہ ملڈریڈ کو کیمبرج سکول سے علیحدہ کر دیا۔ کسی قدر توقف کے بعد یہ انتظام کیا گیا کہ میں ایک اتالیق یعنی مسٹر مرٹن کیتھ، مدرس کیمبرج سکول کی زیر نگرانی میں اپنا مطالعہ جاری رکھوں۔ میں نے باقیماندہ موسم سرما مس سلیون کے ساتھ اپنے احباب یعنی چیمبرلین خاندان میں بوسٹن سے ۲۵ میل کے فاصلے پر رینتھم میں بسر کیا اکتوبر ۱۸۹۸ء میں ہم بوسٹن میں واپس آئیں۔ آٹھ ماہ تک مسٹر کیتھ نے مجھے ہفتہ میں پانچ مرتبہ نصف گھنٹے کے پیریڈ کے حساب سے اسباق پڑھائے۔ ہر مرتبہ وہ اس نکتے کی تشریح کر دیتے تھے، جو پچھلے سبق میں مجھے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے نیا کام بتا جاتے۔ اور یونانی کی مشقیں جو میں اپنی ٹائپ کی مشین پر لکھ رکھتی تھی۔ درستی کے لئے گھر لے جاتے تھے درستی کے بعد وہ مجھے واپس دیدیا کرتے تھے۔ اس طریق سے میری کالج کی تیاری بغیر کسی مزاحمت کے جاری رہی۔ مجھے جماعت میں پڑھنے کی بجائے تنہا طور پر تعلیم حاصل کرنا بہت سہل اور پُر لطف معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں نہ تو کسی قسم کی

عجلت تھی۔ اور نہ کوئی گھبراہٹ۔ میرے اتالیق کے پاس ان امور کی تشریح کے لئے کافی وقت ہوتا تھا۔ جنہیں میں سمجھ نہیں سکتی تھی پس میری تعلیم کی رفتار تیز ہوگئی۔ اور مدرسے کی نسبت میرا کام بہتر صورت اختیار کرنے لگا۔ مجھے اب بھی ریاضی کے مسائل کسی اور مضمون کے مقابلے میں زیادہ دقیق معلوم ہوتے تھے۔ کاش جبرو مقابلہ اور جیومیٹری، زباندانی اور علم ادب کے مقابلے میں نصف ہی آسان ہوتے۔ لیکن مسٹر کیتھ نو ریاضی کو بھی دلچسپ بنا دیتے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل ریاضی کو تراش تراش کر آسان صورت میں لے آتے تھے جس سے وہ میرے دماغ میں جگہ حاصل کر لیتے تھے اُنہوں نے میرے نفس کو چوکس اور مشاقِ علم بنا کر استدلال کے لئے اس کی ایسے صاف طور پر ترتیب کی تھی۔ جس سے وہ نتائج کو اطمینان اور سکون کے ساتھ منطقی طریق سے اخذ کر سکے، نہ کہ وحشیانہ طور پر ٹامک ٹوئیاں مارے۔ جس سے کسی منزل پر بھی پہنچا نہ جائے۔ خواہ میں کتنا ہی کند ذہنی کا ثبوت دوں وہ ہمیشہ شرافت اور حلم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یقین کیجیے کہ ریاضی میں میرا کودن پن ایسا تھا جسے دیکھ کر "صبر ایوب" کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ ۲۹۔ اور ۳۰۔ جون کو میں ریڈکلف کالج کے آخری امتحان میں شامل ہوئی۔ پہلے دن ابتدائی یونانی اور اعلےٰ لاطینی کا امتحان تھا۔ اور دوسرے روز جیومیٹری، جبرو مقابلہ اور اعلےٰ یونانی کا۔

کالج کے افسروں نے مس سلیون صاحبہ کو یہ اجازت نہ دی کہ وہ سوالات کے پرچے مجھے پڑھ کر بتائیں۔ اس غرض کے لئے اندھوں کے سکول پرکنز انسٹی ٹیوشن کے ایک اُستاد مسٹر یوجین وائننگ کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ ان پرچوں کی نقل امریکہ کی بریل کی تحریر کے مطابق کرے میرے نزدیک مسٹر وائننگ ایک اجنبی شخص تھا۔ اور وہ مجھ سے بریل کی تحریر کے سوائے اور کسی طرح گفتگو نہ کر سکتا تھا۔ سکول کا منتظم بھی ایک اجنبی شخص تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ اور کسی طریق سے اظہار خیالات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا زباندانی کے امتحان میں تو بریل کی تحریر بخوبی اور کافی کام دیتی رہی۔ لیکن جب جیومیٹری اور جبرو مقابلہ کی نوبت آئی، تو مشکلات رونما ہوئیں۔ میں بہت سراسیمہ ہونے لگی۔ اور اپنے قیمتی وقت کو بالخصوص جبرو مقابلہ میں ضائع ہوتے دیکھ کر میرا حوصلہ پست ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ میں بریل کے تمام مروجہ طریقوں یعنی انگریزی امریکن اور نیویارک کی طرز سے آشنا تھی۔ جو زباندانی کے لئے استعمال میں لائی جاتی تھی لیکن ان تینوں طریقوں میں جیومیٹری اور الجبرا کی علامات ایکدوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اور میں نے الجبرا کی مشق میں صرف انگریزی بریل کا استعمال کیا تھا۔ امتحان سے دو روز قبل مسٹر وائننگ نے مجھے الجبرا کے متعلق ہیرورڈ یونیورسٹی کے پرانے امتحانی پرچوں میں سے ایک کی بریل شدہ نقل بطور نمونہ

ارسال کی تھی، مجھے یہ معلوم کر کے گھبراہٹ ہوئی کہ وہ پرچہ امریکن بریل کی تحریر میں تھا۔ میں نے فوراً مسٹر واٹننگ کو ایک خط میں لکھا۔ کہ "آپ ان علامات کی تشریح کیجیے" اس کے جواب میں مجھے بواپسی ڈاک ایک اور پرچہ موصول ہوا۔ جس کے ساتھ ان علامات کا نقشہ شامل تھا۔ چنانچہ میں نے فی الفور اس نقشے کو سیکھنا شروع کیا۔ لیکن الجبرا کے امتحان سے پیشتر ایک رات جبکہ میں بعض نہایت پیچیدہ سوالات کے حل کرنے میں جدوجہد کر رہی تھی۔ میں خطوط وحدانی کی مختلف صورتوں اور آمیزشوں کی تمیز نہ کر سکی۔ میں اور مسٹر کیتھ دونوں ہی اس کے متعلق پریشان تھے۔ اور اگلے دن کے متعلق ہمیں وسوسات پیدا ہو رہے تھے لیکن ہم کالج میں گئے۔ اور امتحان شروع ہونے سے چند سے پیشتر ہم نے مسٹر واٹننگ سے ان علامات تحریر کی زیادہ واضح پر تشریح کرا لی۔ جیومیٹری میں بڑی مشکل یہ تھی۔ کہ مجھے ہمیشہ سے اشکال کے دعاوی کو چھپی ہوئی سطروں کے بموجب پڑھنے کی عادت رہی تھی۔ یا ان کا ہجا اپنے ہاتھ پر کرا لیتی تھی لیکن کسی خاص وجہ سے مجھے اُنہیں کو بریل کی تحریر میں پا کر گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ دعاوی میرے روبرو عیاں تھے۔ تاہم میں جو کچھ پڑھ رہی تھی۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نے الجبرا کا پرچہ شروع کیا۔ تو مجھے اور بھی دقت پیش آئی۔ کیونکہ وہ تازہ علامات جو میں نے حال ہی میں یاد کی تھیں مجھے حیران کئے دیتی تھیں۔ علاوہ ازیں میں جو کچھ اپنے ٹائپ پر لکھتی جاتی تھی اُسے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنا کام ہمیشہ یا تو بریل پر اور یا اپنے ذہن میں کیا تھا۔ زبانی سوالات حل کرنے کے لئے مسٹر کیتھ نے میری قابلیت پر بہت زیادہ اعتماد کیا تھا۔ اور مجھے امتحانی پرچوں کے لکھنے کی مشق نہیں کرائی تھی۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میرا امتحان کا کام تکلیف دہ طور پر سست رفتار رہا۔ اور پیشتر اس کے کہ میں مطلوبہ جواب کے متعلق ذہن میں کوئی خیال پیدا کر سکتی۔ مجھے ان سوالات کو بار بار پڑھنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ مجھے درحقیقت یہ یقین نہیں تھا۔ کہ میں تمام علامات کو درست پڑھ رہی ہوں یا نہیں۔ غرض مجھے اپنے ہوش و حواس کا قائم رکھنا دوبھر ہو گیا۔ لیکن میں اس کے متعلق کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتی۔ ریڈکلف کی انتظامی مجلس یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ میرے امتحانات کو کس قدر مشکل بنا رہی ہے۔ اور نہ انہیں ان حیرت انگیز مشکلات کا اندازہ تھا۔ جن پر مجھے غالب آنا پڑا۔ لیکن اگر انہوں نے نادانستہ طور پر میرے لئے مشکلات کو حل کیا، تو مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوتا ہے۔ کہ میں ان سب پر غالب آ گئی۔

(باقی آئندہ)

خادم محی الدین

آوارۂ محبّت

(۱)

اکثر سحر کے وقت مَیں نورِ سحر کی چھاؤں میں
جاتا ہوں گلشن کی طرف کرتا ہُوا آہ و فغاں

ہوتا ہے عالم نور کا از فرش تا عرشِ بریں
ہوتی ہے گویا آئینہ یکسر فضائے گلستاں

ہنستے ہیں غنچے اور گل سُن کر مری آہ و بُکا
ہوتا ہے نالوں پر مرے اُن کو ترانوں کا گماں

گاتے ہیں کس انداز سے مرغانِ خوش خوانِ چمن
ہوتی ہیں کتنی دل کشا اُن کی ترنم ریزیاں

لگتی ہے دل پر چوٹ سی بیتاب ہو جاتا ہوں مَیں
گرتا ہوں فرشِ خاک پر دل تھام کر بھرتا گھاں

تکتی ہے حیرت سے مجھے نرگس کی چشمِ سُرمگیں
کرتے ہیں سب اہلِ چمن آپس میں کچھ سرگوشیاں

بیتاب رہ کر دیر تک بیخود جو ہو جاتا ہوں مَیں
آتی ہے پھر بادِ صبا کرتی ہُوئی اٹھکھیلیاں

لاتی ہے بھر کر جھولیاں نکہت کی وہ میرے لئے
ہوتا ہوں اُس کو سُونگھ کر مَیں اور بھی کچھ سرگراں

(۲)

اکثر سحر کے وقت مَیں نورِ سحر کی چھاؤں میں
جاتا ہوں دریا کی طرف کرتا ہوا آہ و فغاں

ہوتی ہیں موجیں مضطرب سُن کر مری رودادِ غم
آتی ہیں ساحل کی طرف اُفتاں و خیزاں نوحہ خواں

ہو کر سراسر مضطرب بڑھتا ہوں ساحل کی طرف
گرتا ہوں مَیں دل تھام کر ساحل پہ ہو کر نیم جاں

آتا ہے چکّر میں بھنور، آتا ہے دریا جوش میں
اُٹھتا ہے طوفاں حشر زا کرتا ہُوا شور و فغاں

ہوتا نہیں لیکن مجھے احساس کچھ اس بات کا
زندہ ہوں مَیں یا مر گیا، دُنیا میں ہوں مَیں یا کہاں

رہتا ہوں ساکت دیر تک آتا ہے لیکن ہوش جب
ہوتا ہے آنکھوں سے مری اشکوں کا اک دریا رواں

(۳)

اکثر سحر کے وقت میں نورِ سحر کی چھاؤں میں
جاتا ہوں جنگل کی طرف کرتا ہوا آہ و فغاں

پڑتی ہیں نظریں چار سو لیکن کہیں جمتی نہیں
تکتا ہوں رہ رہ کر کبھی حسرت سے سوئے آسماں

مشرق سے ہوتا ہے عیاں جب آفتاب سرخ رو
اُس کی شعاعیں ہوتی ہیں میدان میں جب زرفشاں

دل کی لگی فوراً مجھے کرتی ہے آتش زیر پا
کرتا ہوں آہیں پے بہ پے اُٹھتا ہے سینے سے دھواں

گرتا ہوں پھر میں خاک پر بیتاب ہو کر یک بیک
ہوتا ہے نظروں میں مری تاریک دُنیا کا سماں

تا دیر یوں ہی ہمنفس! جلتا ہوں اپنی آگ میں
ہو جاتی ہے جب دوپہر اُٹھتا ہوں پھر میں نیم جاں

اُٹھ کر بگولے دشت کے آتے ہیں میرے پاس جب
خود رفتہ مجھ کو دیکھ کر کرتے ہیں وہ دلسوزیاں

مل کر گلے آپس میں وہ روتے ہیں میرے حال پر
جاتے ہیں پھر اک سمت کو کرتے ہوئے آہ و فغاں

ڈھلتی ہے جب پھر دوپہر ہوتی ہے آمد شام کی
پڑتی ہیں ٹھنڈی دمبدم خورشید کی سرگرمیاں

لاتی ہے میرے واسطے گلنار پیراہن شفق
ہو جاتی ہے وہ بھی مگر تاریکیٔ شب میں نہاں

---

(۴)

قسمت میں ہے اُفتادگی شکوہ کسی کا کیا کروں
کیوں میں کسی کا نام لوں کیوں ہوں کسی سے بدگماں

دلدادۂ الفت ہوں میں راضی ہوں میں ہر حال میں
اُس کی خوشی سے شاد ہوں اُس کی رضا میں شادماں

اک دن یہی آوارگی مونس مری بن جائے گی
اک دن یہی اُفتادگی ہو جائیگی راحت رساں

دو دن کا ہے یہ رنج و غم دو دن کی ہے یہ زندگی
اک دن مرے تن سے جُدا ہو جائے گی روح رواں

راز چاندپوری

رباعیاتِ صہبائی

(۱)

آزاد ہوں زردار نہیں ہوں نہ سہی
سرشار ہوں ہشیار نہیں ہوں نہ سہی
خمخانۂ عشق کا ہوں اک رند خراب
دانندۂ اسرار نہیں ہوں نہ سہی

(۲)

ہے جلوۂ ماہتاب ساقی! ساقی!
کر جام کو آفتاب ساقی! ساقی!
سیلابِ فنا ہے اور اپنی ہستی
ہے صورتِ نقش آب ساقی! ساقی!

(۳)

حورانِ بہشت کی تمنّا، بے سود!
ہنگامِ شباب زہد و تقویٰ بے سود!
لبریزِ نشاط ہے خمستانِ بہار
یادِ غمِ دوش و فکرِ فردا بے سود!

(۴)

ہر لحہ رہینِ مے پرستی ہوں مَیں
جس کا نہ خمار ہو وہ مستی ہوں مَیں
مینوشِ جمالِ جاوداں ہوں، یعنی
صہبائیِ خمخانۂ ہستی ہوں مَیں

"اثر صہبائی"

جرعات

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم
برسوں ہُوا نہ فیصلہ فتح و شکست کا
برسوں ستیزہ کار رہے آسماں سے ہم
اے وائے فکرِ راحت وصد وائے خوفِ دام
دیکھا کئے بہارِ چمن آشیاں سے ہم

اب کچھ تو فیصلہ ہو حیات و ممات کا — تنگ آگئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم
سجدے کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں — بیگانہ وار گزرے ہر اک آستاں سے ہم
سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی — کیا خوب بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم
کچھ پھول لینے آئے تھے اے باغباں مگر — کچھ داغ لے چلے ہیں ترے گلستاں سے ہم

رنگِ خیال رو کشِ فردوس ہے اثر
آئے ہیں مل کے عابدِ رنگیں بیاں سے ہم

اثر صہبائی

آئینۂ دل

نہ جانے کس قیامت کا اثر تھا جذب کامل میں — سمایا آکے خود حسنِ ازل آئینۂ دل میں
جھلکتا ہے اگر رنگِ حقیقت شیشۂ دل میں — جنوں کیوں پھر رہا ہے دربدر تحصیل حاصل میں
سیہ بختی میں بھی اک شان ہے مہماں نوازی کی — مکیں ہوتی ہیں آکر حسرتیں ٹوٹے ہوئے دل میں
الٰہی یہ بھی اک جلوہ ہے تیری بے نیازی کا — ضیا افگن ہے امیدِ کرم ٹوٹے ہوئے دل میں
اگر منظور ہے طوفاں سے بچنا تہ نشیں ہو جا — سکوں حاصل نہیں تنکے کو بھی آغوشِ ساحل میں
ٹھہر اے آرزو کیوں یاس سے آنکھیں ملاتی ہے — لہو کی چند بوندیں ہیں ابھی پیمانۂ دل میں

بظاہر گو جنوں کو جستجوئے ظرف ہے احسن
لئے پھرتا ہے لیکن حسن فطرت شیشۂ دل میں

احسن

ۓ برادرم سید عابد علی عابد

عشقِ غیور

(۱)

ڈی فلیوری حسین تھی، اُس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت انگیز اور اس کے دراز بال سنبل کی طرح سیاہ تھے۔ لیکن قدرت نے اُسے زبان بہت خطرناک دی تھی۔ وہ اپنے روزنامچہ میں لکھتی ہے " میں اس حقیقت کی شاکر ہوں۔ کہ میرا حسن لوگوں کو میرے چہرے کی طرف بغور دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔"

بہت سے لوگ اُس کی شمع حسن کے پروانے تھے اُس کا دلکش تبسم دلوں پر بجلیاں گراتا تھا۔ اور اُس کی گفتگو سارے دربار کو فرحت بخشتی تھی۔

خاوند کی وفات کے بعد اُس نے زر کثیر برباد کرنا شروع کیا۔ لیکن کسی عاشق نے بھی اس کا بل ادا کرنے کی عزت حاصل نہ کی۔ وہ لوگوں کو صرف فرضی افسانے سنایا کرتے کہ وہ ہمیں اپنے مکان میں ملی جبکہ ایک مرصع ہار اور سنہری نقاب اس کے زیبِ تن تھا۔

ڈی مارسک شہنشاہ لوئی چہاردہم کا منظورِ نظر وزیر تھا۔ اُس نے ڈی فلیوری سے شادی کی درخواست کی جس پر اُس نے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اس درخواست کی بنا پر وہ عوام میں ڈی مارسک کی معشوقہ مشہور ہو گئی لیکن بعض لوگ اس پر شبہ کرتے تھے۔ کہ وہ شہنشاہ لوئی کو اپنا گرویدہ بنانے میں کوشاں ہے۔ مگر لوئی ایک متقی انسان تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس سے دُور رہا۔

ایک روز جبکہ وہ شکار سے واپس آ کر باغ کے نظارے میں مشغول تھی۔ اُس کی نظر ایک نوجوان فوجی افسر پر پڑی جو ابھی ابھی فوجی سکول سے فارغ التحصیل ہوا تھا۔ اس کا نام ڈی سیورن تھا۔ اور وہ ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔

ڈی فلیوری ایک خوبصورت سرخ لباس میں ملبوس سیاہ عربی گھوڑے پر سوار تھی۔ اُس کی ٹوپی پر ایک فٹ اُونچی زنگار رنگ کے پروں کی کلغی تھی۔ اُس کی صراحی دار گردن میں سونے کی ایک قیمتی مالا تھی۔ جس کا ہیرا بصد آب و تاب چمک رہا تھا۔

اُس نے ڈی سیورن کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ لیکن وہ قدرتی نظارے کی سیر میں اسقدر محو تھا کہ اُسنے ذرہ بھر توجہ نہ کی۔ وہ کہنے لگی " ذرا میرا ہاتھ پکڑنا میں گھوڑے

سے اترنا چاہتی ہوں۔ کیا تم نووارد ہو؟"

"ہاں ابھی کل ہی آیا ہوں۔"

"خوب، ذرا خیال رکھنا کہیں دیو نہ تمہیں کھا جاتے۔"

اُس نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "مَیں سپاہی ہوں۔ مجھے کسی دیو کا خوف نہیں۔"

"تو کیا سپاہی خطرات سے آزاد ہیں؟"

"ہاں وہ معمولی خطرات کی کچھ حقیقت نہیں جانتے۔"

ڈی فلبوری اس نوجوان کی باتوں پر حیران تھی۔ وہ دیر تک اُس کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اور پھر چلی گئی۔ لیکن کس طرح؟ ایک مجروح دل کے ساتھ وہ اس پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہوگئی تھی۔ وہ گھر پہنچی تو اُس نے اپنے دل میں خیالات کا تلاطم بپا پایا۔ اور آنکھوں کے سامنے نوجوان ڈی سیورن کی دلربا تصویر۔

اُسی شام کو جب وہ شطرنج کھیل رہی تھی۔ اُس کے ایک جاسوس نے آکر اُسے بتایا۔ کہ ڈی مارسک نے ڈی سیورن کو شاہی گارد سے تبدیل کر کے شہزادہ ڈی روہن کی رجمنٹ میں بھیجدیا ہے۔

اُسے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ ڈی مارسک اتنی جلدی وار کر دیگا۔ وہ اسی خیال میں کرسی سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرہ اطالوی مطربوں کی دلکش آواز سے گونج رہا تھا۔

چھت میں دس فانوس آویزاں تھے۔ ہر ایک میں پانچسو شمعیں روشن تھیں۔ عورتیں شطرنج کی میزوں کے گرد بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ اور اُن کی موہنی صورتیں اور پریشان زلفیں دیکھنے والے کے دل پر عجب کیفیت پیدا کرتی تھیں۔

ڈی مارسک کمرے میں داخل ہوا۔ اور ڈی فلبوری کی میز کے قریب کھڑا ہوگیا۔ وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ شاہی طاقت اُس کی مٹھی میں تھی۔ ڈی فلبوری نے خیال کیا کہ شاید اُس نے نوجوان افسر کی بابت سُن لیا ہے۔ اور واقعی اُسے سارا واقعہ معلوم تھا۔ اور دل میں بہت ہی خفا تھا۔ لیکن جونہی وہ مُسکرائی اور جواہرات سے چمکتا ہُوا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیا۔ تو ڈی مارسک کی ساری خفگی یکلخت کافور ہوگئی۔ اور وہ مُسکرا کر کہنے لگا۔ "قلوپطرا"

"وہ تو بڑی حسین تھی اور اُس نے اپنے عشاق پر ظلم کئے تھے۔ لیکن مَیں ویسی ظالم تو نہیں۔"

"ظالم نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہو۔"

"خوب، ہاں تو تمہیں علم ہے کہ شہزادہ روہن کی رجمنٹ میدان جنگ کو کب روانہ ہوگی؟"

"جب میں حکم دونگا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ میرا حکم تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ کیوں اُس رجمنٹ میں بھی تمہارا کوئی عاشق ہے؟"

یہ طنز آمیز فقرہ سُنکر وُہ خفا ہو گئی۔ اُس نے ڈی مارسک سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ کونسی بات ہے۔ جس سے اُسے تکلیف پہنچے۔ معاً اُس کے دل میں ڈی سیورن سے شادی کرنے کا خیال پیدا ہُوا۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے مجبور تھی۔ کیونکہ وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔

(۲)

ایک رات نوجوان سیورن بازاروں میں گشت کر رہا تھا۔ کہ چند آدمیوں نے اُس پر حملہ کیا۔ اور پکڑ کر ایک لبادے میں لپیٹ لیا۔ اور رات کی مہیب تاریکی میں اُٹھا کر لے چلے، تھوڑی دیر بعد اُس نے دروازہ کھُلنے کی آواز سُنی۔ اُس نے چیخنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود، کیونکہ اُسکے مُنہ میں خُوب مضبوطی سے کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ پھر ایک دروازہ کھُلا۔ اور وہ اُسے کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر کے چلے گئے۔

وُہ بہت غضبناک ہو رہا تھا۔ لیکن اُس کے پاس کوئی نہ تھا۔ جو اُسے بتاتا کہ اس کا سبب ڈی مارسک کی رقابت ہے۔ اور یہ کام ظالم، طاقتور اور کنبہ پرور وزیر کی تحریک سے رونما ہوا ہے۔ کیونکہ ڈی مارسک آزادانہ اپنے خفیہ احکام صادر کیا کرتا تھا۔ جس پر شہنشاہ کے دستخط ہُوا کرتے تھے۔ جن کی رو سے ایک انسان بغیر کسی قصور کے اپنی باقیماندہ زندگی قید میں بسر کرتا تھا۔ اور اب ویسا ہی حکم ڈی فلیوری نے ڈی مارسک سے حاصل کر کے ڈی سیورن پر استعمال کیا تھا۔

وہ کمرہ جہاں وہ کھڑا تھا۔ کسی کثیف مکان میں واقع تھا۔ جس کی کھڑکی سلاخ دار تھی۔ جس پر پردے پڑے تھے۔ ایک خستہ و خراب میز پر ایک شمع روشن تھی۔ جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔

بازار کی مٹھ بھیڑ کی وجہ سے اس کی تلوار کھوئی گئی تھی۔ اس کا سارا لباس خراب ہو گیا تھا۔ اُس کے گھنے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ اُس کا گلوبند ٹیڑھا ہو گیا تھا اور کوٹ پھٹ گیا تھا۔ ابھی وہ اپنے تئیں درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور میڈم ڈی فلیوری مُسکراتی ہوئی داخل ہُوئی۔ اور آگے بڑھ کر شمع کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ڈی سیورن نے غُصّے سے سلام کیا۔ وہ کہنے لگی "کیا ابھی تک میری محبت میں گرفتار نہیں ہُوئے؟"

وہ دو ہفتوں سے اُسے جانتی تھی۔ اور اُسے درجنوں خطوط اور گلدستے بھیج چکی تھی۔ اُس نے اسے زمرّد کی ایک انگوٹھی بھیجی۔ جس پر اُس نے ذرا التفات نہ کی۔ اور یہ کہکر واپس کر دی۔ کہ مَیں عورتوں کے تحائف قبول نہیں کیا کرتا۔

ڈی سیورن نے اپنے بازو چھاتی پر لپیٹ لئے اُسکا لباس بے ترتیب تھا لیکن وہ خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میڈم مَیں حیران ہوں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

ڈی فلبوری نے آہستہ سے کہا۔ "تم کیسے باندا ق انسان ہو؟"

"میڈم خداتعالےٰ نے مجھے عورتوں سے کچھ ایسا مانوس نہیں بنایا"

وہ چلّا کر کہنے لگی۔ "سنگدل انسان! مَیں تمہیں تقریباً دو ہفتوں سے جانتی ہوں۔ اور تم میری طرف نگاہ تک نہیں اُٹھاتے۔"

"اگر مَیں نے کسی عورت ہی کا غلام بننا ہوتا تو فوج کی نوکری کیوں کرتا۔"

"لیکن میں تو محبت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں؟"

"آہ میڈم، میرے لئے یہ ایک مُردہ زبان کا مُردہ لفظ ہے۔"

اُس نے اپنا سر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور کہا "شاید تم یہ نہیں جانتے۔ لیکن مَیں تمہارے عہدے میں ترقی کروا سکتی ہوں؟"

"ہاں ترقی، وہ ترقی جو کبھی ایمانداری سے نہیں دی جاتی اور ......"

اُس نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم نے میرے متعلق کیا سُنا ہے؟"

سیورن نے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

وہ کہنے لگی۔ "جاہل کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"کیا مَیں یہاں یہی بتانے آیا ہوں؟"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تم نے مجھے اور کوئی موقعہ نہ دیا۔ اس لئے مَیں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

وہ اب اُس خستہ میز کے قریب بیٹھ گئی۔ شمع کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اور وہ آج غیر معمولی طور پر خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے جواہرات چمک رہے تھے۔ اُس نے کہا مَیں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اور مَیں تمہیں ایسا کہنے پر مجبور کرونگی۔"

"دھمکیوں سے؟"

"اور اس امر کے لئے میرے پاس ڈی مارسک کا خفیہ حکم ہے جس پر شاہی مہر ہے۔"

اُس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ "ایک شخص اُس عورت کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے جس سے اُسے محبت ہو۔"

ڈی فلبوری غُصّے سے بیتاب ہو گئی۔ معاً اُسے قلوپطرا کا خیال آیا۔ وہ اُچھل پڑی، اور آرام سے کہنے لگی "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مَیں اُس سے عنقریب شادی کرنے

دالی ہوں۔"

اُس نے جُھک کر کہا۔ "تو میڈم میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔"

وہ اس جواب پر جھنجلا کر کہنے لگی۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ تمہیں پتہ ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہر انسان کو مجھ سے محبت ہے۔ اور تم نے بھی انکار نہیں کیا۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟"

وہ اس پر بھی شکستہ دل نہ ہوئی۔ وہ اس سرکش آدمی پر حیران تھی۔ اُس نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ "تمہیں قلعے میں قید کر دیا جائیگا۔ اور وہاں تم مزے سے رہو گے۔"

اس پر وہ اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکا۔ دھمکی کی بیہودگی پر نہیں، بلکہ اس لئے کہ جب اُس نے یہ الفاظ ایک شریر بچّے کی طرح کہے تو وہ بہت خوبصورت معلوم ہوئی اس سے پہلے کبھی اس کی درخواست نامنظور نہ ہوئی تھی۔ لیکن اب ڈی سیوون رد کر رہا تھا۔ وہ حیران تھی، کہ یہ نوجوان ایسا زرّیں موقعہ پا رہا ہے۔ اور اُسے کھو رہا ہے اُس نے پُوچھا۔ "کیا تمہارے دل میں خواہشات نہیں کہ رذیل سپاہیوں سے نکلکر تم دربار میں پہنچ جاؤ۔"

اُس نے جواب دیا۔ "میرے دل میں خواہشات ہیں۔ میں اُنہیں حاصل کرنے کا متمنی بھی ہوں لیکن ایک عورت کی مدد سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔"

اس فقرے نے ڈی فلیوری کی آتش غضب کو بھڑکا دیا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ ایک غیر معمولی انسان ہے اُسے دل میں کامیابی کی امید تھی۔ لیکن اس نوجوان کی انوکھی باتوں نے اُس کے نازک دل پر کاری ضرب لگائی۔ وہ سب مردوں کو کھلونا سمجھتی تھی۔ اُسے یہ گھمنڈ تھا کہ وہ چاہے تو شہنشاہ کو بھی اپنے تبسّم دلکش سے رام کر لے لیکن وہ اس نوجوان گنوار کو رام کرنے میں ناکام رہی۔

اُس کی آنکھیں جوش سے چمک اٹھیں۔ وہ اس شخص سے شادی کرنے کے لئے تیار تھی جو اس سے دُور بھاگ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میں اور تم دونوں بڑی بڑی باتیں حاصل کر سکتے ہیں۔"

"میں اکیلا بھی کر سکتا ہوں۔"

"ناممکن! تم دربار میں اکیلے ہرگز رسائی پیدا نہیں کر سکتے، تم ہرگز کوئی بات حاصل نہیں کر سکتے۔"

وہ غصّے سے کھڑی ہو گئی، اُس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار تھی۔ لیکن اس وقت ناامید ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کی ہٹ کو کس طرح توڑوں۔ وہ اُس کی سیاہ گہری آنکھوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے کسی کی محبت میں گرفتار نہ ہوئی تھی اُس کا دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ "بہتر ہے کہ اب تم چلے جاؤ۔"

اُس نے پُوچھا "میری تلوار؟"

وہ دوسرے کمرے میں گئی اور تلوار اُٹھا لائی۔ اُسنے نظر بچا کر ایک انچ باہر نکالی۔ اور اُس کے فولاد کو چوما، جو اپنے مالک کی طرح خُوبصورت اور ٹھنڈا تھا۔ پھر اُس کے پاس لیجا کر کہنے لگی۔ "یہ بہت بھاری ہے۔"

یہ کہتے وقت اُس کی آواز بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ فوراً مہربان اور حلیم الطبع ہوگئی۔ اُس کے گال شرم سے سُرخ ہوگئے۔ ڈی سیورن نے تلوار بائیں ہاتھ میں پکڑلی۔ اور دائیں ہاتھ سے ڈی فلبوری کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ یہ اُس نے بڑی سرعت سے کیا۔ اور وہ نادم ہوگئی۔ وہ مکان سے باہر نکل گیا۔ اُس نے دِل میں سوچا کہ ایک طاقتور عورت کو ناراض کرنا از حد خطرناک ہے۔ لیکن وہ ہراساں نہ ہُوا۔ کیونکہ وہ بیخوف، بات کا پُورا اور ارادہ کا پکّا تھا۔

(۳)

ڈی فلبوری یہاں سے نکلکر سیدھی ڈی مارسک کے پاس پُہنچی۔ اور کہنے لگی۔ "ڈی سیورن کے منصب میں ترقی کرو۔" سو میں سے ایک عورت بھی ایسی دلیری نہیں کرسکتی۔ لیکن ڈی فلبوری کے طریقے ہمیشہ انوکھے ہوتے تھے۔ اُس نے ڈی مارسک سے کہا۔ "پیارے! یہ میرا مشغلہ ہے۔ اگر تم میری مخالفت کروگے، تو میں اُس سے شادی کرلوں گی۔ اور اگر تم میری ناز برداری کروگے، تو میں اپنے وہم سے اکتا جاؤنگی۔ اور تم سے شادی کرلونگی۔"

یہ ایک عارضی وعدہ تھا۔ لیکن ڈی مارسک کیلئے یہ بھی نعمتِ عظمیٰ تھا۔ اُس نے کہا۔ "کیا وہ نوجوان بھی تم پر فریفتہ ہے یا نہیں؟"

"آہ نہیں، یہ مَیں ہی ہوں، جو اُس پر پروانہ وار نثار ہوں۔ اور تم سے التجا کرتی ہوں۔ کہ اُس کے منصب میں ترقی کرو۔ مَیں اُسے معزز بنانا چاہتی ہوں۔ اور خاص طور پر شہنشاہ کی خدمت میں رکھنا چاہتی ہوں۔"

وزیر نے اُس کی بات پر یقین کرلیا۔ لیکن حیران ہُوا کہ ڈی فلبوری جیسی عورت ایک معمولی آدمی میں اتنی دلچسپی کیوں لیتی ہے۔ اُس نے ڈی سیورن کے عہدے میں ترقی کردی۔ اور اُسے خاص شہنشاہ کی خدمت پر مامور کردیا۔

ڈی فلبوری بے صبری سے اُس کے تقرر کا انتظار کرتی رہی۔ وہ دل میں اُس سے شادی کرنے اور ڈی مارسک کو شکست دینے کا عزم بالجزم کرچکی تھی۔ ڈی سیورن عہدے پر فائز بھی ہوگیا۔ لیکن اُس نے ڈی فلبوری کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ اور میدانِ جنگ کو جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

ڈی فلبوری نے وہ نظارہ بھی دیکھا جب وہ شہر کے بازاروں میں چند فوجی افسروں کے درمیان سیر کر رہا

تھا۔ اور وہ عورتیں بھی اُس کے گرد تھیں۔ جنہیں اُس سے محبت تھی۔ ڈی مارسک نے بھی اس نوجوان کی بے رُخی کو دیکھا، اور حیران ہُوا۔ کہ یہ کس قسم کا انسان ہے۔

ڈی فلبوری نے اس دفعہ اپنے آدمیوں کو اسے پکڑ لانے کے لئے نہ بھیجا۔ اور اُس وقت کا انتظار کرتی رہی کہ وُہ خود اُس سے ملنے آئے۔ وہ صرف اس سے ملنے آئے وہ صرف اس سے چند باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ میڈم بوفلن کے ساتھ رہ کر اُس کی بدگمانی میں اضافہ کر رہا تھا۔ جو اُن دنوں دربار میں ایک مشہور حسینہ تھی،

ایک دن سب درباری جن میں ڈی فلبوری، اور ڈی سیورن بھی تھے۔ سیر کرتے کرتے ایک چشمہ پر پہنچے۔ جس میں خوبصورت کنول کھلے ہُوتے تھے۔ اور ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اس چشمہ پر شاہ بلوط کے درختوں کا سایہ تھا۔ وہ چشمہ کے قریب گھاس پر بیٹھ گئے۔ عورتوں نے خوبصورت لباس پہن رکھے تھے۔ اور وہ اپنے بندروں اور طوطوں سے کھیل رہی تھیں۔

ڈی سیورن جنگھاس پر میڈم بوفلن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چھوٹے سے گروہ کے پاس پُہنچا۔ ڈی فلبوری نے جو سب سے زیادہ نزدیک تھی۔ بے پروائی سے اپنا ہاتھ اس کے راستے میں بچھا دیا۔ لیکن ڈی سیورن نے جان بوجھ کر اپنا پاؤں اُس کی نازک ہتھیلی پر رکھدیا، اور اُسے مسل کر

آگے چل دیا۔

اُس نے میڈم بوفلن کے قہقہے کی آواز سُنی، اور اپنے غُصّہ اور درد کو ضبط کر کے رہ گئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ بے پروائی سے رومال میں لپیٹ لیا۔ اور حسب معمول اپنی سہیلیوں سے مذاق میں مشغول ہو گئی۔

اُسی شام کو وُہ ڈی مارسک کے پاس جا کر کہنے لگی۔ "اُس آدمی کو موقوف کر دو۔ جسے تم نے میرے لئے دربار میں جگہ دی تھی۔"

وزیر نے اُس کی طرف بغور دیکھا وُہ غصّے سے کانپ رہی تھی۔ ڈی مارسک بڑا خوش تھا۔ کیونکہ ڈی سیورن اُس کا رقیب تھا۔ اور وہ اُس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ بیچاری اپنے دستانے کے نیچے زخمی ہاتھ کو دبا رہی تھی۔ اور لباس کے نیچے اپنے زخمی دل کو تسکین دے رہی تھی۔ ڈی مارسک نے کہا۔ "کیا تم اُس غریب چھوکرے سے اتنی جلدی اُکتا گئی ہو؟"

اُس نے چلّا کر کہا۔ "ہُم اُکتا گئی ہوں، ہاں اُکتا گئی ہوں وُہ بالکل گنوار اور بیوقوف ہے۔ مَیں آزمانا چاہتی تھی کہ وُہ اپنے تئیں امیرانہ ٹھاٹھ میں کس طرح رکھتا ہے۔ افسوس وہ کچھ نہ نکلا۔ اُسے موقوف کر دو!"

ڈی مارسک کہنے لگا۔ "اب مَیں کیا کروں؟"

"اُسے تباہ کر دو۔"

"لیکن کیا تمہیں بدنامی کا ڈر نہیں؟ ایک آدمی کو عزت دیکر اتنی جلدی ذلیل کرتی ہو؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم کسی ایسی تدبیر سے بھی کام لے سکتے ہو، جس میں بدنامی کا خوف نہ ہو۔"

"اب وہ بادشاہ کا منظورِ نظر ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ میڈم بوفلن بھی اُسے چاہتی ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ دونوں کتنے کارآمد ہیں؟"

میڈم بوفلن کا نام سنکر وہ غصّے سے کانپنے لگی، اُس کا زخمی ہاتھ دُکھ رہا تھا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس میں کوئی چاقو مار رہا ہے۔ اُس نے کہا۔ "اگر تم میری قدر کرتے ہو، تو اُسے تباہ کر دو!"

ڈی مارسک نے جواب دیا۔ "میں قدر کرتا ہوں میں تو تمہارے حکم کا بندہ ہوں۔ اچھا بتاؤ، اُس سے کیا سلوک کروں؟"

وہ یہ بالکل نہ جانتی تھی کہ اُسے کس طریقہ سے شکست دیجاتے۔ ایسی زبردست شکست جو اُس نے پہلے کبھی نہ کھاتی ہو۔ ڈی مارسک کہنے لگا۔ "آجکل مُلک میں ایک خطرناک بغاوت پھیل رہی ہے۔ ایک یا دو دن میں باغی اپنے کیفرِ کردار کو پُہنچ جائینگے۔ اغلب ہے کہ تمہارا دوست بھی اُن میں ہو۔"

"کیا وہ نہیں؟"

"نہیں۔ لیکن اگر میں اُس کا نام فہرست میں لکھ دوں تو وہ بھی باغیوں کی صف میں شامل ہو جائیگا۔"

ڈی فلیوری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا یہ ڈی سیورن کی تباہی نہ تھی؟ وہ کہنے لگی۔ "میں خون کی پیاسی نہیں، میں قتل نہیں چاہتی۔"

"لیکن میں نے ابھی کوئی سزا تجویز نہیں کی۔"

"تو کیا اُنہیں قید کرو گے؟"

"نہیں"

"تو پھر تم نے ان باغیوں کے لئے کیا سزا مقرر کی ہے؟"

ڈی مارسک کہنے لگا۔ "شاید اُنہیں مکمل طور پر اُن کے منصبوں سے موقوف کر کے اُن کی جائیداد ضبط کر لی جاتے گی۔"

ڈی فلیوری کے سامنے ڈی سیورن کی تصویر آگئی۔ یہ مغرور آدمی تباہ ہو جائیگا۔ اور اپنی جاگیر سے برطرف کر کے جلاوطن کر دیا جائیگا۔ وہ سپاہ، دربار اور شاہانہ لباس چھوڑ کر پھر ذلیل زندگی بسر کریگا۔ تو میں ایک غریبانہ لباس میں اُس کے دروازے پر جاکر کہونگی "میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا۔ کیا اب بھی تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟"

ایسی بات سوائے الف لیلہ کے قصّوں کے اور

کہیں وقوع پذیر نہیں ہوسکتی، وہ شاید ڈی مارسک کی تجویز پر اُس سے لپٹ جاتی۔ لیکن اُس نے ایسا نہ کیا۔ اُس نے کہا۔ "ہاں تو تم اُنہیں سزا کب دو گے؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "چند دنوں کے اندر۔"

"کیا بادشاہ اس بغاوت سے آگاہ ہے؟"

"ہاں"

وُہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔ اُس کا انتقام بڑا خطرناک تھا۔

(۴)

انتظار کے لمحے جوں جوں گزرتے گئے، اسکی تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب اُس کے ہاتھ کا درد ساری ساری رات اُسے جگائے رکھتا۔ تو وہ اپنے انکار اور اسکی اطاعت کا خیال کر کے اپنے دلِ ناتواں کو تسکین دیتی۔

وہ اپنے کئے پر پشیمان تھی۔ ڈی سیورن کو شہنشاہ کے حضور میں بڑی کامیابی حاصل تھی۔ وہ اس کا منظورِ نظر تھا۔ وہ جب اُسے میڈم بوفلن کے ساتھ دیکھتی تو اس کے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک اُٹھتے۔ لیکن پھر محبت کے سامنے عاجز ہو جاتی۔ اُس رات جب ڈی سیورن کو گرفتار ہونا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ہاں نہ گئی۔ اور سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ رہی۔

ڈی مارسک کے حملے سے چند گھنٹہ پیشتر برافروختہ عورت اپنے کمرے میں دیوانہ وار ٹہلنے لگی۔ وُہ اب ڈی مارسک کے مجہول منصوبہ کو نظرِ حقارت دیکھ رہی تھی اور ڈی سیورن کے بچانے پر کمربستہ تھی۔ اُس نے یہ شکار خود اُس کے حوالے کیا تھا۔ لیکن اب اسی کے آزاد کرانے پر مائل تھی۔ اس قربانی پر بھی کہ وہ میڈم بوفلن کے ساتھ ہی کیوں نہ رہے۔

اُس نے فوراً اس پر عملدرآمد کیا۔ اور اپنے ایک خادم کے ذریعے اُس کی طرف رقعہ بھیجا۔ جس میں وُہ راز بتا دیا، جو تھوڑی دیر میں وقوع پذیر ہونے والا تھا۔ اور اُسے نصیحت کی۔ کہ یہ بہتر ہوگا کہ وہ جان بچا کر بھاگ جائے، اور کہیں ایسی جگہ پناہ لے۔ جہاں دشمن کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو۔

یہ کام کر کے اُس نے اپنے دل میں ایک قسم کی راحت محسوس کی۔ اور بستر پر سونے کے لئے لیٹ گئی۔

اب اس افسانے کا ایک عجیب نظارہ آتا ہے

ڈی فلیوری اپنی ریشمی مسہری میں بستر پر محوِ استراحت تھی۔ اور ڈی سیورن کو خواب میں دیکھ رہی تھی۔ کہ کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ جس نے بجلی کے دھماکے کی مانند اُس کی نیند کو اُچاٹ کر دیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور انگڑائی لیکر کہنے لگی۔ "یہ کیا ہے؟"

کمرے میں ایک بلوری لیمپ روشن تھا۔ دروازہ کھلا اور مس فلیور اندر داخل ہو کر کہنے لگی۔ "کمرے کے دروازہ پر

کوئی دستک دے رہا ہے۔"

ڈی فلبوری نے خوشی سے تالی بجائی، معاً اُسے ڈی سیورن کا خیال ہے۔ شاید وہ خط کے لئے اُس کا شکریہ ادا کرنے یا پناہ لینے آیا ہے۔ اُس نے زخمی ہاتھ کا بوسہ لیکر کہا۔" یہ ڈی سیورن ہے! اُسے جلدی اندر لاؤ۔"

وہ جوشِ مسرت سے بستر سے کُود کر قدِ آدم آئینہ کی طرف بڑھی۔ وہ آج جواہرات سمیت سوگئی تھی جو اس کے لباسِ شب خوابی پر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اُس کے بال جو قدرتی گھنگریالے تھے۔ لمبے لمبے حلقوں میں اس کے سفید اور نازک کندھوں پر بکھرے پڑے تھے۔ اُس کا رنگ فرطِ محبت سے سُرخ تھا۔ اس نے اپنا ریشمی سلیپر پہنا اور سونے کے کمرے کے دروازے میں غمزہ وادا کی تصویر بن کر کھڑی ہوگئی۔

اس وقت کسی نے پھر دستک دی۔ اور مِس فلبور نے کہا۔" کون ہے؟"

" میں ہوں ــــ ڈی سیورن۔ مجھے تمہاری بیگم صاحبہ سے بہت ضروری کام ہے۔"

ڈی فلبوری دروازے میں کھڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی مِس فلبور نے دروازہ کھول دیا۔ ڈی سیورن داخل ہُوا۔ لیکن اُس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔ مِس فلبور چیخکر ایک کرسی کے پیچھے چھپ گئی۔

دو سپاہی دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ اور ایک کھڑکی کی حفاظت کرنے لگا۔ ڈی فلبوری نے سخت لہجہ میں کہا۔" کیا مذاق کر رہے ہو؟"

ڈی سیورن نے مُسکرا کر جواب دیا۔" میڈم آپ زیرِ حراست ہیں، آپ کے مکان کی تلاشی لی جائیگی۔ اور آپ کو خانقاہ میں مقید رکھا جائیگا۔ ابھی ابھی ایک زبردست بغاوت کا انکشاف ہُوا ہے۔ جس کی فہرست میں آپ کا نام نامی بھی شامل ہے اور جہاں پناہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو گرفتار کرلوں۔"

خیر یہ ایسا ہی ہونا تھا۔ ڈی فلبوری پر اس اطلاع کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ وُہ اس آدمی کو زندہ پاکر ازحد خوش ہُوئی۔ جس سے اُسے محبت تھی۔ اُس نے زور سے کہا۔

" شاباش "

سیورن نے غمگین لہجہ میں کہا۔" میں آپ کے کمروں کی باغیانہ کاغذات کے لئے تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

اُس نے کہا۔" بصد شوق "

وہ اُن دور اندیش عورتوں میں سے تھی، جو اپنے عاشقانہ خطوط سنبھال کر نہیں رکھتیں۔ اور اسی لئے وُہ اس تلاشی سے بیزار نہ تھی۔ اُس نے سپاہیوں کو تلاشی لینے کی اجازت دے دی۔ وُہ تلاشی لیتے رہے۔ لیکن جب اُنھوں نے سونے کے کمرے میں جانا چاہا تو اُسنے

اعتراض کیا۔" موسیو! بس یہ کافی ہے۔ مَیں ڈی مارسک سے شکایت کرونگی۔"

وہ مُسکرایا اور کہنے لگا۔" افسوس میڈم، ڈی مارسک کا نام بھی باغیوں میں شامل ہے۔ اور وُہ اس وقت قید میں ہے۔"

اس نے دل بہلانے کی کوشش کی، وہ ڈی مارسک پر ہزار لعنت بھیج رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اور سپاہی اُس کے صندوق اور لباسوں کی تلاشی لینے لگے۔ اگر لیمپ کی روشنی ذرا تیز ہوتی، تو یہ ظاہر ہوتا کہ وہ زرد ہو رہی ہے اپنے بڑھتے ہُوئے خوف میں وہ اپنے تئیں بھول گئی۔ اور آگے سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی۔ وہ عجب کشمکش میں تھی۔ اور کھڑکی میں سے سیاہ آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

ڈی سیورن دل سے اس تلاشی کا متمنی نہ تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ مَیں نے ہی اس بدبخت عورت اور ڈی مارسک کا نام باغیانہ فہرست میں لکھا ہے۔

یکایک ڈی فلیوری اپنی پریشانی سے چونکی اور اپنی میز کو اُس سارجنٹ سے بچانے بھاگی، جو تلاشی لے رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔" موسیو! تم اچھی طرح جانتے ہو، کہ میں بغاوت میں شریک نہیں ہوں۔"

اس حرکت نے ڈی سیورن کو میز کا گرویدہ بنا دیا اُس نے خود اس کی تلاشی لی۔ اور جلد ہی عورت کی بیقراری کی وجہ معلوم ہوگئی۔ یہ اس کا روزنامچہ تھا۔ ڈی سیورن نے وہ کتاب پکڑ لی۔ جس کی جلد مخمل کی تھی۔ اور جو موتیوں سے مرصع تھی۔ اُس نے غُصّے سے کہا۔" غدّار! درندہ! چور! دھوکا باز!"

ڈی سیورن نے اس کے ان الفاظ پر توجہ نہ کی، بلکہ روزنامچہ کے اوراق اُلٹنے شروع کئے۔ کہ آیا اس میں کوئی خط ہے یا نہیں۔ لیکن اُس میں کوئی نہ تھا۔ ڈی فلیوری نے اُسے چھیننے کی بہت جدوجہد کی۔ لیکن نوجوان نے اس نازک کتاب کو مضبوطی سے پکڑ کر سر سے بلند کر لیا۔ یہ دیکھ کر ایک سپاہی مسکرانے لگا۔ جسے دیکھ کر وہ اپنی اس بیباک کارروائی سے باز آگئی۔ اور کہنے لگی۔" موسیو! مَیں یہ معاملہ تمہارے ضمیر پر چھوڑتی ہوں اور التجا کرتی ہوں۔ کہ اسے نہ پڑھو، موسیو! اس لئے نہیں کہ اس میں باغیانہ خبریں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں خاص نسوانی راز ہیں۔"

اُس نے کہا۔" یہی ہیں، جو مَیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ وہ عورت جو اپنے خطوط تو پھاڑ دیتی ہے۔ اور ایک روزنامچہ رکھتی ہے۔"

ڈی فلیوری غُصّے سے کہنے لگی۔" موسیو! عاشقانہ خطوط معمولی اور بے قدر چیز ہیں لیکن ایک

روزنامچہ پھول کی مانند ہے، ایک نازک اور ملائم پھول کی مانند۔"

اُس نے ہنسکر کہا۔" اور مَیں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ محبّت والفت کی باتوں سے لبریز ہے۔"

اُس نے رحم کی التجا کرتے ہُوئے کہا۔ مَیں تمہیں عزّت کی قسم دے کر کہتی ہوں کہ میرے رازوں کو طشت ازبام نہ کرو۔"

لیکن ڈی سیورن نے روزنامچہ کو قمیص کی جیب میں رکھ کر اپنے زرد وزی کوٹ کے بٹن لگا دِئے ڈی فلیوری نے دِل میں خیال کیا کہ شاید اب اس ظالمانہ کارروائی کا خاتمہ ہے۔ لیکن یہ بعید از قیاس تھا۔ ڈی سیورن نے سختی سے اُسے لباس پہننے کو کہا۔ کیونکہ نیچے گاڑی کھڑی تھی۔ اور اُسے آج رات خانقاہ میں رہنا تھا۔

عورت نے کانپتے ہُوئے کہا۔ "آہ میرے اللہ! تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سپاہیوں سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحہ بعد وہ نیچے اُتری۔ دو سپاہی آگے اور دو پیچھے تھے۔ اُسے گاڑی میں بٹھا کر پردے چھوڑ دئے گئے۔ جو بازاروں میں کھڑکھڑاتی ہُوئی کلیری کی خاموش خانقاہ میں پہنچی۔ وہ اس خانقاہ کو اچھی طرح جانتی تھی، کہ یہ ان عورتوں کے لئے ہے، جو شہنشاہ کی ناخوشی کا باعث ہوں۔

منتظمہ اُس سے ہمدردی سے پیش آتی۔ ڈی فلیوری نے ڈی سیورن سے کہا۔ "تمہارا مذاق بڑا فضول ہے۔"

اُس نے جواب دیا۔" میرا خیال ہے کہ نمونہ آپ ہی نے بتایا تھا۔

اُس نے کانپتے ہُوئے ہونٹوں سے کہا۔ "لیکن میرے مذاق کا انجام اتنا شدید نہ تھا۔"

ڈی سیورن نے اُسے سلام کیا۔ اور خانقاہ سے باہر نکل گیا۔

(۵)

اُس کی جائداد ضبط ہوگئی تھی۔ اُس کا رتبہ چھین لیا گیا تھا، اور وہ ساری عمر کے لئے تارک الدنیا بنا کر اِس خانقاہ میں رکھی گئی تھی۔

اُس سال کے محاصرے میں شہنشاہ کو فتح حاصل ہوئی۔ ڈی سیورن جس نے اس جنگ میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ سپاہ اور دربار میں ہردلعزیز بن گیا۔ موسم گرما میں وہ واپس آیا، کون؟ شہنشاہ کا منظورِ نظر شاندار جرنیل بادشاہ کا دوست اور ناصح۔

ڈی فلیوری نے اُس کی آمد کی خبر اُس وقت سُنی جب وہ خانقاہ کے باغ میں گلاب کے بوٹوں کے درمیان بیٹھی

تھی۔اُس نے ایک آہ سرد بھری۔ اور سامنے خانقاہ کی طرف نگاہ کی۔ چند گھنٹوں کے بعد فاتح جرنیل خانقاہ میں آیا۔ اور اُس کا ہاتھ چوم کر کہنے لگا۔" ان فتوحات میں میرا ایک ساتھی تھا۔ اور وہ تمہارا روزنامچہ تھا۔"

ان الفاظ کو سُنکر اُس نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ڈی سیورن نے کہا۔" اس سے پہلے کہ مَیں میدان جنگ کو واپس جاؤں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ مَیں تم سے شادی کرلوں۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

اُس نے افسردگی سے جواب دیا۔" لیکن یہ بعد از وقت ہے۔ مَیں مدت سے جانتی تھی۔ کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ لیکن تم جان بوجھ کر انکار کرتے رہے"

" مَیں اپنے الفاظ پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ کہ مَیں ایک عورت کی مدد کے بغیر بھی کامیابی حاصل کرسکتا ہوں۔"

ڈی فلیوری نے بڑے ناز سے اور مسکرا کر کہا۔

" واہ رے! لیکن کیا تم نے میرے مکان کی تلاشی باغیانہ کاغذات کے لئے لی تھی؟"

" نہیں، بلکہ یہ ثبوت بہم پُہنچانے کے لئے کہ واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں — اور مَیں نے تمہارے روزنامچہ میں سب کچھ پڑھ لیا۔"

وہ کامیاب تھی اُس کی دلی مراد آج بر آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر گئے۔ اور اُس نے اپنے تئیں ڈی سیورن کے سینے سے لگا دیا۔

(ماخوذ)

نظامی

کلامِ یگانہ

زمانہ پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دُنیا میں یادگار رہے

نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

زمانہ سازوں کا مرکز نہ دائرہ کوئی
ہوا میں جیسے بگولا خراب و خوار رہے

دکھاؤں چیر کے دل دردِ دل کہوں کبتک
زباں پہ کیوں یہ تقاضائے ناگوار رہے

تڑپ تڑپ کے اُٹھاؤنگا زندگی کے مزے
خدا نکردہ مجھے دِل پہ اختیار رہے

سزائے عشق بقدرِ گناہ ناممکن
یہی بہت ہے کہ برہم مزاجِ یار رہے

یگانہ

تربینی

(۱)

پریاگ پہ بچھڑی ہوئی بہنیں جو ملی ہیں　　پانی کی زمیں پر بھی تو کلیاں سی کھلی ہیں

کچھ گنگا کا رُکنا

کچھ جمنا کا جُھکنا

پھر دونوں کا مِلنا

وُہ پھول سے کھلنا

کس شوق سے اٹھلاتی ہوئی ساتھ چلی ہیں　　یہ عشق و محبت کے نظارے ازلی ہیں

(۲)

کہتے ہیں کہ جنّت سے بھی آئی ہے بہن ایک　　گو تینوں کا ہے اصل میں گھر ایک وطن ایک

گھر جب سے چھٹا تھا

دِل سرد ہُوا تھا

وُہ کوہ سے گرنا

وہ دشت میں پھرنا

راتوں کو وہ سنسان بیابان میں چلنا　　سہمے ہوئے تاروں کا وہ سینے پہ مچلنا

(۳)

تنہا وہ سفر دشت میں میدان میں، بن میں　　خاموش پہاڑوں میں بیاباں میں چمن میں

جنگل سے نکلنا

رُکتے ہوئے چلنا

بڑھ بڑھ کے پلٹنا
ڈر ڈر کے سمٹنا
مرمر کے اکیلے یہ گزارا ہے زمانہ جیسے کوئی دُنیا میں نہ ہو اپنا یگانہ

(۴)

خالی کبھی جاتی نہیں بے لفظ صدائیں آخر کو اُتر کر گئیں خاموش دُعائیں
جاگا ہے مقدّر
پریاگ پہ آکر
اب غم نہ سہیں گی
تنہا نہ رہیں گی
پریاگ پہ بہنوں کو ملایا ہے خُدا نے مُدّت میں یہ دن آج دکھایا ہے خُدا نے

(۵)

کیا جوشِ محبت سے بغلگیر ہُوئی ہیں وارفتگیِ شوق کی تصویر ہُوئی ہیں
اللہ رے محبّت
سرمایۂ راحت
یہ کس کو خبر تھی
دل ملتے ہیں یوں بھی
ہونگی نہ جُدا حشر تک اب ایسی ملی ہیں خوش بہنیں ہیں یا پانی پہ کلیاں سی کھلی ہیں

نوائے راز

آنکھوں میں جو تو سما رہا ہے
ہر ذرّہ نظر میں آئینا ہے

کیا غم کہ وہ جور آزما ہے
غافل! یہی منزل رضا ہے

ہاں کوئی ترانہ مطرب غم!
دُنیا پہ سکون چھا رہا ہے

جینے کے پڑے ہیں مجھ کو لالے
فرقت تری صبر آزما ہے

کیوں دل سے نکل کے آئے لب پر
وہ راز کہ جانِ مدّعا ہے

صد شکر پیام موت آیا
ناکامیوں کی یہ انتہا ہے

تدبیر کا چل سکا نہ جب زور
معلوم ہوا کوئی خُدا ہے

خاموش زباں نہ ہلنے پائے
ہونا ہے جو کچھ وہ ہو رہا ہے

نظریں جو ملیں تو مل گئے دِل
کیونکر کہوں دیر آشنا ہے

جو قلب سے آ رہی ہے پیہم
لاریب یہی تری صدا ہے

کر دُور تو دل سے ماسوا کو
باقی جو رہے وہی خدا ہے

خاموش ادب کی جا ہے یہ راز
کیوں بھید تو اُس کے کھولتا ہے

راز چاندپوری

سچی خوشی

(فرانس کے مشہور ترین مختصر افسانہ نویس دی ماسانت کے ایک افسانہ کا ترجمہ)

سمندر کے کنارے شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کھڑکی میں سے اس منظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ لیکن ابتک اُس کی کرنوں سے آسمان کا گوشہ دامن سنہری تھا۔ گویا وہ جہاں جہاں سے گزرا ہے سونا لُٹاتا گیا ہے۔ بحیرہ روم جس کی سطح پر خفیف ترین جنبش کا نشان نہ تھا شفق کے زریں عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاندی کی ایک بڑی سی چادر ہے جس پر سونے کا جھول چڑھا دیا گیا ہے۔

اُدھر مغرب کے ہلکے ارغوانی پردے پر پہاڑوں نے اپنے کالے کالے بیڈھب نقشے کھینچ دیتے تھے۔

ہماری گفتگو محبت کے متعلق تھی۔ اس فرسودہ موضوع پر جس سے ہم پہلے نہ جانے کتنی مرتبہ بحث کر چکے ہونگے۔ ہم پھر ایک بار اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے ہماری گفتگو کا دھیما لہجہ شام کی غمگین خاموشی سے ہم آہنگ تھا۔ اور محبت کا لفظ جو بار بار، کبھی کسی مرد کی کرخت اور بلند آوازمیں، اور کبھی کسی عورت کی سریلی اور نازک آوازمیں ادا ہوتا تھا۔ کمرے کی فضا میں گونج رہا تھا گویا کوئی پرندہ ہے کہ نظروں سے چھپا ہوا اپنے ننھے پر پھڑپھڑا رہا ہے۔ یا کوئی آوارہ رُوح ہے جس کے پروں کی سنسناہٹ نے کمرہ معمور کر رکھا ہے۔

اثنائے گفتگو میں کسی نے پوچھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بہت مُدت تک ایک شخص سے محبت کر سکے؟"

بعضوں نے کہا۔ "ہاں"

بعضوں نے کہا۔ "نہیں"

پھر دلائل و شواہد پیش کیے گئے۔ واقعات سُنائے گئے۔ مشاہیر کے اقوال اپنے دعاوی کے ثبوت میں لائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کے سینے کے نہاں ترین پردوں میں خاموش تار چھڑ گئے ہیں۔ اور مدتوں کے خوابیدہ نغمے بیدار ہو گئے ہیں۔ ہر شخص فطرت کے اس ہمہ گیر قانون، روحوں کے اس پُراسرار اتحاد پر انتہائی سرگرمی سے اظہارِ خیال کر رہا تھا۔

یکایک ایک شخص جو ٹکٹکی لگائے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بول اُٹھا:-

"ہیں، ذرا دیکھنا تو، یہ کیا ہے؟"

سمندر کی وسعت کے بعید ترین کنارے پر جہاں

حدِ نظر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک بھورے رنگ کی بڑی سی چیز جسکا شناخت کرنا مشکل تھا نظر آ رہی تھی۔

ہم سب اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئے اور اس عجیب و غریب چیز کو جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ حیرت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اتنے میں کسی نے کہا:۔

"اب میں سمجھا! یہ تو جزیرہ کورسیکا ہے۔ سال میں دو تین مرتبہ، جب مطلع غیر معمولی طور پر صاف ہو اور سمندر پر کہر نہ چھائی ہو۔ اس طرح نظر آجایا کرتا ہے۔"

پہاڑوں کے سلسلوں کے مٹے مٹے سے نقوش دکھائی دیتے تھے۔ اور اُن کی چوٹیوں پر نگاہ کو برف کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر شخص اس طلسماتی جزیرے کو جو یکایک دُوری کا پردہ اُٹھا کر ہماری نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو گیا تھا۔ جیسے پردۂ غیب سے کوئی چیز ناگہاں ظہور میں آ جائے۔ دیکھ دیکھ کر مبہوت و ششدر رہتا۔ غالباً وہ منچلے سیاح جو کولمبس کی طرح ان دیکھی دُنیاؤں کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں رہتے تھے۔ انہیں بھی دُنیا کے دُور و دراز خطے اسی طرح پوشیدگی کی نقاب میں سے ایک جھلک دکھا دیا کرتے ہونگے!

آخر کار ایک عمر رسیدہ شخص نے جو اب تک بالکل خاموش تھا۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کہنے لگا:۔

"سُنئے، مَیں آپ کو ایک عجیب واقعہ سُناؤں۔ اس جزیرے میں جو اس وقت ہماری دلچسپ گفتگو میں اس طرح یک بیک خلل انداز ہُوا ہے۔ گویا ہمارے زیرِ بحث مسئلے کا تصفیہ کرنا چاہتا ہے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے محبّت کا ایک عجیب ماجرا دیکھا۔ اور اپنے کانوں سے محبّت کی ایک رنگین داستان سُنی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے، لیکن یہ محبت وہ محبت تھی، جسے آپ ایک فرضی ڈھکوسلا خیال کرتے ہیں، یعنی شادکام محبت......

پانچ سال گزرے کہ مَیں بغرضِ سیاحت کورسیکا گیا۔ اس وحشی اور غیر آباد جزیرے کو ہم فرانسیسیوں سے اُتنا ہی بُعد ہے جتنا امریکہ کو، اگرچہ کبھی کبھی ہم اُسے فرانس کے ساحل سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے۔

آپ کے لئے اُس کا تصوّر محال ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک ایسی دُنیا ہے جو ابھی ابھی عدم سے وجود میں آئی ہے۔ اس کی بعینہٖ وُہی حالت ہے جو کُرّۂ ارض کی ابتدائے آفرینش میں ہوگی۔ اُونچے اُونچے پہاڑوں کے پیچ در پیچ سلسلے ہیں۔ جن کی تنگ اور دشوار گزار گھاٹیوں میں ندی نالے زور شور سے بہ رہے ہیں۔ کوسوں میدان کا پتہ نہیں جہاں دیکھو ایک سنگلاخ نشیب و فراز ہے۔ جس پر جابجا

شاہ بلوط اور صنوبر کے گھنے جنگل اُگے ہوئے ہیں۔ زمین سر بسر بن جنتی پڑی ہے۔ ہاں کہیں کہیں اِکّادُکّا پہاڑوں کی چوٹیوں پر کوئی گاؤں نظر آجاتا ہے۔ اور وہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک اور چوٹی ہے۔ نہ کہیں زراعت ہے نہ صنعت و حرفت ہے۔ نہ تہذیب ہے۔ اور وحشی مُلکوں میں انسان نے مُردہ تہذیبوں کا پتہ چلایا ہے لیکن یہاں کبھی تہذیب آئی ہی نہ تھی۔ کوئی نشان ایسا نہیں ملتا۔ جس سے اس کا گمان تک ہوسکے کہ اس جزیرے میں ایسے لوگ رہ چکے ہیں جنہیں حسین اور خوبصورت چیزوں سے ادنےٰ مس بھی تھا۔ اس کوہستان میں فطرت کے کریہہ مناظر اتنے رُوح فرسا نہیں، جتنا یہ امر کہ اس عروج تمدّن کے زمانے میں اس پر ایسے لوگ آباد ہیں۔ جو وارفتۂ حسن کے مذاق سے بے بہرہ ہیں!

اٹلی جس کی جھونپڑیاں بھی فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں۔ اور انسانی صنعت کے اعلےٰ سے اعلےٰ نمونوں سے لبریز ہیں۔ اٹلی جہاں پیتل، لوہے، سنگ مرمر اور لکڑی بلکہ مٹی کے ذرّوں پر انسان کی قلمکاری کے غیر فانی نقوش ثبت ہیں، اور جس کے پُرانے مکانوں کے گوشوں میں گری پڑی چیزیں بھی انسان کی قدرتِ آفرینش کا ثبوت ہیں۔ یہ اٹلی ہمارے نزدیک ایک مقدس سرزمین ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک زندہ یادگار ہے۔ اس امر کی کہ ہماری تخلیقی قوت نے، جو خدا کا افضل ترین عطیہ ہے۔ اس عالمِ ایجاد میں کیا کیا شاندار کرشمے دکھائے۔ وہ کس کس طرح کون و فساد کی قوتوں سے برسرِ پیکار رہی۔ اور کس طرح اُن پر غالب آئی۔

لیکن اسی اٹلی کے بالمقابل جو انسانی تمدّن کا طرۂ افتخار ہے، جزیرۂ کورسیکا واقع ہے جس کی حالت آجتک وہی ہے جو ابتدا میں تھی۔ آج بھی وہاں انسان ٹوٹے پھوٹے خس و خاشاک کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی کا نصب العین اپنی ذات سے ماوراء کچھ نہیں۔ بعینہٖ اُسی طرح جس طرح زمین کے پہلے باشندے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنی اور اپنے چند متعلقین کی ضروریات کا پُورا کرنا اپنا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ اور اُن میں اپنے وحشی اسلاف کی نیک و بد خصوصیات بلاکم و کاست موجود ہیں۔ وہی جنگجوئی اور کینہ وری ہے کہ بات بات پر لڑ بیٹھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی جان لینے سے دریغ نہیں کرتے، وہی غیروں سے وحشت اور اجنبیت ہے کہ اپنے سایہ سے بھاگتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پُرانی فراخدلی اور مہمان نوازی کی عادت نہیں بھولی مسافر دروازے پر آجائے، تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور سادہ لوحی کا یہ عالم ہے کہ کسی نے ذرا ہمدردی جتائی، تو سچے دل سے اُس کے دوست ہو گئے۔

خیر میں ایک مہینے تک اس جزیرے کی بستیوں اور ویرانوں میں تن تنہا پھرا کیا اور اس احساس سے خاص لطف اٹھاتا رہا کہ میں دُنیا کی آخری حد پر پہنچ گیا ہوں۔ نہ کہیں سرائیں تھیں نہ ہوٹل تھے۔ نہ سڑکیں تھیں۔ میں ایک خچر پر سوار نہایت کٹھن اور خطرناک راستوں سے پہاڑوں کے نشیب و فراز طے کرتا ہُوا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو چلا جا رہا تھا۔ گاؤں پہاڑوں کی بلندیوں پر کوسوں گہری کھڈوں کے کنارے اس طرح بنے ہوئے ہیں۔ گویا فضا میں معلق ہیں۔ اور شام کے سنّاٹے میں کھڈوں کی گہرائیوں سے ندی نالوں کی پُرشور گرج بادلوں کی بعید گرج کی طرح سنائی دیتی ہے۔ بس جس گاؤں میں جاتا بے کھٹکے کسی جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹا دیتا۔ اور رات کو کسی گوشے میں پڑ رہنے کی اجازت چاہتا۔ گھر والے بڑی آؤ بھگت سے پیش آتے۔ ہاتھوں ہاتھ اندر لیجا کر بٹھا دیتے۔ اور اپنا سیدھا سادہ کھانا لا کر سامنے رکھ دیتے۔ رات اُن کی چھت کے زیر سایہ گزار کر میں صبح اُن سے رُخصت ہوتا۔ اور صاحبِ خانہ گاؤں کے باہر تک مشایعت کے طور پر میرے ساتھ آتا۔

ایک شام جبکہ میں برابر دس گھنٹے کے سفر سے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ میں ایک نہایت تنگ اور دشوار گزار وادی میں پہنچا جو سمندر کے کنارے سے ایک میل کے فاصلے پر ہٹ کر واقع تھی۔ وادی کے دونوں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ سر سے لیکر پاؤں تک گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے لدے ہُوئے دو بلند اور تاریک دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ اور ان دیواروں میں جا بجا شگاف ہو گئے تھے۔ جو شام کی تاریکی میں نہایت بھیانک معلوم ہوتے تھے۔ اِس تنگ و تاریک وادی کے ایک گوشے میں مجھے ایک اکیلی جھونپڑی نظر پڑی۔

جھونپڑی کے اردگرد ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا ہُوا تھا۔ جس میں کچھ انگوروں کی بیلیں تھیں۔ اور اکّا دُکّا شاہ بلوط کے درخت تھے۔ غرضکہ یہ جھونپڑی صحرا میں خیابان کا منظر پیش کر رہی تھی۔

سب سے پہلا شخص جو مجھے دکھائی دیا۔ ایک بڑھیا تھی۔ جس کے غیر معمولی طور پر صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر مجھے کسی قدر تعجب ہُوا۔ وہ مجھے جھونپڑی کے اندر لے گئی۔ ایک عمر رسیدہ آدمی ایک مونڈھے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر مُسکرایا، اُٹھا، اور مُنہ سے کچھ کہے بغیر پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے مجھے مخاطب کر کے کہا:

"انہیں معذور سمجھئے۔ بیچارے بالکل بہرے ہیں۔ بیاسی سال کی عمر ہے۔"

یہ الفاظ اُس نے فرانسیسی میں ادا کئے۔ اور اُس کا لب ولہجہ بالکل فرانسیسیوں کا سا تھا۔ میں حیران ہو گیا پُوچھنے لگا :-

" آپ کورسیکا کی رہنے والی نہیں ہیں کیا؟ "

"نہیں ہم دونوں کا وطن فرانس ہی ہے۔ مگر پچاس سال سے یہیں رہتے ہیں۔ "

یہ الفاظ سُنکر مجھ پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ اُف' پچاس سال! اور اس ویرانے میں آبادی سے اتنی دُور!

اتنے میں دروازہ کھُلا۔ اور ایک نوجوان داخل ہوا۔ جو وضع سے چرواہا معلوم ہوتا تھا۔ پھر ہم سب نے مِل کر کھانا کھایا ..... یعنی صرف آلو اور گوبھی کا گاڑھا سا شوربا بس۔

کھانے سے فارغ ہو کر مَیں دروازے کے قریب جا بیٹھا۔ اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ لیکن منظر کچھ ایسا غمناک تھا کہ میری طبیعت افسردہ ہو گئی۔ میری کیفیت بالکل ایسی تھی جیسی بعض اوقات اُن مسافروں کی کیفیت ہوتی ہے۔ جو رستہ بھُول کر دن ڈھلتے وقت کسی ایسے بیابان میں جا نکلیں، جہاں کوسوں آدمزاد کا پتہ نہ ہو۔ ذرا تصوّر تو کیجئے کہ اس انتہائی مایوسی کے لمحے میں اُن کے جذبات کیا ہوتے ہونگے۔ اُنہیں یہی محسوس ہوتا ہو گا کہ ہر چیز کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ دنیا اور مافیہا کا آخری وقت سر پر آ پہنچا ہے۔ دنیا ہیچ ہے۔ زندگی ہیچ ہے۔ تنہائی اور تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں اور اُف، وہ رُوح کا اندھیرا گھُپ، جس میں کبھی کبھی امید کی کوئی کرن اس طرح چمک جاتی ہے جس طرح خواب میں شکلیں دکھائی دیں، اور غائب ہو جائیں! بس کچھ اسی قسم کے احساسات تھے، جو اس ملال انگیز منظر نے میرے دل میں پیدا کر دئے۔

مَیں انہی احساسات میں غرق تھا کہ بڑھیا کرسی سرکا کر میرے قریب آ بیٹھی۔ اور تجسّس کے اُس تقاضے سے مجبور ہو کر جو ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مُجھ سے پُوچھنے لگی :-

" تو آپ فرانس سے آتے ہیں؟ "

مَیں نے جواب دیا۔ " ہاں، یونہی سیاحت کی غرض سے۔ "

" پیرس کے رہنے والے ہیں میں جانوں؟ "

" نہیں میرا گھر نینسی میں ہے۔ "

معلوم ہوتا تھا کہ میرے الفاظ نے اُس کے دل پر کوئی غیر متوقع اثر کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ خیال کیوں گزرا۔

بہرحال، اُس نے میرے الفاظ کو آہستہ سے دہرایا:

" تو آپ کا گھر نینسی میں ہے؟ "

وہ بُوڑھا جس نے خاموشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے قریب آ کھڑا ہُوا۔

بُت کا بُت، بےحس و حرکت، جیسے بہرے عموماً ہوتے ہیں۔

بڑھیا نے کہا :۔

"کوئی ہرج نہیں۔ یہ ہماری گفتگو نہیں سُن سکتے"

پھر ایک طویل خاموشی کے بعد اُس نے پُوچھا :۔

"نینسی میں آپ کے بہت لوگ واقف ہونگے؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "ہاں تقریباً سارا شہر واقف ہے۔"

"سینٹ ایلیر کو جانتے ہیں آپ؟"

"وہ تو میرے والد کے بڑے دوست تھے۔"

"آپ کا نام؟"

مَیں نے اپنا نام بتایا۔ وہ تھوڑی دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ اور پھر ایسے لہجے میں جیسے کوئی بھولی ہُوئی بات یاد آگئی کہنے لگی :۔

"ہاں، ہاں۔ اب مجھے یاد آگیا ۔۔۔ تو آپ سرآنٹ کو بھی جانتے ہوں گے؟"

"جی ہاں وہی جو آجکل جرنیل ہیں۔"

پھر ایک ایسے لہجے میں جس سے ایک روحانی خلفشار، ایک قلبی کشمکش ظاہر ہوتی تھی۔ جس میں نہ جانے کیا کیا مبہم پوشیدہ اور قوی جذبات جو اظہار کے لئے بیتاب تھے۔ اور نہ جانے کیسے کیسے خیالات جو زبان پر آ آ کر رُک جاتے تھے پنہاں تھے۔ اُس نے یہ الفاظ کہے، اور مَیں نہیں کہہ سکتا۔

کہ اپنے سینے کے پوشیدہ رازوں کے افشا کرنے کی کیسی مجبور کن خواہش نے اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلوائے :۔

"ہاں مَیں اُسے جانتی ہوں وہ میرا بھائی ہے۔"

مَیں حیرت زدہ ہوکر اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ اور پھر یکایک ایک بُھولا ہُوا واقعہ بجلی کی چمک کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

برسوں گزُرے کہ لورین میں ایک عجیب تذکرہ لوگوں کا زبانوں پر تھا۔ ایک حسین لڑکی، امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی، سوزین دی سرآنٹ، اپنے والد کے ایک ماتحت سپاہی کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔

یہ سپاہی ایک ادنے حیثیت کے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن تھا وجیہہ نوجوان، اور نیلے رنگ کی چُست وردی اُس کے سڈول جسم اور صبیح رنگت پر نہایت زیب دیتی تھی۔

قیاس چاہتا ہے کہ کسی دن وہ فوج کو شہر کے قریب سے گزُرتے ہُوئے دیکھنے آئی ہوگی۔ کہ قسمت نے اُس کی نظریں اس خوبرو اور خوش قامت نوجوان سے دوچار کردیں اور کسی نامعلوم جذبے کے ماتحت پہلی ہی نظر میں اُس کی محبت اُس کے دل میں گھر کرگئی لیکن یہ راز کسی پر نہ کُھل سکا کہ اُن کو ہمکلام ہونے کا موقعہ کیونکر ملا۔ کس طرح بغیر تعارف کے اور بغیر میل ملاقات کے اُن میں یہ معاملہ طے ہُوا۔ اور کس طریقے سے اُنہوں نے ایک دوسرے پر اپنی محبت کا

اظہار کیا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اور ایک شام جب کہ سپاہی اپنی مدت ملازمت ختم کر کے گھر جانے والا تھا وہ اور اُس کے افسر کی بیٹی دونوں غائب ہو گئے۔ بہت تلاش کی گئی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اس واقعہ کو سالہا سال گزر گئے۔ اور اُن کے جینے مرنے کی کوئی خبر نہ آئی۔

اور آج پچاس سال کے بعد اس ہولناک وادی میں وہ دونوں میری آنکھوں کے سامنے موجود تھے!

مَیں انتہائے تعجب کے انداز میں بول اُٹھا۔

"خوب! اب مَیں سمجھا! آپ مید موازل سوزین ہیں؟"

اُس نے سر ہلا کر خاموشی سے میرے سوال کا جواب دیا۔ مَیں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھر اُس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بُوڑھے کی طرف جو ابتک ایک بُت کی طرح خاموش دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ اشارہ کیا۔ مَیں اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔

تو گویا ان کی زندگی اچھی گزر گئی تھی۔ اور وہ اب بھی خوش تھے۔ اب بھی وُہ اُسے اُن ہی نظروں سے دیکھتی تھی۔ جن نظروں سے اُس نے پہلے پہل نوجوانی کے دنوں میں اُسے دیکھا تھا۔

مَیں نے پوچھا۔

"کم از کم آپ خوش تو رہی ہونگی؟"

اُس نے ایسی آواز میں جو نہ دل سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جواب دیا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ مَیں ہر طرح خوش رہی ہوں۔ مجھے کبھی کسی بات کا رنج یا افسوس نہیں ہوا۔"

مَیں محبت کی یہ معجزنما قوت دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اور انتہائے حیرت سے اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ جو کبھی اتنی دولتمند اور ناز و نعم کی پلی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک غریب دہقان کے ساتھ اس ٹوٹی جھونپڑی میں رہنا منظور کر لیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ رہ کر وہ بھی اُس جیسی ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو اس عیش و تنعم، اور لطف و دلچسپی سے خالی زندگی کا اس طرح عادی بنا لیا تھا۔ کہ سیدھے سادے کپڑوں سے تن ڈھانک لیتی۔ اور روکھی سوکھی جو مل جاتی، اُسی میں خوش رہتی۔ اور جس کی خاطر اُس نے سب سے مُنہ موڑا وہ اب بھی اُسے ساری دُنیا سے عزیز تھا۔ اور وہی وُہ اُس کے دل کی دُنیا میں بستا تھا۔ اُس کے سوا اُس نے کبھی کسی کا خیال نہ کیا تھا۔ اُس نے کبھی اپنے زر و جواہر، اپنی نفیس قیمتی پوشاکوں، اپنی امیرانہ ٹھاٹھ کی زندگی کو یاد کر کے افسوس نہ کیا تھا۔ اور رنگا رنگ کے سامان سے آراستہ کمروں، نرم مخملی گدیلوں، اور آرام دہ سیجوں کے خیال نے اُسے کبھی نہ ستایا تھا۔ وہ اپنے حال میں خوش تھی۔ اور جسکے

دامن سے اُس کی زندگی وابستہ ہو چکی تھی، اُس کے قریب ہو کر ساری دُنیا سے بے نیاز تھی۔

ابھی جوانی کا آغاز تھا۔ اور ابھی اُس نے آنکھ کھول کر اس دُنیا کا کچھ نہ دیکھا تھا۔ کہ اپنی راحت و آرام کی زندگی کو، اعلیٰ طبقے کی ہمنشینی کو، اپنے عزیز و اقارب کی محبت و شفقت کو چھوڑ کر اس گوشۂ تنہائی میں آئی۔ اور یہیں کی ہو رہی۔

تمام وہ چیزیں جن کی اُسے آرزو ہو سکتی تھی، جن کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ تمام وہ چیزیں جن کا خیال تک اُسکے دل میں آسکتا تھا۔ جن کے حصول کی اُسے اُمید ہو سکتی تھی۔ اُسے ایک شخص کی ذات میں مجتمع مل گئیں۔

اور جیسی سچی خوشی اُسے نصیب ہوئی اس سے بہتر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے؟

رات بھر میں بستر پر لیٹا اپنے میزبانوں کی حالت پر غور کرتا رہا، اور اپنے جی میں سوچتا رہا کہ کیسے خوش نصیب لوگ ہیں۔ کہ محبت کے آسمان کے زیر سایہ اپنی دُنیا آپ بنا کر راحت و عافیت میں بسر کر رہے ہیں۔

صبح ہوئی تو میں اپنے دستور کے مطابق اُن سے رخصت ہوا اور اپنی راہ پر چل دیا

کہانی ختم ہو گئی

ایک لیڈی نے یوں اظہار رائے کیا:-

"میں سمجھتی ہوں کہ یہ عورت کسی قدر پست ہمت تھی۔ اُس کے ارادوں میں بالکل بلندی نہ تھی۔ اور اُس کے خیالات بالکل محدود تھے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ بیوقوف تھی۔"

ایک دوسری لیڈی نے اختلاف کیا:-

"کچھ بھی ہو، وہ خوش تو تھی۔"

کمرے میں از سرِ نو خاموشی طاری ہو گئی۔

اور سمندر کے اُس پار جزیرہ کورسیکا، جو گویا ان وابستگانِ محبت کی داستان سنانے کے لئے جنہوں نے اُس کے پہاڑوں کے دامن میں پناہ لی تھی، ہماری محفل میں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ دوری اور شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی کے پردے میں پنہاں ہو رہا تھا۔

"ہ"

شاعر کا دِل

مفتونِ فریبِ آرزو ہوں شیدائے سرابِ رنگ و بو ہوں
افتادہ برنگِ خاک ہوں مَیں دامن کی طرح سے چاک ہوں مَیں
گہ عرشِ بریں مرا نشیمن گہ فرشِ زمیں ہے میرا مسکن
گردوں پہ قمر زمیں پہ دل ہوں
رسوائے جہانِ آب و گِل ہوں

مَیں قہر ہوں فتنہ ہوں بلا ہوں خود درد ہوں اور خود دوا ہوں
کعبہ ہوں کبھی کبھی کلیسا دریا ہوں کبھی کبھی ہوں صحرا
گہ سوزِ دروں سے داغ ہوں مَیں ٹوٹا ہُوا اِک چراغ ہوں مَیں
کانوں میں گفتگو کسی کی آنکھوں کو جستجو کسی کی
سرمایۂ دردِ جاں گسل ہوں
اِک شاعرِ بے نوا کا دِل ہوں

ناداں ہوں اگرچہ مانتا ہوں لیکن تجھے خوب جانتا ہوں
بُلبل کی نوائے درد میں تو ناکام کی آہِ سرد میں تو
ہنگامۂ ہست و بود تجھ سے ہے کارگہِ وجود تجھ سے
شیرینیِ خندۂ سحر میں حسرتؔ کی فغانِ بے اثر میں
تو ہے ۔ مری آرزو میں ۔ تو ہے
تو ہے ۔ مری جستجو میں تو ہے

حسرتؔ

قندِ مکرّر

جو نظر اٹھاؤ تو سامنے وُہی ایک پیکرِ ناز ہے
یہ طلسمِ حسنِ خیال ہے کہ درِ صنمکدہ باز ہے

تمہیں آرزو سے ہے دشمنی تو بڑھاؤ کیوں مرے حوصلے
جو نہ ہو سکے بدلِ جفا، تو وفا بھی فتنہ طراز ہے

یہ صفائے قلب ہے اے خدا، کہ ہے غازہ رُخ آتشیں
یہ تجلیوں کی تڑپ ہے، یا مرے آئینہ کو گداز ہے

نہ گئی وہ اپنی ربودگی، نہ اُٹھی وہ دل کی فتادگی
وُہی ایک صورتِ بے کسی بہ سرِ بساطِ نیاز ہے

کبھی محوِ لذتِ دید تھا کبھی اس میں رنگ امید تھا
دلِ مبتلا کا وُہ ولولہ، کہ جو صرف سوز و گداز ہے

یہ بجا کہ خلوتِ دل میں تُو ہے ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر آکے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو خوئے مجاز ہے

مجھے ہاں جنوں ہے مگر ذرا سرِ بزمِ عام نہ چھیڑنا
کہیں لوگ یہ نہ گماں کریں کہ تری ہنسی کوئی راز ہے

ہے عجب جہانِ بلا زماں مرا لامکانِ جنوں سُہا
کہ نہ وسعتیں ہیں نہ تنگیاں نہ نشیب ہے نہ فراز ہے

سُہا

(منقول از "ہزار داستان" بابت ماہ نومبر ۱۹۲۲ء)

خطاب
بہ
لالۂ صحرا

تخم اندوہ بسینہ مے کارم | داغ بر دل چو داغِ تو دارم
کہنہ داغ ترا نہ سوز و نہ ساز | من بہر لحظہ داغِ نو آرم
داغِ افسردہ را کہ تو داری | پیشِ ایں داغ داغ نشمارم
تو و وعظِ خموش و منبرِ شاخ | من بہر حرفِ خویش بر دارم
از غمِ روزگار دوں پرور | وقفِ سیل است چشمِ خونبارم
از تو تنہا نشیں ترم۔ ہر چند | تو بصحرا و من ببازارم
گر بتو دستِ شاہدے نرسی | خام و ناساز تر بود کارم
شعرِ من نغمہ ایست در صحرا | گوش ننہاد کس بر اشعارم
لیک دانی کہ از ستائشِ خلق | بے نیاز استم و سبکسارم

ایں متاعِ سخن کہ من دارم
نفروشم کہ خود خریدارم

میر ولی اللہ

وجدانیات

ہر طرف حسنِ فراواں نظر آتا ہے مجھے
شیوۂ ذوقِ طلب دیدۂ بینا ہے مجھے

جانے لے جائے کہاں عقل کی بے راہ روی
شکر ہے عشق کی لغزش نے سنبھالا ہے مجھے

یا اٹھانی ہی نہیں خاکِ محبت سے جبیں
یا اسے مہرِ درخشاں سے ملانا ہے مجھے

دل گنہگار نہیں آنکھ گنہگار سہی
تشنۂ جلوہ ہوں میں ذوقِ تماشا ہے مجھے

چشمِ ظاہر میں تو چھپنے سے رہی برقِ جمال
دیدۂ شوق میں اس نور کو رکھنا ہے مجھے

ہائے مجبوریِ تسلیم کہ دُنیا بھر نے
لاکھ بھی غم ہوں تو مسرور ہی دیکھا ہے مجھے

یہ تو کہنے سے رہیں وہ ہمیں معلوم نہ تھا
کہہ نہ دُوں آج نگاہوں میں جو کہنا ہے مجھے

منع کرتے ہیں رہِ عشق سے یوں اہلِ خرد
ننگ و ناموس کی گویا کوئی پروا ہے مجھے

مجھ کو سجدوں پہ نہ مجبور کرو اہلِ حرم
دیر والوں کو بھی مُنہ جا کے دکھانا ہے مجھے

محوِ پندار ہو جو تم یہی شایاں ہے تمہیں
بندۂ عجز جو ہوں میں یہی زیبا ہے مجھے

تو نہیں زہد طبع بزم نوائے جانِ سرور
جلوۂ شیشۂ مَے خونِ تمنّا ہے مجھے

جلوۂ دوست کی ہر چند مجھے تاب نہیں
دِل سے مجبور ہوں مَیں شوق تقاضا ہے مجھے

یہ تو ہم خوب سمجھتے ہیں کہ جانا ہے تمہیں
پر یہ اللہ نہ دہراؤ کہ جانا ہے مجھے

ظلمتِ دل کے لئے نورِ ضیا ہے درکار
شمعِ ہستی کو بہر طور بُجھانا ہے مجھے

مَیں کہاں آپ کا یہ جلوۂ بیباک کہاں
اپنی تدبیر پہ تقدیر کا دھوکا ہے مجھے

اے خوشا حال کہ آزاد جنوں ہوں عابدؔ
فکرِ دُنیا ہے نہ اندیشۂ عقبےٰ ہے مجھے

عابدؔ

عورت اور حسنِ تدبیر

(انقلاب فرانس کا ایک واقعہ جو ۱۵ ستمبر ۱۷۹۲ء کے ایک مسودے سے منقول ہے)

(۱)

جب مَیں کمرے میں داخل ہُوا تو میڈم ڈی بیوزی نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر ایک لمحے کے لئے وہ خاموش رہی۔ اُس کا رومال اور ٹوپ قریب ہی ایک آرام کرسی پر پڑے ہُوئے تھے۔

سامنے میز پر ایک کتاب کھُلی پڑی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی، کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور آفتاب کو شفق کے خونچکاں پردے میں پنہاں ہوتے ہُوئے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مَیں نے کہا۔ "میڈم آپ کو وہ الفاظ یاد ہونگے جو آج سے پُورے دو سال پیشتر اُس پہاڑی کے دامن میں جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے اور اُس دریا کے کنارے جس کی روانیوں کو آپ اس وقت دیکھ رہی ہیں، آپ نے مجھ سے کہے تھے؟

"آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے پیشینگوئی کے طریق پر میرے مستقبل کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا تھا۔ اور مجھے آگاہ کیا تھا۔ کہ میری آیندہ زندگی کیسی آزمائش و ابتلا، اور جرم و گناہ کی زندگی ہوگی۔ پھر آپ نے عین اُس وقت جب اظہارِ محبت کے الفاظ میری زبان پر تھے۔ مجھے ٹوک دیا تھا۔ اور دُنیا میں آزادی و حریت اور عدل و انصاف پھیلانے کی تلقین کی تھی۔ جب سے آپ نے اپنے اُس ہاتھ کے ایک اشارے سے جس پر آپ نے مجھے محبت کے بوسوں اور دلی شکریہ کے آنسوؤں کی بارش کرنے کی اجازت نہ دی۔ مجھے راہ راست بتائی اُس وقت سے لے کر آج تک مَیں نے آپ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھے اس خیال سے بیحد خوشی ہوتی ہے۔ کہ میرے قدموں کو کبھی لغزش نہیں ہُوئی میں نے آپ کے ارشاد و ہدایت پر پُورا پُورا عمل کیا ہے۔ آزادی و حریت اور عدل و انصاف کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کی ہیں، اور تحریر و تقریر کے ذریعے ان کی اشاعت کی کوشش کر رہا ہوں۔ آج اُس مبارک لمحے کو دو سال ہونے آئے ہیں۔ اس عرصے میں مَیں نے اپنی تمام طاقت سے حکومت کے اُن بھوکے بھیڑیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ جو خدا کی مخلوق کے لئے تکلیف و آزار کا باعث ہیں۔ اور اُن ریاکار رہنماؤں کے زہر آلود اثر کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ظاہری ہمدردی

ل اس افسانے کا مصنف فرانس کا مشہور ادیب اناطول فرانس ہے جس نے ۱۹۲۱ء میں دُنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

جتا کر اور آزادی کے سبز باغ دکھا کر خلقِ خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔"

اُس نے ہاتھ کی ایک جنبش سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ اور باہر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ "سُنئے۔"

مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ پائیں باغ کی عنبر آلود فضا سے جہاں پرندے اپنے راگ گا رہے ہیں۔ ایک دُور کی آواز آ رہی ہے۔ "مار دو، مار دو - پھانسی دے دو۔ سولی پر چڑھا دو۔"

یہ خوفناک الفاظ سُن کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

مَیں نے کہا "کسی غریب کی شامت آئی ہے۔ آج کل سرکاری آدمی گھر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ اور دن رات گرفتاریاں عمل میں آ رہی ہیں۔ کچھ تعجب نہیں وہ یہاں بھی آ پہنچیں مجھے اب یہاں سے رخصت ہونا چاہیے۔ ورنہ آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ مجھے یہاں جانتا تو کوئی بھی نہیں لیکن پھر بھی میرا یہاں ہونا مناسب نہیں۔"

اُس نے بتاکید کہا۔ "نہیں نہیں، ٹھہرئیے"

دوبارہ فلک شگاف نعرے گونجنے لگے۔ اور اب اُن میں ہزار ہا بھاری بھرکم قدموں کی آواز اور بندوقوں کی کھٹ کھٹ ملی جُلی صاف طور پر سُنائی دیتی تھی۔ وہ قریب آ پہنچے تھے۔ پھر ایک بلند اور خشمگین آواز آئی۔ "خبردار بھاگنے نہ پائے۔ خبردار۔"

معلوم ہوتا تھا میڈم دی لوزی کا خوف خطرہ جیسے جیسے قریب آتا جاتا ہے، دُور ہوتا جا رہا ہے۔

اُس نے نہایت پُرسکون لہجے میں کہا۔ "آئیے اُوپر کی منزل پر چلے چلیں۔ وہاں سے باہر کا نظارہ بہتر دیکھ سکیں گے۔"

مگر ہم نے کمرے کا دروازہ ابھی کھولا ہی تھا کہ ایک شخص برہنہ سر، برہنہ پا، حواس باختہ، بید کی طرح تھر تھر کانپتا ہُوا ہماری طرف بھاگا بھاگ آتا ہُوا دکھائی دیا۔ اور ہماری صورت دیکھتے ہی چلّایا:۔

"خدا کے واسطے میری جان بچا لینا۔ میرے پیچھے دوڑے آتے ہیں۔ میرے باغ میں گھس آئے تھے۔ میرے کواڑ توڑ دئے تھے .... اور اب میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔"

(۲)

میڈم دی لوزی نے اپنے ہمسایہ پلینشونت فلسفی کو پہچان لیا۔ اور اُس سے آہستہ سے پوچھا:۔

ؔ۵ یہ انقلاب فرانس کا واقعہ ہے۔ جب فرانس پر نئی نئی جمہوری حکومت قائم ہُوئی تھی۔ اور اُمرا و شرفا چُن چُن کر مارے جاتے تھے۔ میڈم دی لیوزی اس واقعے کا راوی، اور یہ شخص جس کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے۔ تینوں اسی معتوب جماعت کے افراد تھے۔

"کہیں آپ کو میری باورچن نے تو نہیں دیکھ لیا؟"

"نہیں نہیں، مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"بہت اچھا ہوا! خدا کا شکر ہے۔"

پھر وہ اُسے اپنے سونے کے کمرے میں لے گئی اور مَیں بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اب آپس میں مشورہ ضروری تھا۔ کسی ایسی جگہ کے متعلق فی الفور فیصلہ کرنا لازمی تھا جہاں وہ چند دن تک یا کم از کم چند گھنٹوں تک یا جبتک بھی تلاشی لینے والے تھک کر چلے نہ جائیں، چھپا رہ سکے۔ قرار پایا کہ مَیں دروازوں اور کھڑکیوں کی نگہبانی کروں۔ اور جب ذرا کھٹکا ہو، فوراً اس مفرور قیدی کو آگاہ کردوں تاکہ باغ کے دروازے سے نکل بھاگے۔

بیچارے سے خوف کے مارے اپنے پاؤں کھڑا نہ ہُوا جاتا تھا مگر اپڑتا تھا۔ اس کی ٹانگیں جواب دے جاتی تھیں۔

اُس نے بصد مشکل ہمیں خفیفت حال سے واقف کیا بات یہ تھی کہ اس پر حکومت جمہوریہ کے خلاف سازش کرنے کا الزام عاید کیا گیا تھا۔ مزید برآں اُس پر یہ الزام تھا کہ وہ شاہی محل کے محافظوں میں شامل تھا۔ حالانکہ بادشاہوں اور پادریوں کا اُس سے بڑھ کر کوئی مخالف نہ تھا! واقعہ اصل میں یہ تھا۔ کہ اُس کا جانی دشمن لوبن جس سے اُس کی مدتوں سے لگی تھی۔ آجکل صاحبِ اختیار تھا۔ وہ پہلے اُس کا شاگرد تھا لیکن اب جیسا کہ نالایق اور نامسعود شاگردوں کا قاعدہ ہوتا ہے۔ برسرِ اقتدار ہو کر اپنے اُستاد کی سزاؤں کا بدلہ لے رہا تھا!

جب لوبن کا نام اُس کی زبان پر آیا تو اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ گویا وہ سچ مچ اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اور اُس نے خوف اور نفرت سے اپنے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور فی الواقعہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ میڈم دی لوزی نے بجلی کی سرعت سے دروازے بند کردئے اور اپنے بوڑھے ہمسائے کو ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا۔ دروازے پر کسی کے زور زور سے دستک دینے کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی باورچن کی آواز سُنائی دی کہ جلدی دروازہ کھولئے۔ سرکاری آدمی تلاشی لینے آئے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پلنشونٹ یہاں چھپا ہُوا ہے مَیں جانتی ہوں کہ یہ جھوٹی بات ہے آپ ایسے بدمعاش کو بھلا کب آنے دینے لگی تھیں؟ مگر وہ میری بات نہیں مانتے۔ تلاشی لے کر ہی رہینگے۔"

میڈم دی لوزی نے اندر سے جواب دیا: "ہاں ہاں تو اُنہیں آنے دو۔ روکتی کیوں ہو؟ بڑی خوشی سے جہاں جہاں کی چاہیں تلاشی لے لیں۔"

جب اُس نے یہ الفاظ سُنے، تو بدقسمت فلسفی پردے کے پیچھے بیہوش ہوگیا۔ اور اُسے ہوش میں لانے

کیلئے مجھے اُس کے مُنہ پر بہت دیر تک پانی چھڑکنا پڑا۔

جب اُس کے ذرا حواس قائم ہُوئے، تو میڈم دی لوزی نے اس کے کان میں کہا۔" آپ مجھ پر اعتماد کیجئے۔ گھبرایئے نہیں عورتوں کی چالاکی سے آپ واقف نہیں ہیں۔"

پھر اُس نے نہایت اطمینان اور دلجمعی سے، گویا خانہ داری کا کوئی معمولی کام انجام دے رہی ہے۔ چارپائی کو گھسیٹ کر اپنی جگہ سے ایک طرف ہٹایا، بستر لپیٹا، اور میری مدد سے گدے ایسے طور پر ایکدوسرے کے اُوپر رکھے کہ آدمی چھپ سکے۔

وہ یہ انتظام کر ہی رہی تھی کہ کمرے کے باہر سے جوتوں اور بندوقوں اور کرخت آوازوں کا ایک مخلوط شور سُنائی دیا۔ آزمائش کا لمحہ آخر کار آپہنچا تھا۔ ہمارے لئے یہ لمحہ نہایت خوفناک لمحہ تھا۔ لیکن شور دھم پڑتا ہُوا سُنائی دیا۔ وہ لوگ ہمارے کمرے کے قریب سے گزر کر اُوپر کی منزل کو جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چھت پر اُن کے قدموں کی بھاری آواز سُنائی دینے لگی۔ چھت کڑکڑا نے لگی۔ ہنسی اور دھمکیوں کی آواز اور سنگینوں سے الماریوں کو دھکیل کر ہٹانے کا شور پیدا ہُوا۔

ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے ایک لمحہ کا توقف کئے بغیر پلنشونت کو گدوں کے نیچے دبکا دیا۔

اگرچہ ہم نے بستر کو ہموار کرنے کی بہت کوشش کی لیکن پھر بھی شک کی گنجائش رہ گئی۔

میڈم دی لوزی نے بھی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ لیکن اُس کے آزمودہ کار ہاتھ بھی بستر کو ہموار نہ کر سکے۔

آخر کار اُس نے کہا۔" مجھے خود بستر پر لیٹنا پڑیگا۔"

پھر اُس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ پورے سات بجے تھے۔ اُس نے سوچا کہ اتنی سویرے لیٹ جانا کسی قدر عجیب معلوم ہوگا۔ اور اگر بیماری کا بہانہ کروں تو یہ بھی مفید نہیں۔ باورچن تاڑ جائیگی۔ اور تلاشی کرنے والوں کو بتا دیگی۔

وہ تھوڑی دیر تک غور کرتی رہی۔ پھر اُس نے بغیر اس بات کی پرواکئے کہ میں قریب کھڑا ہوں کپڑے اُتار کے شب خوابی کا لباس پہنا، اور بستر پر لیٹ کر مجھ سے کہنے لگی۔ کہ" اپنا جوتا اور کوٹ اُتار ڈالئے۔ اور میرے برابر لیٹ جایئے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں اور آپ ایک لمحے کے لئے عاشق و معشوق بن جائیں۔ اور یہ ظاہر کریں۔ کہ گویا یہ لوگ بے اطلاع آپہنچے ہیں۔ جب وہ آئیں تو آپ یوں اُٹھ کر دروازہ کھولئے گا کہ جیسے آپ بدحواس ہو کر اُٹھ بیٹھے ہیں۔"

ہم نے بمشکل یہ انتظامات ختم کئے ہونگے کہ تلاشی لینے والوں کے اُوپر سے اُترنے کی آوازیں آنے لگیں۔

بدقسمت پلنشونت کے جسم پر فرطِ خوف سے ایسا لرزہ طاری ہُوا کہ تمام چارپائی کانپنے لگی۔

اس کے علاوہ اُس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز ایسی بلند تھی کہ میرا خیال ہے برآمدے میں سُنائی دیتی ہوگی۔

میڈم دی لوزی نے یہ حال دیکھ کر کہا۔

"مجھے خوف ہے کہ کہیں ان کی بدحواسی بنا بنایا کام نہ بگاڑ دے۔ خیر دیکھئے کیا ہو۔"

کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میڈم دی لوزی نے پُوچھا "کون ہے؟"

"قوم کے نمایندے۔"

"آپ ذرا انتظار نہیں کر سکتے؟"

"جلدی دروازہ کھولو۔ نہیں تو ابھی توڑے دیتے ہیں۔"

"اچھا اُٹھئے، دروازہ کھول دیجئے۔"

یکایک، خدا جانے کس طرح، پلنشونت نے کانپنا اور زور زور سے سانس لینا بند کر دیا۔

(۳۲)

سب سے پہلے جو شخص داخل ہُوا، وہ لوبن تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے مسلح آدمیوں کی ایک قطار تھی۔

اُس نے پہلے میڈم دی لوزی کی طرف، اور پھر میری طرف دیکھا۔ اور دبی زبان سے مصنوعی معذرت کے لہجے میں کہا۔ "اُوہ، مجھے معلوم نہ تھا۔ معاف کیجئے گا۔"

پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر طنزیہ انداز میں کہا۔ "زندگی بس انہی لوگوں کی ہے! ہم بھی کوئی زندوں میں ہیں!"

یہ کہکر وہ بستر پر ہمارے قریب بیٹھ گیا۔ اور میڈم دی لوزی کے چہرے پر گستاخانہ نظریں جما کر کہنے لگا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ یہ دلربا صورت اس لئے نہ بنائی گئی تھی کہ دن رات عبادتوں میں ماتھے رگڑا کرے۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خیر مجھے پہلے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ میں یہاں پلنشونت کی تلاش میں آیا ہوں جو حکومت کا مجرم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں چھپا ہُوا ہے۔ اور میری آپ کی اور سب کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ اُسے میرے سپرد کر دیں۔"

"آپ بڑی خوشی سے اُس کی تلاش کیجئے۔ آپ کو روکتا کون ہے؟"

سب یکبارگی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔ کسی نے کرسیاں اُلٹا کر دیکھیں۔ کوئی میزوں کے نیچے دیکھنے لگا۔ کسی نے الماریاں کھولیں۔ کسی نے سنگینوں سے بستر کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔

لوبن نے سر کھجلاتے ہُوئے میری طرف شک کی نگاہوں سے دیکھا۔

میڈم دی لوزی نے فوراً اس خیال سے کہ کہیں مجھ سے جرح کرکے میرے منہ سے سچ نہ کہلوا لے۔ مجھ سے

مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ تو میرے گھر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جائیے ان صاحبوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جائیے۔ مجھے امید ہے ایسے سچے خادمانِ قوم اور محبانِ وطن کی رہنمائی کی خدمت آپ اپنے لئے فخر کا باعث سمجھیں گے۔"

میں چابیوں کا گچھا لیکر اُن کے آگے آگے چل دیا اور اُنہیں سیدھا تہ خانے میں لے گیا۔ وہاں شراب کی بوتلیں دیکھ کر سپاہی اُن پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے پیاسا چشمے کی طرف دوڑتا ہے۔ جب سب پی کر سیر ہو لئے تو لوبن نے اپنی بندوق کے دستے سے شراب کے مٹکے اُلٹا دِئے۔ اور تہ خانے میں شراب کی ندی بہا کر اپنے سپاہیوں کو روانگی کا حکم دیا۔ میں بڑے دروازے تک اُن کے ساتھ گیا۔ اور جب وہ سب باہر نکل گئے تو دروازہ بند کر کے میڈم دی لوزی کی طرف دوڑا۔ کہ اُسے خطرے سے نجات پانے کی خوشخبری سناؤں۔

وُہ یہ خوشخبری سُن کر بستر پر سے اُٹھی۔ اور پلنشونت کو آواز دی۔ کہ "اب باہر آجائیے وہ چلے گئے۔"

گدوں کے نیچے سے کسی کے ہلنے کی آواز آئی۔ اور پھر اطمینان کا ایک سانس لے کر پلنشونت اپنی پوشیدگی کی جگہ سے باہر نکل آیا۔

"خُدا کا شکر ہے۔ کہ آپ زندہ ہیں۔ میرا تو خوف کے مارے دم نکل گیا تھا۔ کہ کہیں آپ گدّوں کے نیچے دب کر چل نہ بسے ہوں۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا۔

"صاحب، آپ کو مجھ سے اظہارِ محبت کرنے کا بہت شوق تھا۔ میرا خیال ہے، آیندہ آپ اس کی چنداں ضرورت نہ محسوس کرینگے۔"

(از اناطول فرانس)

محمد عظیم الدین بی اے

گلزارِ خلیل

جنونِ وفا کا الٰہی بھلا ہو — نہاں ہر ستم میں کرم دیکھتے ہیں

تڑپتے ہیں سجدے ہزاروں جبیں میں — جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اُنہیں مُسکراتے ہیں گر دیکھ لیتے — تبسّم کو غنچوں میں کم دیکھتے ہیں

جہاں انعکاس جمالِ صنم ہو — پرستارِ اُلفت کو خم دیکھتے ہیں

اِدھر بھی، ذرا۔ اے مہ حسن و خوبی — "تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں"

نہیں دیکھتے اپنی قسمت کے چکّر — تری زلف کے پیچ و خم دیکھتے ہیں

خلیل

تجلیات

شرع سے دشمنی خدا سے گریز
ہائے عابد کی طبع کفر انگیز

نہ مجھے حور خلد کی خواہش
نہ حسینوں کے عشق سے پرہیز

عشرتیں کائنات کی فانی
عشرتوں کا خیال درد انگیز

مطرب! اک نغمۂ نشاط افروز
ساقیا ساغرِ مئے گلریز

غرق ہے نور میں وصال کی رات
موجہائے بہار سے لبریز

آہ! وہ ابتدائے عشق کے دن
آہ۔ وہ گفتگوئے مہرآمیز

گیسوؤں والیاں ہیں محو نیاز
بُتکدے کی سحر ہے عنبر بیز

واعظوں کو ریاض خلد کے خواب
میگساروں کو عشرتِ پرویز

اللہ اللہ میکدے کی فضا
نغمہ زن۔ گلفشاں محبت خیز

عابد

تبصرے

ساربان

(کتابت ۔ طباعت ۔ کاغذ غنیمت ۔ حجم ۴۳ صفحات

قیمت کتاب پر درج نہیں ۔ ملنے کا پتہ : مسلم بک ایجنسی لاہور)

یہ قصہ اکثر سننے میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی قاتل کی حاضری کا ضامن بنتا ہے ۔ اور عین وقت پر قاتل آکر ضامن کو قصاص سے بچاتا ہے ۔ اسی پامال اور افسردہ کہانی کو عہدِ فاروقی سے وابستہ کر کے جناب اسلم نے اسے زیادہ با اثر اور پُر شکوہ بنا دیا ہے ۔ بچوں کے پڑھنے کے لئے خوب ہے ۔ البتہ زبان ذرا قابلِ اصلاح ہے ۔

ذکریٰ

(کتابت ۔ طباعت اور کاغذ گوارا ۔ حجم ۸۳ صفحات

قیمت فی جلد ۸ ۔ ملنے کا پتہ : ناظم شرکت ادبیہ علیگڈھ (یو ۔ پی))

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان دو مقالات عالیہ کا مجموعہ ہے ۔ جو مرحوم البلاغ میں بالاقساط شائع ہوتے تھے ۔ مولود نبویؐ کی تقریب سعید کو سامنے رکھ کر مولانا نے احیائے ملتِ بیضا کے لئے بہت کام کی چیزیں بتائی ہیں ۔ اور خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کو راز کامیابی ثابت کیا ہے ۔ اس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے سعادتِ دارین کا موجب ہے ۔

سوانح شاد عظیم آبادی

(حسنِ صوری سے معرا ہے ۔ حجم ۷۹ صفحات

ایک جلد کی قیمت عہ زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔

ملنے کا پتہ : سید فہیم الدین احمد اقبال منزل لودی کٹرہ ۔ پٹنہ)

خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی اُردو زبان کے ایک قادر الکلام ۔ کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں ۔ آپ نے اپنی طویل عمر کا معتد بہ حصہ زبان اُردو کی خدمت کی نذر کیا ہے ۔ مخزن مرحوم کے معتد کارناموں سے ایک یہ بھی ہے ۔ کہ وہ سید صاحب کو کنج خلوت سے کھینچکر بزم اُردو میں لے آیا ۔ اور اس طرح ارباب ذوق کو ان کے کلام سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ۔ جناب قیس رضوی نے زبانِ اُردو پر بڑا کرم فرمایا ہے ۔ کہ آپ کی سوانح حیات کو یکجا جمع کر کے ایک رسالہ کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب اور طباعت میں بہت عجلت سے کام لیا گیا ہے ۔ اور اس لئے بیشتر مباحث تشنہ رہ گئے ہیں ۔ امید ہے کہ جناب مؤلف خود یا سید صاحب کے کوئی اور شاگرد رشید بہتر اسلوب ۔ بہتر زبان اور زیادہ تحقیق سے

اس کتاب کو از سر نو مرتب فرمائینگے۔ اور قدر دانانِ شاد کو یہ معلوم کرنے کا موقع دینگے۔ کہ آپ کے کلام کے خصوصیات کیا ہیں۔ معترضین نے کیا کیا اعتراض کئے تھے۔ اور کہانتک حق بجانب تھے نیز یہ کہ آپ شاگردوں کو اصلاح دیتے وقت کن باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا کرتے ہیں۔ ہمیں یہ سُن کر از حد قلق ہُوا کہ آپ کی کچھ کم پچاس تصنیفات سے ہنوز صرف چند ایک ہی طبع ہُوئی ہیں۔ اور باقی ابھی تک منتظر اشاعت ہیں۔ ہم انہیں مشورہ دینگے کہ وہ پنجاب کے کسی تاجر کتب سے خط و کتابت کریں

اس طرح طباعت کی ضرور سبیل نکل آئیگی۔ ہمارے ہاں جب ہر اس چیز کے چھپ جانے کا امکان ہے جس پر لفظ کتاب کا اطلاق ہوسکتا ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت شاد جیسے بلند پایہ ادیب کے رشحات قلم اشاعت سے محروم رہ جائیں۔ دیکھئے یہ ناقدری اور ادب ناشناسی کا عالم کب تک رہتا ہے۔ اور اُردو کب ہندی سے اشاعت کا صحیح سبق سیکھتی ہے اس رسالہ کے ساتھ جناب شاد کا تازہ کلام اور اصلاحات کے چند نمونے بھی شامل ہیں۔ جو بجائے خود بہت دلچسپ ہیں۔

اولڈ بوائے علیگڈھ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو زیر ادارت جناب سید محمد خاں بی۔ اے غالباً بھوپال سے شائع ہونا شروع ہُوا ہے۔ لابدی ہے کہ اسکی کچھ قیمت مقرر ہو۔ مگر فی الحال اسے ظاہر نہیں کیا گیا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ علیگڈھ کالج کے پرانے طلباء کا ارگن ہے۔ اور زیادہ تر انہیں باتوں سے پُر ہے جن میں فرزندانِ علیگڈھ دلچسپی لے سکتے ہیں بین السطور سے ہویدا ہے۔ کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دو جماعتوں پر منقسم ہو چکی ہے۔ اور یہ رسالہ انہیں سے ایک جماعت کا علمبردار ہے۔ چھوٹے چھوٹے مناقشات بڑی جماعتوں میں رونما ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور باقاعدہ پروپاگنڈے پر اُتر آنا مفاد ملّی کے منافی ہے۔ یہ گھر کے جھگڑے گھر ہی میں نبٹ جائیں تو اچھا ہوتا ہے۔ انہیں رسوائے کوچہ و بازار کرنا اپنی آپ توہین کرنا ہے۔ چونکہ جناب آغا محمد صفدر صاحب بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے توقع ہے کہ ان کی معاملہ فہمی اور مآل اندیشی ضرور رہبر دے کار آئیگی۔ اور اولڈ بوائز کا اتحاد دیگر مسلمانوں کے لئے نمونہ کا کام دیگا۔

"ادب اردو اور سر سید" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون شروع ہُوا ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے۔ امید کہ قابل مضمون نگار اس ضروری مضمون پر دل کھولکر بحث کرینگے۔ اور سر سیّد نے زبانِ اُردو کی جو گرانمایہ خدمت کی ہے اسکے ہر پہلو پر روشنی ڈالینگے۔

ڈرامی

مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہر صبح دِلکشا میں		ہر شام جانفزا میں
آئینۂ صبا میں		گلہائے خوشنما میں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں

خورشید کی کرن میں		تاروں کی انجمن میں
تصوِ ہر چمن میں		فطرت کے بانکپن میں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں

مینائے خوش گلو میں		صہبائے مشکبو میں
رندوں کی آرزو میں		مستوں کی ہائے وہو میں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہر رنگِ دِلستاں میں		حُسنِ رُخِ بُتاں میں
سازِ طرب فشاں میں		مطرب کے خوش بیاں میں
مَیں تجھ کو دیکھتا ہوں
میں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہر شے میں تو نہاں ہے		ہر شے سے تو عیاں ہے
ہر دِل ترا مکاں ہے		تو وردِ ہر زباں ہے
تو زینتِ چمن ہے
تو جانِ انجمن ہے

فگارؔ

داستانِ آرزو

عقل کہتی ہے مَیں کیا جانوں بیانِ آرزو
دِل پُکار اُٹھتا ہے مَیں ہوں داستانِ آرزو

آرزو نے رازِ ہر دل آئینہ ہم پر کیا
سب کی ہے یہ رازداں ہم رازدانِ آرزو

حسرتیں مُردہ شکستہ حوصلے سامانِ یاس
دِل میں بسمل کے یہی کچھ ہیں نشانِ آرزو

پے بہ پے ناکامیوں سے شوقِ سجدہ بڑھ گیا
یاس کیا ہم سے چھڑاتی آستانِ آرزو

کِس طرح رازِ حقیقت سے وہ دِل محرم نہ ہو
جس کے پہلو میں ہو پوشیدہ جہانِ آرزو

مشکلاتِ راہ کا مشتاق ہے جوشِ جنوں
آہیں گر آتی ہیں لینے امتحانِ آرزو

دل کی بربادی کا ساماں ہے حصولِ وصلِ یار
جستجو تے برق میں ہے آشیانِ آرزو

ذرّہ ذرّہ دہر کا ہے گریہ ساماں اے خیالؔ
پتّی پتّی گلستاں کی ہے زبانِ آرزو

خیالؔ

غزل

رنجِ فراقِ یار کی ہمّت نہ ہو سکی
یعنی دُعائے ترکِ محبّت نہ ہو سکی

تمکینِ ناروا میں وُہ پرسش نہ کر سکے
خودداریوں میں ہم سے شکایت نہ ہو سکی

ہم اُن سے اضطراب میں کچھ بھی نہ کہہ سکے
بس مختصر یہ ہے کہ صراحت نہ ہو سکی

اللہ رے دشتِ عشق میں وارفتگی شوق
مجھ سے تمیزِ راحت و زحمت نہ ہو سکی

سُنتے رہے وہ شوق سے میری شکایتیں
کچھ بات تھی کہ ان سے ملامت نہ ہو سکی

ہیں شادکامِ عشق دلِ شادماں سے ہم
محسوس ہم کو کوئی مصیبت نہ ہو سکی

حیرت فروز ہو گئیں تیری تجلّیاں
دیدارِ برقِ حُسن کی جُرأت نہ ہو سکی

اکبر زمینِ شعر نہ تھی درخورِ وفا
آئینہ دارِ رنگِ طبیعت نہ ہو سکی

جلال الدین اکبر

لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کتابیں

محترمہ محمدی بیگم مرحومہ کی لکھی ہوئی کتابیں

کتاب	قیمت
امتیاز بیچیسی	
تاج گیت	۳ر
تاج پھول	۵ر
ریاض پھول	۷ر
دلچسپ کہانیاں	۱۰ر
دلپسند کہانیاں	۱۲ر
تین بہنوں کی کہانی	۶ر
علی بابا چالیس چور	۵ر
انگریزی گرامر	۳ر
چوہے بلی نامہ	۲ر

سید امتیاز علی تاج کی لکھی ہوئی کتابیں

کتاب	قیمت
بچوں کی بہادری	۴ر

کتاب	قیمت
سوت کا راگ	۳ر
سمندری شہزادی	۴ر
سپاہی اور درویش	۶ر
ابوالحسن	۶ر
چڑیا خانہ حصہ اول	۱۲ر
〃 〃 دوم	عہ ر
گدگدی حصہ اول	۸ر
〃 〃 دوم	۱۲ر
پرستان حصہ اول	۷ر
〃 〃 دوم	۷ر
بادشاہوں کی کہانیاں	۷ر
پھول کی کلیاں	۸ر

اور لکھنے والوں کی کتابیں

کتاب	قیمت
منتخب الحکایات	۸ر
چند پند	۸ر
عزم بالجزم	۳ر
پیٹو نوجوان کا قصہ	۴ر

کتاب	قیمت
سلیم کی کہانی	۴ر
پھولوں کا ہار	۵ر
نیک انجام	۴ر
تین بھائیوں کی کہانی	۵ر
سپاہی زادہ	۴ر
بن باسی رستم	۶ر
زلفی	۷ر
صبح ملال و شام غم	۱۲ر
قصر صحرا حصہ اول	۱۰ر
〃 〃 دوم	عہ ر
خونابۂ عشق	عہ ر
حکایات شرلک ہومز	عار
بادل کے بچے	عہ ر
الماس	عہ۸ر

بچوں کے لئے تازہ کتابیں

کتاب	قیمت
ستارہ کی گڑیا	۲ر

فطرت نگار سُدرشن کو پانسو روپیہ انعام

گورنمنٹ پنجاب نے فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کتاب پر اُنہیں پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ یہ کتاب کیسی ہوگی اور اس میں کیا ہوگا۔ مگر سچ کہا جائے تو اُنکی ہر ایک کتاب اس قابل ہے۔ کہ اُس پر کئی کئی ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔ یہ کتاب مصنّف نے ہندی میں لکھی تھی۔ اور اب احباب کے اصرار پر خود ہی اسکا اُردو ترجمہ کرکے شائع کرا دیا ہے۔ اس اُردو کتاب کا نام محبّت کا انتقام ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ محبّت جب انتقام کی بھوکی ہو جاتی ہے۔ تو کیا کرتی ہے۔ محبّت کا ایثار کئی مصنّفوں نے لکھا ہے مگر محبّت کا انتقام لکھنا قدرت نے سُدرشن کے لئے اُٹھا رکھا تھا۔ اور اب وہ چیز تیار ہے اگر آپکو عورت کی فطرت اور محبّت کا فلسفہ نیز انسانی دل کی بلندیوں اور پستیوں کا علم حاصل کرنا ہو۔ تو محبّت کا انتقام دیکھئے۔ زبان پر سحر۔ کاغذ چکنا۔ کتابت حسین۔ چھپائی پیاری۔ عورت مرد۔ بچے بوڑھے سب کے کام کی چیز ہے۔ قیمت عمر

چندن

اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی پندرہ دلچسپ کہانیاں درج ہیں۔ ہر کہانی پڑھ کر یہی خیال گزرتا ہے۔ کہ اس سے اچھی کہانی مصنّف بھی نہ لکھ سکیگا مگر ہر دوسری کہانی اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب نے محبّت کا انتقام پر انعام دیا ہے لیکن سُدرشن کی نگاہوں میں چندن کا درجہ اُس سے بہت بلند ہے۔ اور اُنہیں اس کتاب کے مصنّف ہونے پر فخر ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے قیمت (عہ) سُنہری ریشمی جلد دو روپے (عصہ)

بہارستان

فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ۔ جس پر مصنّف کو خود ناز ہے اور جسکے متعلق کئی دوستوں کی رائے ہے۔ یہ سُدرشن کا ماسٹر پیس ہے۔ اگر آپکو بہترین کہانیاں دیکھنا ہو۔ تو بہارستان دیکھئے۔ جسکے مقابلہ کی کتاب اُردو زبان میں آجتک شائع نہیں ہوئی۔ بےنظیر کہانیاں ہیں۔ زبان صاف۔ پلاٹ دلکش۔ نتیجے دلمیں اُتر جانیوالے۔ کاغذ خوبصورت۔ طباعت نہایت حسین اور چھپائی پیاری۔ دیباچہ منشی پریم چند صاحب نے لکھا ہے۔ قیمت عہ سُنہری ریشمی جلد عہ

قوم پرست

یہ کتاب بنگال کے شہرہ آفاق ڈرامائسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کے ایک ناٹک کا ترجمہ ہے مگر خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی جذبات کا موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھنا ہو۔ تو یہ کتاب پڑھیئے۔ جو آپ کی آنکھوں سے زبردستی آنسو نچوڑ لیگی (عہ)

چٹکیاں

نئی طرز، نئی ادا، درختوں، پتھروں اور ندی نالوں کے سرمن۔ چاند تاروں کے اور پھولوں پھلوں کے لذت آشنا خیالات، ایک ایک مضمون میں مصنف نے دل نکال کر رکھدیا ہے دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت چار آنے .... (۴ر)

کنج عافیت

یہ ناول غضب کا دلفریب ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا بلند ترین چلن دکھا کر اُس کے ساتھ یورپین عورت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس ناول کو خود پڑھیئے آپ ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے لگیں گے۔ اپنی بیوی کو پڑھائیے اُس کی زندگی اور بھی بلند ہو جائیگی۔ قیمت ۱۲ر

تہذیب کے تازیانے

بنگال کے نامور ناول نویس بابو بنکم چٹرجی کی شہرت اُنکی کتابوں میں ہے اور اُنکی کتابوں کی روح وہ مضامین ہیں جنکا ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے تہذیب کے تازیانے کے نام سے کر کے اُردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے نقادانِ ادب کی رائے ہے کہ ایسی کتاب اُردو میں آجتک شائع نہ ہوئی تھی قیمت ۱۲؍

بنگال بنیبی

بنگال کے مشہور قصہ نویس بابو رابندر ناتھ ٹیگور پربھات کمار۔ سیتا دیوی۔ شانتا دیوی۔ نروپما دیوی۔ جلدھر سین۔ شرت چندر۔ سورن کماری وغیرہ وغیرہ قابلقدر ہستیوں کے بتیس افسانے قیمت حصہ اوّل (عہ) حصہ دوم ۱۲؍

بیگناہ مجرم

اِس ناول میں فطرت نگار سُدرشن نے فرانسیسی اور بنگالی انشا پردازی کو یکجا کر دیا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ اُردو ادب کی شان کو میلا نہیں ہونے دیا۔ ایسا پُر اثر، ایسا پُر لطف اور ایسا پُر سبق ناول آپنے آجتک نہ دیکھا ہوگا دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب تیسرا شائع ہُوا ہے۔ قیمت عہ؍

صبحِ وطن

حُبِ وطن کے قصّے، جان فروشی کی کہانیاں۔ بہادری اور دلیری کے زندہ واقعات کاغذ کے سٹیج پر۔ یہ اُن سُورماؤں کی کہانیاں ہیں۔ جو شہرت کے پلیٹ فارم پر آئے بغیر مُلک کیلئے شہید ہوئے۔ اُن سر بکف دلاوروں کے افسانے ہیں۔ جنہوں نے اپنا متاعِ دل تاریکی میں وطن پر نثار کیا۔ دوسرا ایڈیشن ختم ہونیوالا ہے۔ قیمت عہ؍

آنریری مجسٹریٹ

مذاقیہ ڈراموں کا شہنشاہ ہے اعلان کردہ کہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی ایسا تفریحی ڈراما آجتک نہیں شائع ہُوا۔ ایک ایک فقرہ قہقہوں سے بھرا ہے۔ فرانس کے مشہور ناٹک نویس مولیئر کے بہترین ڈراما کے مقابلہ کا ہے۔ قیمت ۱۲؍

مَن کی موج

یہ کتاب "چٹکیاں" کی بہن ہے۔ وہی رنگ وہی انداز، وہی طرز، وہی ادا پیرایا ایسا مذاقیہ۔ کہ آپ پڑھ کر لوٹ جائیں۔ مگر نتائج ایسے سنجیدہ کہ آپ دل پکڑ لیں۔ اور مصنّف کی قابلیّت پر عش عش کر اُٹھیں۔ پہلے ایڈیشن میں ۹۶ صفحے تھے اور قیمت ۸ اب حجم بڑھا کر ۱۴۴ صفحے قیمت ۱۲؍

عورت کی محبت

عورت کی محبت اور پھر بنگالی عورت کی! اور خاصکر اُس صورت میں جبکہ اُسکا لکھنے والا بنگال کا نہیں بلکہ موجودہ ایشیا کا شیکسپیئر ڈی۔ ایل۔ رائے ہے اور اُسے ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے کیا ہو۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ قیمت عہ

سدا بہار پھول

اِس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ ان کا پلاٹ بیحد دلچسپ ہے۔ پڑھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے یہ فطرت نگار کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جسنے اُن پر شہرت کا در وا کیا تھا۔ تین ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت ۱۲؍

زہریلا آبحیات

مُسلمان بادشاہوں کے عہد میں ایک ہندو سلطنت قائم ہوئی اور پھر ہندو حکمران ہی کی غلطیوں کی بدولت پاش پاش ہوگئی کیسی طرح؟ یہ پڑھ کر دیکھئے۔ اصل ناول بنگالی زبان میں ہے، اور مشہور ناول نویس بابو بنکم چندر چٹرجی کے قلم سے ہے۔ فطرت نگار سُدرشن نے اسے اُردو جامہ پہنایا ہے دوسرا ایڈیشن عہ

وجے سنگھ

سوتیلی ماں کیا کچھ کر سکتی ہے باپ محبت پدری کے جوش میں کس طرح دیوانہ ہو جاتا ہے عالم شباب میں حُسن و عشق کیا کیا رنگ بدلتے ہیں۔ یہ سب کچھ اِس کتاب میں دیکھئے۔ انسانی فطرت کا ایسا صحیح بیان اور کہیں نہ ملے گا۔ قیمت عہ؍

گلدستہ سخن

اگر آپکو اُردو زبان کے شاعروں کی بہترین نظموں کا انتخاب دیکھنا ہو تو یہ کتاب دیکھئے۔ اگر آپکو مولانا حالی۔ حضرت آزاد۔ ڈاکٹر اقبال سرور۔ چکبست۔ محروم۔ ارشد۔ وفا۔ مہر۔ نیرنگ۔ ناظر۔ نادر۔ برق۔ اُفق کی کلام زندہ جاوید سے فائدہ اُٹھانا ہو۔ تو یہ کتاب دیکھئے۔ شروع میں اردو شاعری کی تاریخ پر ۴۸ صفحے کا ایک پُر زور دیباچہ بھی ہے۔ قیمت (عـ۸؍) سُنہری ریشمی جلد (عہ۸؍)

ملنے کا پتہ: منیجر رام کُٹیا بک ڈپو۔ لاہور

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

جانِ ظرافت:۔ ایک بزمیہ ڈرامہ ہے جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی، دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ اصل کتاب مولیئر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں۔ جو جرمنی کے مشہور ڈرامانگار لیسنگ اور فارس میں ڈرا کے موجد آغا جعفر کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مُصنّفین کی طبعزاد ہیں۔ غرضکہ اس زعفران کی بالیدگی کے لئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اس کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہوسکتی ہے۔ کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے۔ قیمت ۸ ر، ۶ فیجلد۔

قزّاق:۔ جرمنی کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر اور ڈرامانگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھال کر دُنیا کے نشیب و فراز، اعمالِ بد کے مآل کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو بھاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اُردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصوّر کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ کنور سین صاحب ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر اسے از حد دلچسپ خیال فرماتے ہیں۔ قیمت فیجلد ۸ ر۔

ظفر کی موت:۔ بلجیم کے چابکدست اور مجیر العقول ڈرامانگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جسمیں ایک بہن کی محبّت کا جلوہ دکھا کر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جن کا اظہار زبان سے نہیں ہوسکتا انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیّت ہے عجب پُر تاثیر کتاب ہے۔ جسکے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے قیمت ۴ ر

بگڑے دل:۔ فرانس کے ستم ظریف ڈرامانگار مولیئر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ مبصروں کی رائے میں حُسنِ زبان، اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیات عالم میں ناپید ہے۔ اور شعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے۔ اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن اُلجھنوں میں پھنستا ہے۔ قیمت فیجلد ۸ ر

تین ٹوپیاں:۔ جو دورِ جدید کی ایک فرانسیسی فارس کا عکس ہے۔ قیمت فیجلد ۸ ر۔

اُردو کا ماہانہ رسالہ شمعؔ-آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمعؔ نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب، محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمعؔ مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں۔ اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں۔ اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی ذاتی فایدہ شامل نہیں۔ اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ چھ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۱۰ر۔

المشتہر: مینجر رسالہ شمعؔ حسن منزل شاہ گنج آگرہ

آسمان نسائیت کا آفتاب درخشاں

یعنی

نور جہاں

افق صحافت سے طلوع ہو گیا

اور اس بدیع المثال زنانہ رسالہ کا نمونہ کا نمبر ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو گیا۔ جو پچیس نہایت پُرمغز اور مفید و دلآویز مضامین سے پُر ہے۔ جس میں زمانہ بھر کی نسوانی تحریکوں پر نظر ڈالنے کے علاوہ عورت کی زندگی کے مختلف علمی و عملی پہلوؤں پر نامور اہلِ قلم اصحاب نے لطیف روشنی ڈالی ہے۔ ارباب نظر نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس پایہ کا کوئی زنانہ رسالہ زبانِ اُردو میں اس سے پہلے شائع نہیں ہُوا۔ اس کا حجم ۸۸ صفحات ہے۔ آپ ۹ر آنے کے ٹکٹ بھیج کر نمونہ طلب کیجئے۔ یا پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر سال بھر تک اس کا لطف اُٹھائیے۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں رسالہ کا پہلا باقاعدہ نمبر شائع ہو جائیگا۔ جلد اپنی درخواستیں مع زرچندہ بھیجئے اور انعامات کے مقابلہ میں شامل ہو جائیے۔

مینجر نور جہاں امرتسر

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

کف و کھانسی کی دوا

کھانسی ام الامراض ہے۔ یہ مثل بالکل درست ہے۔ کیونکہ کھانسی کی وجہ سے مختلف مرض پیدا ہوتا ہے۔ سردی سے ابتداءً کھانسی ہوتی ہے۔ اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو سانس کی نلیوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ دم کی رُکاوٹ اور پسلیوں میں درد بخار۔ دق۔ سل۔ مراق وغیرہ مختلف امراض میں مریض مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سردی یا کھانسی شروع ہوتے ہی مناسب دوا استعمال کرنا لازم ہے۔ ایسے مہلک مرض کا قلع قمع کرنے کے لئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی ایجاد کردہ کف و کھانسی کی دوا ازحد مفید ہے۔ وقت ضرورت کے لئے ہر گھر میں اس کی ایک شیشی موجود رکھنی چاہئے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۲؍ خورد ۱۰؍ محصولڈاک و پیکنگ ۶؍ و ۸؍

دمہ دم کے ساتھ ہے۔ یہ بات صریح غلط ہے

کیونکہ ڈاکٹر برمن کی ایجاد کردہ "دمہ کی دوا" عرصہ ۴۲ سال سے ہندوستان کے ہر حصہ میں شہرت کے ساتھ مفید ثابت ہوئی۔ اور لاکھوں مریض ہر سال شفا پا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مریض بازاری زیادہ تر نشیلی اجزا دھتورہ۔ بھنگ۔ بلاڈونا۔ پوٹاس وغیرہ مضر اشیاء آمیز دوا استعمال کر کے بجائے فایدہ کے نقصان اٹھا کر مایوس ہو بیٹھتے ہیں۔ اور عمر غیر طبعی میں مارے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی کیمیائی اصول سے بنائی ہوئی دمہ کی دوا" ایک بیش قیمت جوہر ہے۔ اس کی ایک ہی خوراک سے دمہ کا دورہ نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ آزما کر دیکھئے۔ قیمت فی شیشی (۱۲؍) محصولڈاک ۶؍۔

مفصل حال دریافت کرنے کے لئے بڑی فہرست مُفت منگا کر دیکھئے !

نوٹ:۔ ہماری دوائیں ہر جگہ ہر ایک دُکاندار اور ہمارے ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں۔ دوا منگانے سے پہلے آپ اپنے مقام کے دُکانداروں سے دریافت کیجئے۔

ڈاکٹر ایس کے برمن پوسٹ بکس ۵۵۴ نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ مینجر پیسہ اخبار لاہور